

تم سنگ نیناں لاگے



سباس گل



تم سنگ نیناں لاگے

سباس گل

مشہور دانشجو حنا، دوشیزہ، ریشم، شمع سے
سباس گل کے بہترین ناولوں کا انتخاب

عبداللہ اکبر

الکسیم مارکیٹ - اُردو بازار، لاہور (پاکستان)

فون: 0423-7230350 فیکس: 009+42-37241382

موبائل: 0344-4422336 0345-4061241

E-mail: abdullahacademy@gamil.com

ہماری کتابیں معیاری کتابیں
خوبصورت اور کم قیمت کتابیں

ناشر:
سلمان منیر

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	—	تم سنگ نیناں لاگے
مصنفہ	—	سباس گل
پروف ریڈنگ	—	ارسلان احمد
کمپوزنگ	—	گل گرافکس
اشاعت	—	2013ء
ٹائٹل	—	عاطف بٹ
پرینٹرز	—	آر۔ آر پرینٹرز، بندر روڈ لاہور
قیمت	—	250 روپے

ISBN No: 978-969-599-038-5

مشق قبل کلام

ٹاکسٹ

الکیم ماریٹ - اردو بازار، لاہور

کتاب ہذا میں اگر کہیں کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرما کر شکریہ ادا کرنے
کا موقع فراہم کریں تاکہ اگلے ایڈیشن میں درستگی کی جاسکے۔ شکریہ

”مومو! اری دیکھو یہ محسن آیا کہ نہیں انٹرویو دینے گیا تھا اللہ خیر کرے۔“ دادی نے رومال دھوتی مریم عرف مومو کو دیکھتے ہوئے اپنے پوتے محسن رضا کے متعلق متفکر ہو کر پوچھا تو مومو نے رومال نچوڑتے ہوئے جواب دیا۔

”دادی! وہ پوتی تو کب کا آ گیا لگتا ہے۔ انٹرویو اچھا نہیں ہوا جیہی نیچے پیڑ کی چھاؤں میں پڑا سو رہا ہے۔“

”اے لو میں یہاں بیٹھی پریشان ہو رہی ہوں اور صاحبزادے کو نیند کے دورے پڑ رہے ہیں چل جا جا کے اٹھا اسے۔“ دادی نے غصے سے کہا۔

”دادی سونے دیں بے چارے کو ساری رات انٹرویو کی تیاری اور ٹینشن میں وہ سو بھی نہیں سکا تھا“ مومو نے محسن کی حمایت میں کہا۔ تو دادی نے اسے اس انداز سے گھورا کہ وہ چڑھی گئی۔

”ارے یونہی سوتے رہے تا تو نصیب نہیں جا گئے کے تمہارے میری زندگی میں ہی تم دونوں کسی کنارے لگ جاؤ تاکہ میں بھی سکون سے مر سکوں۔“ دادی نے ترکاری کاٹتے ہوئے آزرده لہجے میں کہا۔

”میں بھی سے کیا مراد ہے دادی آپ کی کیا کسی اور کو بھی اپنے ساتھ لے کر مرنے کا ارادہ ہے؟“ مومو نے شرارت سے کہا۔

”اے میں کسے ساتھ لے کر مروں گی اور کیوں؟ سرکا تاج تقدیر نے چھین لیا جوان بہو بیٹا حادثے کی نذر ہو گئے اب تو کسی جدائی کا غم سہنے کی سکت باقی نہیں بچی مجھ بوڑھی دادی میں اب تو تم دونوں کی خوشیاں دیکھنے کے لئے زندہ ہوں تیری شادی اور محسن کی نوکری لگ جائے تو بس سکون ہی سکون ہو جائے میری زندگی میں لے یہ ترکاری دھو کے ہانڈی میں ڈال دے میں نے

مسالا بنا دیا تھا۔“ دادی نے دلگیر لہجے میں کہتے ہوئے سبزی والی چنگیر اسے دے دی۔
 ”اچھا دادی۔“

”اور سن۔“ دادی نے فوراً آواز دی۔

جی دادی مومو نے رک کر ان کا بھریوں سے پرچہ دیکھا دادی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
 ”ترکاری صرف ہانڈی میں ہی نہیں ڈالنی اس کے نیچے چولہا بھی جلانا ہے اس دن کی طرح
 چولہا جلانا مت بھولیو پتہ چلے کہ عین کھانے کے وقت سالن جوں کا توں کچا دھرا ہے چولہے پر“
 ”اچھا دادی ایک دن چولہا جلانا بھول گئی تو اب ساری زندگی آپ مجھے اس کے طعنے دیتی
 رہیں گی۔“ مومو نے منہ بسور کر کہا۔

”طعنے نہیں دے رہی سمجھا رہی ہوں بچی کہ لڑکی ہے تو اپنے اوسان اور دھیان حاضر رکھا کر
 یوں غائب دماغی میں زندگی سٹھری نہیں گزرا کرتی۔“ دادی نے اب کی بار قدرے نرمی و ملائمت
 سے سمجھایا تھا تو وہ بھی سمجھنے والے انداز میں سر ہلا کر سیڑھیاں اترتی نیچے آ گئی پہلے ترکاری دھو کر
 ہانڈی میں ڈالی اور چولہا مناسب آنچ پہ جلا کر اپنا رومال مل کے پانی سے دوبارہ کھنگھالا اور صحن
 میں لگے بوگن ویلیا کے پیڑ کی نیچے تک جھولتی شاخ پر باندھ دیا تاکہ ہوا اور دھوپ لگنے سے سوکھ
 جائے پیڑ کے نیچے پلنگ پر سوئے محسن رضا پر رومال میں سے پانی کے قطرے ٹپک کر گرے تو اس
 نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔

”یہ کیا ہے کون ہے درخت پر؟“ محسن اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اٹھ بیٹھا تو مومو
 نے شرارت سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”لگتا ہے کسی پرندے نے کام دکھا دیا۔“

”پرندے کی یہ مجال کیا سمجھا ہے مجھے؟“

”اب خود ہی سوچو پرندے بھی تمہیں کیا سمجھتے ہیں؟“

”بکومت ہیں یہ تو صاف پانی ہے۔“ محسن کے ہاتھ پر دوبارہ پانی کا قطرہ گرا تو دیکھتے اور

سوگھٹتے ہوئے بولا۔

”ہاں تو اور کیا تم پر تو ابر رحمت برس رہا ہے۔“ مومو ہنس پڑی۔

”یہ تمہارا رومال ہے ناں۔“ محسن نے ذرا سی نگاہ اٹھا کر دیکھا تو گیلے رومال کو پہچانتے

ہوئے پانی کے قطروں کا سبب بھی جان گیا۔

”ہاں میں نے دھو کر یہاں باندھا ہے۔“

”کیوں؟ یہ کسی بزرگ پیر کے مزار کا درخت ہے جو تم نے منت کے لئے یہ رومال باندھا

ہے؟“ وہ اسے گھورتے ہوئے پر مزاح لہجے میں سوال کر رہا تھا۔

”منت کے لئے نہیں سوکھنے کے لئے باندھا ہے اور یہ کسی پیر کا نہیں فقیر کا درخت ہے۔“

مومو نے مسکراتے ہوئے اس کے وجہ بہ چہرے کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“ محسن نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا۔

”کننگے کو فقیر ہی کہیں گے ناں۔“

”ہماری دولت کا تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے لڑکی۔“

”اوہو تم کہاں کے رئیس اور نواب ہو جی؟“ مومو نے ہنستے ہوئے مذاق اڑایا۔

”سلطنت دل کے ریاست فکر و عمل کے اور جاگیر خیال کے۔“ محسن نے اپنے کالر کھڑے

کر کے بڑی ادا سے جواب دیا۔

”ہاں خواب و خیال کی سلطنت و جاگیر کے رئیس اور نواب ہی بن سکتے ہو تم تاج شاہی تو

تمہیں نہیں ملنے والا۔“ مومو نے اس کا تمسخر اڑایا۔

”میں سی ایس ایس کا امتحان پاس کر لوں پھر دیکھنا کیسے افسر شاہی کا تاج میرے سر پر بٹتا

ہے۔“ محسن نے خوشگوار اور روشن مستقبل کا خواب دیکھتے ہوئے کہا۔

”شیخ چلی۔“ مومو اسے تنگ کرنے کی غرض سے ہنستے ہوئے بولی۔

”مومو کبھی تو میری ہاں میں ہاں ملا دیا کرو۔“ وہ افسردگی سے بولا۔

”نہ جی ناں۔“ وہ اگٹوٹھا دکھاتی دروازے کی طرف لپکی۔

”تم کہاں جا رہی ہو؟“ محسن نے فوراً پوچھا۔

”میں ذرا سامنے فلیٹ والوں کی خیر خبر لے لوں۔“

”تمہارا کھانا ہضم نہیں ہوتا وہاں جائے بغیر۔“ محسن نے جرح کی۔

”تمہیں کیا تکلیف ہے؟“ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر لڑنے والے انداز میں بولی۔

”مجھے تمہارا وہاں روز روزیوں جانا پسند نہیں ہے۔“

”مجھے تو پسند ہے۔“

”کیوں تم کیا سی این این کی رپورٹر ہو جو وہاں کی خبریں لینے ہر روز چلی جاتی ہو وہ لوگ بھی تم سے مرو تا ہی اخلاق برتتے ہوں گے ورنہ دل میں تو کوستے ہوں گے کہ آگئی بی جہا تو تلی ادھر کی خبریں ادھر پہچانے والی بی بی سی۔“ محسن نے اسے سنجیدگی سے سمجھایا۔

”میری خبروں کی وجہ سے آج تک کسی فلیٹ میں لڑائی نہیں ہوئی۔ سب کے بھید جانتی ہوں مگر کسی پر آشکار نہیں کرتی۔ خبردار جو آئندہ مجھے بی جہا لو یا تلی کہا۔ میں ایسی ہوتی تو کسی کا پردہ نہ رکھتی۔“ مومو نے غصے سے کہا۔

”جانتا ہوں مانتا ہوں کہ تم ایسی ویسی لڑکی نہیں ہو مگر اس طرح تمہاری بے پردگی ہوتی ہے جو مجھے گوارہ نہیں ہے۔“ وہ نرمی سے بولا۔

”کیسی بے پردگی؟“ مومو نے نا سمجھی کے عالم میں پوچھا۔

”اتنی تو نا سمجھ ہو تم اس لئے میں ڈرتا ہوں تم..... بس تم پردہ کیا کرو۔“ وہ اسے سمجھاتے ہوئے عجیب الجھن کا شکار ہو رہا تھا دو ٹوک لہجے میں بولا۔

”ٹھیک کہہ رہا ہے محسن بیس برس کی ہو رہی ہے اور تجھے اپنے آپ کا کوئی ہوش ہی نہیں ہے یہ فلیٹوں میں آنا جانا کم کردے اور گھر سے باہر چادر یا برقع اوڑھ کر دھایا کر۔“

دادی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے ان دونوں کی باتیں سن چکی تھیں محسن کی بات پر تائیدی انداز میں بولیں۔

”برقع۔“ مومو کی چیخ ہی تو نکل گئی برقعے کے نام پر اور محسن کی ہنسی۔ جو اس نے بمشکل ضبط کی تھی۔

”چینتی کا ہے کوہے چل چادر منگوادوں گی چہرہ ڈھانپ کے باہر نکلا کر ناب۔“ دادی نے اسے کڑے تیوروں سے گھور کر کہا۔

”میں آج ہی چادر لے آؤں گا۔“

”ٹھیک ہے جب چادر لے آؤ گے تب میں پردہ بھی کر لوں گی ابھی تو میں جارہی ہوں دادی سالن دیکھ لیجئے گا۔“

”اماں باوا کے اسکول سے آنے سے پہلے گھر نہ پہنچی تو میں تجھے چٹیا سے پکڑ کر لاؤں گی ان

فلیٹ والوں کے سامنے سنا تو نے۔“ دادی نے اسے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔
 ”سن لیا دادی، ویسے دادی کس کی چٹیا سے پکڑ کر لائیں گی کیونکہ میری تو چٹیا ہے ہی نہیں۔“ وہ شرارت سے اپنے کھلے پشت پر بکھرے سیاہ سلکی بالوں کو دیکھتے ہوئے بولی اور دادی کا ہاتھ پاؤں کی جوتی تک بڑھتا دیکھ کر فوراً دروازے کی طرف بھاگی اور باہر نکل گئی۔

”کتنا کہتی ہوں اس سے کہ بال باندھ کے رکھا کر مگر سنتی ہی نہیں ہے ماشا اللہ اتنے گھنے سیاہ لمبے بال ہیں مومو کے ساری فلیٹوں والیاں جلتی ہیں اس کے بالوں سے یہ مومو ضرور کسی کی نظر لگوائے گی مجال ہے جو میری کسی بات پہ کان دھرتی ہو، اللہ نے رنگ روپ سے نوازا ہے تو انسان اس کی حفاظت کرے اسے سب سے چھپا کر رکھے پر نہ جی نہ انہیں اپنی ہوش ہے نہ اپنے حسن کی جو بجانے کس کس کی نظروں میں کھٹکتا ہوگا، اماں باوا ہیں انہیں کوئی فکر ہی نہیں ہے کہ بچی بڑی ہو رہی ہے اسے بھی کچھ وقت دیں دنیا میں جینے کے ڈھنگ سکھائیں، زمانے کی اونچ نیچ سمجھائیں، وہ بھی اسکول سے آ کر ذرا سناستائے اور پھر ٹیوشن پڑھانے میں لگ جاتے ہیں، مومو بے چاری بھی کیا کرے اکیلے پن سے گھبرا کے دل بہلانے کو ادھر ادھر گھومتی پھرتی ہے سکھویں سہیلیوں سے ہنس بول لیتی ہے تو خوش ہو جاتی ہے یہ تو کن سوچوں میں گم کھڑا ہے“ دادی نان اسٹاپ بولے جارہی تھیں اچانک محسن کے پرسوج اور فکر میں گم وجود کو دیکھا تو چونک کر پوچھنے لگیں۔

”سوچ رہا تھا کہ میرے ہوتے ہوئے مومو کو کسی اور دوست کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے وہ مجھ سے بھی تو اپنی ساری باتیں شیئر کرتی ہے پھر۔“ محسن نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔
 ”تو نہیں سمجھے گا اس عمر کی لڑکیوں کے سارے سپنے صرف مرد ذات سے نہیں جڑے ہوتے وہ اپنی ہم عمر، ہم جولیوں کے ساتھ اپنی دس باتیں، خواب اور مشغلے بتاتی ہیں اور تو کیوں فکر کرتا ہے وہ یہیں رہے گی اسی گھر میں، یہ بتا انٹرویو کیسا ہوا؟“

”انٹرویو تو اچھا ہوا ہے دادی لیکن، ہوگا نتیجہ وہی جو ان افسران بالا نے پہلے سے طے کر رکھا ہے خانہ پری اور کاغذی کارروائی دکھانے کا انٹرویو کا ڈھونگ رچایا تھا بس۔“ محسن نے گھڑے سے پانی گلاس میں اٹھیل کر آہستہ آہستہ پیتے ہوئے مایوس لہجے میں بتایا۔

”تو دل میلانہ کر اللہ نے چاہا تو تجھے افسری ملے گی میرا دل کہتا ہے بس تو دل لگا کے اپنے

مقابلے کے امتحان کی تیاری کر چھوڑ ان نوکریوں کے چکر میں جو ٹیوشن تو پڑھا رہا ہے بہت ہے تیرے خرچے کے لئے انشاء اللہ پورے خاندان کا نام روشن کرے گا تو مجھے یقین ہے۔“ دادی نے اسے دیکھتے ہوئے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر پر یقین اور حوصلہ افزاء لہجے میں کہا۔

اللہ آپ کی زبان مبارک کرے دادی۔ محسن نے خوش ہو کر کہا اور ان کے ہاتھ چوم لئے۔

☆☆☆

”احمد جمیل اور رقیہ بانو (دادی) کے دو بیٹے تھے، رضا احمد اور عطا احمد، دونوں کی شادیاں خاندان میں تیا ز ادا اور خالہ زاد سے ہوئی تھیں رضا احمد اور سلمیٰ بیگم کو اللہ نے ایک بیٹے سے نوازا تھا جس کا نام انہوں نے محسن رضا رکھا تھا عطا احمد اور انجم آراء کو اللہ نے مریم کی شکل میں بیٹی عطا کی تھی جسے سب پیار سے مومو کہنے لگے تھے کیونکہ وہ موم کی گڑیا کی مانند سرخ نرم و نازک سی گول مٹول سی پیاری سی تھی رضا احمد کی کریانے کی دکان تھی اور عطا احمد ایک سرکاری اسکول میں ٹیچر تھے احمد جمیل ڈاک خانے میں سینئر پوسٹ ماسٹر تھے رقیہ بانو بڑے سلیقے سے ان کی تنخواہ میں گھر چلاتی تھیں رضا احمد اور ان کی بیوی سلمیٰ بیگم کسی عزیز کی عیادت کر کے گھر لوٹ رہے تھے جس رکشے میں وہ سوار تھے۔ اسے ایک تیز رفتار وین نے ٹکڑے ماری اور رکشہ قلابا زیاں کھاتا دور جاگرا، رکشہ ڈرائیور سمیت وہ دونوں میاں بیوی بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، جائے حادثہ پر ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا وہیں احمد جمیل صاحب کے محلے کے ایک شخص کا بھی گزر ہوا تو وہ سلمیٰ بیگم اور رضا احمد کو پہچان گیا اور قریبی پی سی او سے احمد جمیل صاحب کو ڈاک خانے فون کر کے اس سنگین اور جان لیوا صورتحال سے آگاہ کر دیا، احمد جمیل یہ خبر سن کر سکتے میں آ گئے ان کے اسٹاف نے ان کی یہ حالت دیکھی تو فوراً ان کے پاس چلے آئے وجہ دریافت کی تو احمد جمیل صاحب نے مرے مرے لہجے میں ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اپنے جوان بہو بیٹے کی ایکسیڈنٹ میں ہلاکت کی خبر سنادی، سبھی نے ان سے بہت دکھ اور افسوس کا اظہار کیا اور انہیں جائے حادثہ پر پہنچانے کے لئے خود بھی ایک دو اہلکار تیار ہو گئے مگر احمد جمیل صاحب کا دل مزید چلنے سے دھڑکنے سے انکاری ہو گیا وہ دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے ڈاک خانے کے اندر ہی ڈھکے سارا عملہ انہیں سنبھالنے اور ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا انہیں فوری طور پر ہسپتال لے جایا گیا مگر وہ جانبر نہ ہو سکے ڈاکٹر کے مطابق احمد جمیل کو دل کا شدید دورہ پڑا تھا جو جان لیوا ثابت ہو پانچ مرلے کے ”گلشن احمد“ میں جب احمد

جمیل اور ان کے بہو بیٹے کی میتیں پہنچیں تو گھر میں اک کھرام مچ گیا احمد جمیل اور رقیہ بانو کا گلشن اجڑ گیا تھا۔

محلے دار اس گھرانے کی شرافت اور ایمانداری کے معترف تھے ان کے اخلاق کے گرویدہ تھے وہ سب بھی اس سانحے میں رقیہ بانو عطا احمد انجم آراء رضا احمد اور مریم کے ساتھ تھے ہر آنکھ اشکبار اور ہر دل فگار تھا مریم کی عمر اس وقت چار سال تھی وہ حیران حیران آنکھوں سے گھر میں اس ہجوم اور گریہ زاری کا منظر دیکھ رہی تھی اپنے پیارے دادا اور تایا ابوتائی امی کی کفن میں لپٹی صورتوں کو ساکت نظروں سے دیکھ رہی تھی اس کے ننھے سے ذہن کو اس ساری صورتحال کا کچھ ادراک نہیں تھا کہ وہ اپنے کتنے پیارے رشتے کھوپچی ہے رقیہ بانو (دادی) اسے اور محسن کو اپنے سینے میں چھپائے رونے لگیں تو مریم بھی رونے لگتی محسن کی عمر نو سال تھی وہ اس سانحے کے دکھ کو بہت حد تک سمجھ رہا تھا اور محسوس بھی کر رہا تھا اور بلک بلک کر رو رہا تھا عطا احمد نے اسے اپنے ساتھ لپٹا کر روتے ہوئے کہا۔

”مت رومیرے لعل میں ہوں ناں تیرا ابوبس آج سے تو مجھے ابو کہے گا۔“ اور محسن روتے ہوئے ابو ابوبکار نے لگا۔

مرنے والے منوں مٹی تلے دفنائے جا چکے تھے رونے والوں نے بہت آنسو بہائے تھے لیکن مرنے والے کسی کے آنسو دیکھ کر کبھی پھر سے نہیں جی اٹھتے موت ایسی ہی تلخ اور سنگین حقیقت ہے جسے رفتہ رفتہ انسان کو قبول کرنا ہی پڑتا ہے رقیہ بانو کو بیوگی کا دکھ مارے ڈالتا تو کبھی یتیم پوتے کو دیکھ کر بہو بیٹے کی جوان موت کا صدمہ دل چیرنے لگتا عطا احمد اور انجم آراء نے انہیں اور محسن کو بہت توجہ اور محبت سے اس غم کے حصار سے باہر نکالا تھا محلے والوں نے انکی دلجوئی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی بالا خرا نہیں صبر آ ہی گیا تھا۔ اب تو وہ اپنے شوہر اور بہو بیٹے کی روحوں کو قرآن پاک پڑھ کر بخشے میں ہی سکون محسوس کرتی تھیں۔

وقت گزرتا گیا رضا احمد کی کریانے کی دکان عطا احمد نے بیچ کر اس کی رقم محسن کے نام بینک میں جمع کروادی تھی گھر کے اخراجات بچوں کے تعلیمی اخراجات اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کے پیش نظر انجم آراء نے بھی گورنمنٹ سکول میں ملازمت کر لی اور ساتھ ہی مریم کو بھی اسی اسکول میں داخل کرادیا۔

دھیرے دھیرے وقت کا پہیہ گھومتا رہا مریم اور محسن رضا ایک ساتھ ہنستے کھیلتے پڑھتے لکھتے شباب کی دہلیز تک آ پہنچے دونوں میں خاصی بے تکلفی اور دوستی تھی رقیہ بانو کو یہ اطمینان تھا کہ مریم عرف مومو کے لئے باہر رشتہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی جیسے محسن کی تعلیم مکمل ہوئی اور ملازمت لگی وہ مومو اور محسن کی شادی کرادیں گی محسن ان کے اس خیال سے آگاہ تھا اور اس کی دلی خواہش بھی یہی تھی کہ یہ سرخ و سفید گڑیا سی لڑکی اس کی شریک زندگی بن جائے وہ ہمیشہ اس کا خیال رکھتا تھا اور اس کی غلطیوں اور نادانیوں پر اسے سمجھاتا بھی تھا بچپن کے ساتھ نے کب محبت کا روپ بدلاتھا یہ تو خود محسن کو بھی معلوم نہیں تھا لیکن وہ اتنا جانتا تھا کہ اس کے جیون کی ساری مسرتیں اور راحتیں مومو کے دم سے ہیں اور مومو وہ اس کے جذیوں سے بے خبر ہی تو تھی اس نے بی اے کا امتحان دیا تھا اور محسن نے اپنے انجینئرنگ کے شوق کو دسائل نہ ہونے کے سبب دل پہ پتھر رکھ کے بھلایا اور ایف ایس سی میں ٹاپ کرنے کے بعد اکنامکس اور سیاسیات کے مضامین کے ساتھ بی اے میں داخلہ لیا تھا بی اے امتیازی نمبروں سے پاس کرنے پر بھی اسے وظیفہ ملا تھا ایف ایس سی کا گولڈ میڈل اور بی اے کا وظیفہ اسے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے روشناس کرانے کو کافی تھا اس نے مقابلے کے امتحان کا ارادہ باندھ لیا پہلے اکنامکس اور سیاسیات میں ماسٹر کیا اس کے بعد مقابلے کے امتحان کی تیاری شروع کر دی تھی اور آج کل وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے ٹیوشن بھی پڑھا رہا تھا عطا احمد اسے جیب خرچ ہر مہینے دیتے تھے انجم آراء بھی مومو کی طرح اس کی تمام ضروریات کا خیال رکھتی تھی مگر اسے اپنا آپ ان پر بوجھ محسوس ہوتا تھا جس طرح وہ انجم آراء اور عطا احمد کو امی ابو کہتا تھا اس طرح وہ بھی اسے اپنا بیٹا سمجھتے تھے اور اکثر قریبی محلے دار اور رشتے داروں کے علاوہ باہر کے لوگ مریم اور محسن کو گئے بہن بھائی ہی سمجھتے تھے۔

☆☆☆

مومو اپنی دوست بینش سے مل کر بھاگتی دوڑتی زینے کی طرف جا رہی تھی کہ اچانک کسی مضبوط وجود سے ٹکرائی۔

”اُف! کیا مصیبت ہے؟“ مومو کو تو دن میں تارے نظر آ گئے تھے اپنا ماما تھا سہلاتے ہوئے بے ساختہ بولی۔

”مصیبت نہیں یہ تو چاند سی صورت ہے۔“ مردانہ آواز میں جواب آیا تو اس نے جھٹکے سے

سراٹھا کر دیکھا سامنے ایک خوبصورت شخص ہونٹوں پر مسکان سجائے کھڑا تھا مومو پل بھر کو گھبرائی پھر فوراً ہی سنبھل کر بولی۔

”تم نکھیں کھول کر چلا کریں مسٹر نے علاقے میں دھڑلے سے منہ اٹھائے چلے آ رہے ہیں“
 ”کون ہو تم؟“ وہ اس کے سادہ سے دلنشین روپ کو آنکھوں میں جذب کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”تم۔“ مومو اس کی اس درجہ بے تکلفی پر تپ کر بولی۔
 ”ہاں تم اتنی بے تکلفی سے ٹکرائی ہو کہ سارے تکلفات خود بخود دمٹ گئے ہیں فاصلے پل بھر میں مٹ گئے ہیں فاصلے ہی کیا ہم بھی تم پر مر مٹ گئے ہیں۔“ وہ بہت غور سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”تو کیا خیال ہے تمہارے کفن و دفن کا بندوبست کروں؟“
 ”ہاں اگر تم اپنے سرخ آنچل میں مجھے چھپا کر اپنی محبت کی زمین میں دفن کرو تو میں تیار ہوں۔“ وہ عامیانہ لہجے میں بولا۔

”پرے مرو۔“ مومو نے غصے اور حیا سے سرخ ہوتے ہوئے اسے پیچھے دھکا دیا۔
 ”انسان ایک ہی بار مرتا ہے۔“ اس شخص نے فوراً اس کے سامنے آ کر پھر سے اس کا راستہ روک لیا۔

”انسان مرتا ہے نا میں تو تمہاری بات کر رہی ہوں۔“ مومو نے اپنا غصہ کرتے ہوئے تیز لہجے میں جواب دیا تو وہ ہنس پڑا اور پھر ذرا سا جھک کر اس کی صورت زبیا کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”بہت تیز چیز ہو تم ویسے مجھے اکبر کہتے ہیں بہت بڑا بزنس ہے میرا۔“
 ”تو اکبر بادشاہ تو تم پھر بھی نہیں بن سکے جو میں تمہارے سامنے کورنش بجالاؤں۔“ وہ اسی پر اعتماد اور طنزیہ لہجے میں بولتی اس کے اندر ہلچل مچا رہی تھی۔

رہتی کہاں ہو؟ اکبر نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا تو بڑا سیدھا جواب آیا۔
 ”گھر میں۔“

”اور گھر کہاں ہے؟“

”تمہیں اس سے مطلب۔“ مومو نے اسے گھورا۔

”مطلب ہے تو پوچھ رہا ہوں۔“

”میں مطلبی لوگوں کے منہ لگنا پسند نہیں کرتی راستہ چھوڑ دوں۔“

”تم نے میرے لئے کوئی راستہ چھوڑا ہے جو میں تمہارا راستہ چھوڑ دوں۔“ اکبر نے معنی خیز جملہ بولا تو مومو کے اندر دھماکے ہونے لگے اس نے بمشکل خود کو کمزور اور کنفیوژڈ ظاہر ہونے سے بچایا اور یونہی اکبر کے پیچھے دیکھ کر جھوٹ موٹ بولی۔

”ارے رحمانی انکل شکر ہے آپ آگئے“ مومو کے اس جملے پر اکبر نے گھبرا کر اس کا راستہ چھوڑا تھا اور وہ تیزی سے آگے نکل گئی تھی، اکبر نے جب زینے کی جانب کسی انکل نما وجود کو نہ پایا تو فوراً ہی اس کی چالاکی سمجھ گیا اور پھر ہنس پڑا۔

”کیا ہوا تمہارا سانس کیوں پھولا ہوا ہے کوئی کتا پیچھے پڑ گیا تھا؟“ محسن نے اسے گھر پھولتی سانسوں کے ساتھ داخل ہوتے دیکھ کر پلنگ کی پانکتی کتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے فوراً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا اور گھروچی پر رکھے گھڑے کو الٹا کر ہاتھ کی اوک میں پانی انڈیل کر پینے لگی محسن بڑے غور سے اس کی حرکات کا جائزہ لے رہا تھا وہ کتنی ہی پیاسی کیوں نہ ہوتی پانی ایسے تو کبھی نہیں پیا تھا اس نے جب وہ پانی پی چکی تو اپنے دوپٹے سے اپنا پسینے سے ترچہ صاف کرنے لگی۔

”اسی لئے سمجھاتا ہوں کہ باہر اس طرح بے پردہ مت نکلا کرو یہاں آوارہ اور بھوکے کتے بوسو گتھے پھرتے ہیں۔“ محسن نے اس کے سامنے آ کر اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے معنی خیز اور گہرا جملہ ادا کیا۔

”ڈراؤ تو مت۔“ وہ دل تھام کر زینے کی سیڑھیوں کے بیچ بیٹھ گئی محسن بھی اس کے برابر آ بیٹھا اور نرمی سے گویا ہوا۔

”میں تمہیں ڈرانا یا خوفزدہ کرنا نہیں چاہتا سمجھانا چاہتا ہوں تمہیں کہ تم بہت قیمتی اور انمول ہو ہمارے لئے اور قیمتی چیزیں تو سب سے چھپا کر رکھنی چاہئیں ناں۔“

”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو اب میں باہر نہیں نکلوں گی تم مجھے حجاب لا دو گے نا تو پھر میں تمہارے ساتھ باہر جایا کروں گی۔“ مومو نے سنجیدگی سے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے خوشی سے بولا۔

”یہی تو میں چاہتا ہوں مومو بلکہ نادان مومو تم بڑے دانا ہو۔“ وہ چڑ کر بولی تو وہ ہنسنے لگا اور مومو ہمیشہ کی طرح اس کی خوبصورت ہنسی میں کھوئی گئی تھی۔

محسن رضا چھنٹ قد کا مالک تھارنگت تازہ گندم کے نرم نوخیز خوشوں کی طرح کھلی کھلی سنہری تھی ڈارک براؤن آنکھیں ذہانت کی چمک سے بھری رہتی تھیں عنابی ہونٹ جب ہنسنے مسکراتے تو مقابل کا دل موہ لیتے تھے اس کی کھڑی ناک کلین شیو چہرہ ڈارک براؤن بال اور بھرا بھرا متناسب جسم اس کی مردانہ وجاہت کا مکمل عکس تھا اس کے پاس روپے پیسے کی دولت نہیں تھی لیکن حسن و سیرت اور ذہانت کی دولت سے وہ مالا مال تھا اور اس پر اس نے کبھی غرور بھی نہیں کیا تھا محلے دار خاندان کی کئی لڑکیاں دل ہی دل میں اس کی وجہ شخصیت اور بے نیاز ذہانت پر مرتی تھیں مگر اظہار کی جرأت آج تک کسی کو نہ ہو سکی تھی کیونکہ محسن بہت ریزرور ہوتا تھا ان کے سامنے اور سب سے بڑھ کر یقین تھا۔ کہ محسن کی شادی مومو سے ہی ہوگی۔ لہذا ان کی دال نہیں گلنے والی مومو بھی مناسب قد کاٹھ کے ساتھ دلکش نین نقش کی مالک تھی۔ نکھری نکھری کشادہ پیشانی، بڑی بڑی سیاہ روشن آنکھیں دودھ کی سی رنگت میں گندھا نرم ملائم بدن، ہنستی مسکراتی توبل و رخسار میں سرخی سی لہرانے لگتی، شکر نئی ہونٹوں کے پیچھے، سفید موتیوں کی طرح چمکتے دانت، صحت مند وجود پر زلفوں کی آبشار جو اس کے معصوم حسن میں مزید اضافہ کرتی تھی وہ ذہین تھی مگر محسن جتنی نہیں محسن اور مومو کی جوڑی چاند سورج کی جوڑی لگتی تھی دادی تو دل سے ان کے ابدی ساتھ اور خوشیوں کی دعائیں مانگا کرتی تھیں۔

☆☆☆

آج چھٹی کا دن تھا سبھی گھر میں موجود تھے محسن رات دیر تک پڑھتا رہا تھا اور فجر کی نماز پڑھ کر سویا تھا۔ تو دن کے گیارہ بجے بھی اس کے جاگنے کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ مومو نہانے کے بعد اپنی پسند کے سبز رنگ کے لباس میں ملبوس دادی کے پاس تخت پر آ بیٹھی اور اپنے بال سنوارنے لگی عطا احمد اخبار لیے پیڑ کے نیچے کرسی پر بیٹھے اس کا مطالعہ کر رہے تھے انجم آراء باروچی خانے میں دوپہر کے کھانے کے لئے سب کی فرمائش پر سندھی بریانی پکا رہی تھیں اس وقت دروازے پر دستک ہوتی تو سبھی چونک گئے کیونکہ دستک بڑی انجان سی تھی۔

”اس وقت کون آ گیا۔“ دادی نے ٹھوڑی پکڑ کر پرسوج انداز میں پوچھا نظریں دروازے

پر جم گئیں تھیں۔

”میں دیکھتا ہوں۔“ عطا احمد اخبار پلنگ پر رکھتے ہوئے بولے اور اٹھ کر گئے دروازہ کھولا تو سامنے ایک گر لیس فل سی خاتون سیاہ اور گلابی رنگ کی ساڑھی پہنے قیمتی زیورات سے مزین ان کے لئے حیرت کا سامان بنی کھڑی تھی ساتھ ہی ایک ہینڈ سم سا شخص بھی تھا جو اس عورت کا بیٹا دکھائی دے رہا تھا۔

”السلام وعلیکم!“ مرد نے ان کی حیرت توڑتے ہوئے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام جی فرمائیے۔“ عطا احمد نے اتنے قیمتی لباس سے ان کی حیثیت کا اندازہ لگاتے ہوئے حیرانگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ عطا احمد صاحب ہیں ناں۔“ خاتون نے تصدیق چاہی۔

”جی ہاں۔“

”ہمیں آپ سے اور آپ کی بیگم سے ملنا ہے یہ میرا بیٹا ہے اکبر بزنس کرتا ہے۔“ خاتون نے وہیں کھڑے کھڑے اپنا اور اپنے بیٹے کا تعارف کروایا تو مومو کے کانوں تک ان کی آواز پہنچ رہی تھی وہ اکبر کا نام سن کر شپٹا گئی۔

”یہ اکبر اعظم یہاں کیوں آیا ہے؟“ وہ دل میں سوچ رہی تھی اتنے میں عطا احمد انہیں اندر لے آئے مومو نے دیکھا تو اسے پہچان لیا کہ یہ تو وہی اکبر ہے جو اس دن فلیٹ کی سیڑھیوں پہ ٹکرایا تھا اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا کہ کہیں وہ اس کی شکایت لگانے تو نہیں آیا۔

”مگر میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا تھا اسے جو یہ شکایت لگانے آتا اور وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ کہیں۔“ وہ اس سے آگے سوچ نہ سکی۔

”انجم! ارے بیگم باہر آؤ ابھی مہمان آئے ہیں۔“

عطا احمد نے صحن میں سے ہی انجم آراء کو آواز دی وہ فوراً ہاتھ دوپٹے سے پونچھتی ہوئی باہر نکلیں تو اجنبی چہرے اور ان کی ظاہری شان و شوکت دیکھ کر بوکھلا گئیں۔

”السلام وعلیکم!“ انجم آراء نے خاتون کو دیکھتے ہوئے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام کیسی ہیں آپ؟“ خاتون نے بڑے مہذب انداز میں مسکراتے ہوئے خیریت دریافت کی تو وہ مزید حواس باختہ ہو گئیں۔

”مم..... میں ٹھیک ہوں آپ تشریف رکھیے نا۔“

”بیٹا آپ اس پر بیٹھ جائیں ہمارے گھر میں آپ لوگوں کے شایان شان کوئی جگہ نہیں ہے جہاں ہم آپ کو بٹھاسکیں۔“

عطا احمد نے اکبر کو کرسی پیش کرتے ہوئے قدرے خجالت سے کہا انجم آراء الگ بوکھلائی ہوئی تھیں کہ انہیں کہاں بیٹھائیں۔

”باؤلا ہو گیا ہے عطا احمد تو غیر مرد کو گھر میں گھسایا ہے جو ان بچی گھر میں ہے کوئی احساس ہی نہیں ہے“ دادی بڑبڑا رہی تھیں۔

”میں اوپر جا رہی ہوں دادی۔“ مومو نے اکبر کی نظروں سے گھبرا کر کہا۔

”ہاں جا اور اس نیستی مارے کو بھی جگا دو پہر ہو گئی اب تک پڑا سو رہا ہے۔“ دادی کا اشارہ محسن کی طرف تھا وہ سمجھ گئی تھی جانے لگی تو مسز انور نے اسے روک لیا جو اپنا تعارف کروا چکی تھی۔

”ادھر آؤ بیٹی کیا نام ہے تمہارا مومو۔“ مومو نے انہیں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”مریم نام ہے اس کا پیار سے ہم اسے ”مومو“ کہتے ہیں۔“ انجم آراء نے مسکراتے ہوئے

بتایا۔

”بس پھر ہم بھی اسے ”مومو“ ہی کہیں گے اکبر بیٹا ڈرائیور سے کہو کہ سامان لے آئے ہم رسم کر کے ہی جائیں گے۔“ مسز انور نے مومو کے چہرے کو نرمی سے چھوتے ہوئے کہا تو سب حیران حیران نظروں سے دیکھنے لگے۔

”بیٹی یہاں بیٹھو میرے پاس۔“ مسز انور نے اسے پکڑ کر تخت پر بٹھالیا اور خود بھی دادی کے برابر بیٹھ گئیں اور ان کا حال احوال پوچھنے لگیں۔

”یہ سب کیا ہے بہن جی؟“ مسز انور کا ڈرائیور اور ملازم مٹھائی کے ٹوکے لے کر آیا تو عطا احمد نے حیران نظروں سے مسز انور کو دیکھتے ہوئے پوچھا جبکہ وہ تینوں مٹھائی کے ان ٹوکروں کا مطلب سمجھ گئی تھیں۔

”ہم آپ کی بیٹی مومو کو اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں اس کی کہیں بات تو طے نہیں ہوئی نا۔“ مسز انور نے مومو کا ہاتھ تھام کر اسے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ مومو کے چہرے پر حیا کی سرخی نمودار ہو گئی۔

”مریم کا رشتہ تو۔“

”جی نہیں مومو کا رشتہ کہیں طے نہیں ہوا اس کے دو تین رشتے آئے ہوئے ہیں لیکن ہم نے

کسی کو ہاں نہیں کی۔“

عطا احمد نے فوراً دادی کی بات کاٹ کر تیزی سے جواب دیا کہ دادی ہکا بکارہ گئیں وہ دیکھ رہی تھیں کہ ان کے بہو بیٹے کی نیت فوراً بدل گئی تھی امیر گھر کا رشتہ پا کر اور وہ یتیم بھتیجے کو بھول گئے تھے جس سے بچپن سے ہی مومو کی نسبت طے ہو چکی تھی اور اب وہ یہ حقیقت جھٹلائے ایک غیر خاندان کو اپنی بیٹی دینے کے لئے آمادہ نظر آ رہے تھے اور انہیں حقیقت بتانے سے روک دیا تھا۔

”یہ تو بہت اچھا ہوا کہ آپ نے کسی کو ہاں نہیں کی اب آپ ہمیں ہاں کر دیں یہ اکبر ہے میرا اکلوتا بیٹا آپ کی مومو کو اس نے فلیٹوں میں آتے جاتے دیکھا تھا ایک بار بس تب سے مجھے یہاں رشتہ لے کر آنے کے لئے کہہ رہا تھا سو آج میں اپنے بیٹے کی پسند کو آپ سے مانگنے آئی ہوں۔ بس آپ ہاں کر دیں۔ تاکہ میں اپنی ہونے والی بہو کو انگوٹھی پہنا دوں۔“ مسز انور نے ساری بات تفصیل سے بتاتے ہوئے۔ اپنی مرضی کا جواب چاہا انجم آراء اور عطا احمد تو اتنے دولت مند داماد کے تصور سے ہی نہال ہوئے جارہے تھے۔ اور مومو ہاں بیٹھنے پر مجبور تھی کہ مسز انور نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

”بہن جی ہم اتنی جلدی اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں؟ ہم تو آپ کو جانتے تک نہیں ہیں اور نہ ہی آپ کے شایان شان جہیز دے کر بیٹی کو رخصت کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔“ عطا احمد نے دل میں رضامندی دینے کے باوجود حقائق پر نظر رکھتے ہوئے کہا تو دادی کو بھی کچھ حوصلہ ہوا اور وہ فوراً بولیں۔

”بھئی ہمیں نہیں کرنا یہ رشتہ تم اپنے برابر کے لوگوں میں رشتہ کیوں نہیں کرتیں؟“

”اماں جی! مومو میرے بیٹے کی پسند ہے اور مجھے بھی پسند ہے اور ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمیں سوائے مومو کے کچھ نہیں چاہیے کیوں اکبر؟“ مسز انور نے یہ کہتے ہوئے اکبر سے تائید چاہی۔

”جی ممی! آپ درست فرما رہی ہیں ہمارے پاس سب کچھ تو ہے۔“ اکبر نے سعادت مند

بیٹے کی طرح ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”اور جان پہچان تو اب ہو ہی جائے گی آپ یہ کارڈ رکھ لیں“ مسز انور نے اپنے پرس میں سے اپنا وزٹنگ کارڈ نکال کر عطا احمد کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تو مومنوا ٹھہ کر کچن میں چلی گئی۔

”اپنی ہر طرح سے تسلی کر لیں اکبر اور انور کے متعلق ہمارے خاندان کے متعلق جس سے چاہیں معلوم کر والیں انشا اللہ اچھی ہی رپورٹ ملے گی آپ کو۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن ہم اتنی جلدی ہاں نہیں کر سکتے کچھ سوچ سمجھ کر مٹھورے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں آخر بیٹی کا معاملہ ہے“ انجم آراء نے پہلی بار ان کی گفتگو میں حصہ لیا۔

”آپ فکر نہ کریں میں آپ کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنا کر رکھوں گی بس آپ جلدی سے ہاں کر دیں اور منہ میٹھا کروائیں ہم تو ساری تیاری کر کے آئے ہیں معلومات کراتے رہیے گا دیکھیں آپ کی بیٹی راج کرے گی ہمارے گھر پہ اور شادی کے تمام اخراجات ہم خود کریں گے شادی ہال کی بنگ اور فیس ہم دیں گے۔“

”تم کیوں دو گی بی بی؟“ دادی نے چپتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

”اور ہوٹل میں شادی اس لئے کراؤ گی تاکہ تمہارے رشتے داروں کو یہ نہ پتا چل سکے کہ تم ایک غریب گھر کی لڑکی کو اپنی بہو بنا کر لائی ہو کیا بتاؤ گی اپنے رشتے داروں اور ملنے والوں کو کہ کس خاندان سے تعلق ہے مومنوا اور اس کا باپ کیا بزنس کرتا ہے؟“

”اماں! آپ بھی کیا باتیں لے بیٹھیں آج کل امیر غریب سب ہوٹل میں ہی شادیاں کرتے ہیں۔“ انجم آراء نے تیزی سے کہا انہیں ڈرتھا کہ کہیں ان کی باتوں کی وجہ سے اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے نہ نکل جائے۔

”اور اماں جی! بارات یہاں پیدل ہی آ سکتی ہے اب دیکھیں ناں گلی میں گاڑی تو نہیں آ سکتی۔“ اکبر نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

”گدھا تو آ سکتا ہے نا۔“ دادی نے چڑ کر کہا نظریں اکبر پر جمی تھیں اسے لگا کہ انہوں نے اسے گدھا کہا ہے۔

”اماں! کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ یہ مہمان ہیں ہمارے۔“ انجم آراء نے انہیں تنبیہی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اے تو میں نے ایسا کیا کہہ دیا تمہارے جوجی میں آئے کرو نہ تمہیں کسی یتیم کا خیال ہے

نہ سگی بیٹی کا اتنا بڑا فیصلہ بل بھر میں کرنے چلے ہیں ہتھیلی پہ سرسوں جمار ہے ہو کوشش کر دیکھو نہیں جمنے کی۔“ دادی نے غصے سے بہو بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

مومو کچن میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی اور وہ ماں بیٹا الجھن آمیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

”اماں! آپ بدشگونی کی باتیں تو مت کریں بہن جی ہمیں آپ کے بیٹے کا رشتہ منظور ہے آپ مومو کو انگوٹھی پہنا سکتی ہیں۔“ عطا احمد نے لمحے بھر میں فیصلہ کرتے ہوئے کہا تو دادی ہی نہیں اوپر سے زینے پر قدم رکھتا محسن بھی اپنی جگہ بل کر رہ گیا تھا اس کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اس نے اپنی آنکھیں مل کر کھولیں اوپر سے صحن میں موجود سبھی افراد دکھائی دے رہے تھے وہ اسے اپنا خواب سمجھ کر سر جھٹک کر دوبارہ اوپر چلا آیا تھا اور نیچے مزار نور اپنے ہاتھوں سے مومو کو سونے کی ہیرے جڑی انگوٹھی پہنانے کے بعد اس کے ہاتھ پر بیس ہزار روپے رکھتے ہوئے سب کو مبارکباد دے رہی تھیں دادی ملول اور بے بس سی بیٹھی پر نم آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں انہیں رہ رہ کر محسن کا خیال بے کل کر رہا تھا جو مومو کو بہت شدت سے چاہتا تھا اس سے بہت پیار کرتا تھا اب سے نہیں روز اول سے وہ اس کو کالج کی گڑیا کی مانند سنبھال سنبھال کر رکھتا آیا تھا اور وہ گڑیا اپنی ہی ذرا سی لا پرواہی سے اس سے دور ہو گئی تھی اس سے زیادہ وہ اس کے ماں باپ کی لا پرواہی خود غرضی اور جلد بازی کے سبب محسن سے چھین گئی تھی دادی چپ چاپ آنسو بہا رہی تھیں۔ اور مزار نور ٹھیک بیس دن بعد بارات لانے کا کہہ گئی تھیں مومو اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی میں جگمگاتی انگوٹھی کو بہت شوق سے دیکھ رہی تھی حیا سے مسکرا رہی تھی بیس ہزار روپے انجم آراء نے مزار نور کے جاتے ہی اس کے ہاتھ سے لے لئے عطا احمد مٹھائی محلے میں تقسیم کرنے کی غرض سے قریبی دکان سے لفافے خریدنے چلے گئے اور پھر لفافے لا کر ان میں مناسب مقدار میں مٹھائی ڈال ڈال کر ٹرے میں رکھتے گئے اور پھر محلے میں تقسیم کرنے نکل گئے خاندان میں بھی مٹھائی بھیجی گئی تو سب یہی سمجھے کہ مومو اور محسن کی شادی کی تاریخ طے ہوئی ہے۔ سب نے انہیں مٹھائی وصول کرتے ہوئے مبارکباد بھی دے دی تھی۔

☆☆☆

”دادی یہ سب کیا ہو گیا؟“ محسن نے دادی کے پاس ان کے کمرے میں آ کر بے قرار لہجے

میں سوال کیا تو دادی نے بھیکتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا وہ لٹا لٹا اور شکست خوردہ سادھواں دھواں چہرہ لئے ان کے سامنے کھڑا تھا اور ان کا دل چھلنی ہو گیا تھا اس کی حالت دیکھ کر اپنا غم غلط کرنے کو غصے سے بولیں۔

”ارے وہ بے خبر ہے تو کیا ہوا تو نے ہی اس کے دل میں اپنی محبت جگائی ہوتی مگر تجھے تو سونے سے ہی فرصت نہیں تیرے دو پیار بھرے بول مومو کے کانوں میں پڑے ہوتے تو وہ کبھی کسی اور کے نام کی انگوٹھی نہ پہنتی خود ہی انکار کر دیتی۔“

”دادی اس انہونی کا تو میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا مجھے کیا پتا تھا کہ مومو میری دسترس میں ہوتے ہوئے بھی بھر بھری ریت کی طرح میرے ہاتھوں سے پھسل جائے گی میں کیا سویا میری تو تقدیر ہی سو گئی۔“ محسن نے پلنگ کی پالستی پر بیٹھتے ہوئے دلگیر لہجے میں کہا۔

”عطا احمد کو دیکھو کیسا خوشی خوشی مٹھائی بانٹتا پھر رہا ہے یتیم بھتیجے کے دل کی پروا نہیں ہے اسے۔“ دادی نے روتے ہوئے کہا۔

”دادی، وہ مومو کے ماں باپ ہیں انہیں اپنی بیٹی کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا پورا حق حاصل ہے ایک امیر بزنس مین کے مقابلے میں ان کا یہ بے روزگار اور غریب بھتیجا تو صفر ہے دادی ایک دم صفر خدا کرے کہ مومو اس شخص کے ساتھ ہمیشہ خوش رہے۔“ محسن نے گہرا سانس لے کر دل کو سنبھالتے ہوئے لہجے کو مضبوط بنا کر کہا۔

”میں بات کروں گی انجم اور عطا سے۔“

دادی نے اس کے سر پر دست شفقت رکھ کر پریم لہجے میں کہا تو وہ مجروح مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے بولا۔

”کوئی فائدہ نہیں ہے دادی شادی کی تاریخ تک طے کر دی گئی ہے آن کی آن میں، میں چاچا چچی کا احسان مند ہوں اس لئے ان کو ان کے اس فیصلے پر نظر ثانی کرنے کے لئے نہیں کہہ سکتا۔“

”یا اللہ میرے بچوں کی خوشیاں نہ ان سے چھیننا۔“ دادی نے دوپٹہ پھیلا کر دل سے بھیکتے لہجے میں دعا مانگی۔

”محسن دیکھ پیاری ہے نا۔“ وہ کم صم سا اپنے کمرے میں بیٹھا تھا جب مومو نے آ کر انگوٹھی والا ہاتھ اس کے سامنے کرتے ہوئے انگوٹھی کے بارے اس کی رائے چاہی۔

”تمہارے ہاتھ کی انگلی میں سچی ہے پیاری تو ہونی ہے ناں۔“ محسن نے ایک نگاہ اس کی انگلی میں جگمگاتی انگٹھی پر ڈال کر اس کے رخِ زیبا کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”مجھے مبارکباد نہیں دو گے؟“

”خدا کرے کہ یہ انگٹھی اور انگٹھی والا تمہارے لئے مبارک ثابت ہو تم خوش ہونا مومواس منگنی سے۔“ محسن نے پوچھا۔

”خوش پتا نہیں محسن! مجھے خوش ہونا چاہیے نا اتنی قیمتی انگٹھی اور بیس ہزار کی رقم مجھے منگنی میں دے گئے ہیں وہ لوگ اور شادی کے اخراجات بھی خود اٹھانے کا کہہ رہے تھے محسن کیا میں اتنی اچھی ہوں کہ وہ لوگ مجھے بغیر جہیز کے قبول کرنے کو تیار ہیں اتنے دولت مند ہو کر مجھے جیسی غریب لڑکی کو بیاہنے چلے ہیں بولونا محسن کیا میں اتنی اچھی ہوں۔“ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں سوال کرتی آخر میں اس کا بازو پکڑ کر ہلاتے ہوئے بولی تو محسن نے اس کے نرم لمس کی حدت کو محسوس کرتے ہوئے جواب دیا۔

”ہاں تم بہت اچھی ہو اتنی اچھی ہو کہ اکبر کی ساری دولت بھی تمہارے سامنے بیچ ہے تم بہت معصوم ہو مومو میری دعا ہے کہ تمہاری معصومیت پر کوئی آنچ نہ آئے تم سدا خوش رہو۔“

”تھینک یو محسن! تم بہت اچھے ہو لیکن میرے دل میں عجیب سی بے چینی ہے میرا دل مطمئن اور مسرور کیوں نہیں ہے محسن؟“

”تم بہت نادان ہو مومو! بہت بے خبر ہو اور بے خبری میں تم مجھ پر ہی نہیں اپنے آپ پر بھی ظلم کر رہی ہو۔“ محسن نے ذو معنی بات کہی تو وہ الجھ گئی۔

”تم پہیلیاں کیوں بھجوا رہے ہو صاف بات کہو نا۔“

”اب صاف بات کہنے کا وقت گزر چکا ہے۔“

”تم ناراض ہو مجھ سے۔“ وہ پریشان نظروں سے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھتے ہوئے بولی تو وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے افسردگی سے بولا۔

”تم نے تو مجھ سے یہ حق بھی اب چھین لیا ہے۔“

”ایسا کیوں کہہ رہے ہو تم؟ میری منگنی ہوئی ہے موت تو نہیں ہوئی۔“

”تم کیوں مرو گئی؟ موت تو محسن کی ہوئی ہے۔“ وہ بے قرار لہجے میں اسے ڈپٹ کر بولا تو

اس نے بے اختیار اس کے منہ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بے قراری سے بولی۔
 ”بکومت خبردار جو تم نے دوبارہ ایسی بات کہی ہو میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گی۔“
 ”تو پھر میری آواز بھی کوئی نہیں سن سکے گا۔“ محسن یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ حیران پریشان سی وہاں کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

دادی کے سمجھانے کا عطا احمد اور انجم آراء پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا ان کا کہنا تھا کہ خوش نصیبی نے ان کے دروازے پر دستک دی ہے تو وہ کیوں دروازہ بند کر کے بیٹھ جائیں ان کی بیٹی پر آسائش اور آرام دہ زندگی گزارے یہی ان کی خواہش تھی جو اکبر کے رشتے کی صورت میں پوری ہو رہی تھی عزیزوں رشتے داروں کو جب مومو کی شادی کا دعوت نامہ موصول ہوا تو وہ محسن کی جگہ اکبر کا نام پڑھ کر حیران رہ گئے کئی نے گھروفن کر کے تصدیق چاہی اور کئی تو باقاعدہ گھر آئے اور حقیقت جان کر اور یہ جان کر کہ اکبر ایک دولت مند بزنس مین ہے حیران رہ گئے اور سمجھ بھی گئے کہ عطا احمد اور انجم آراء نے اپنے یتیم اور قابل بھتیجے کو صرف دولت نہ ہونے کے سبب مومو کا شریک زندگی بنانے سے انکار کیا ہے انہیں محسن سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی اور مومو کی قسمت پر رشک و حسد کے جذبات ان کے دل میں ابھر رہے تھے شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں اور اس شور میں محسن کے زخمی دل کی چیخ و پکار کسی کو نہیں سنائی دے رہی تھی محسن اور دادی کے سوا سبھی گھر میں خوش تھے شادی ہال کا انتخاب اکبر نے کیا تھا اور کھانے کے متعلق ہدایات مسر انور اور مسر انور نے دی تھیں اور سارا بل بھی خود ہی ایڈ والٹھی میں جمع کر دیا تھا عطا احمد ان کے شایان شان میرج ہال کا انتظام کرنے اور اس کے بل ادا کرنے کی حیثیت نہیں رکھتے تھے انہوں نے جو کچھ جمع کیا تھا وہ ہندی پر خرچ کر رہے تھے ہندی کی تقریب میں اکبر کے صرف گھر والے شریک ہونا تھے گھر کو خوبصورتی سے سجایا گیا تھا محسن تمام انتظامات بڑے حوصلے اور صبر سے کر رہا تھا عزیز رشتے دار اسے ہمدردانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے اور وہ کمال ضبط اور حوصلے سے مسکرا مسکرا کر سب کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

اگلے دن مومو کی شادی تھی وہ کسی اور کی دلہن اپنے جہاز سے دادی نے محسن کو اپنے پاس بلایا اور قرآنی آیات کا ورد کر کے اس پر دم کر دیا ان کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا بس پیار اور دکھ

آنکھوں میں سموئے کچھ دیر اس کے چہرے کو دیکھتی رہیں اس کے سر پر دست شفقت پھیرتی رہیں اور محسن بھی بس خاموشی سے بیٹھا رہا پھر ان کے ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگائے چومے اور کمرے سے باہر نکل گیا مومو کو مسز انور کی گاڑی اور ڈرائیور کے ساتھ محسن کے ساتھ بیوٹی پارلر تیار ہونے کے لئے بھیجا گیا تھا مومو کی شادی کی خریداری بھی مسز انور نے کی تھی اور بیوٹی پارلر کا اس کے عروسی جوڑے اور زیورات کا بل بھی انہوں نے ہی ادا کیا تھا عطا احمد اور انجم آراء تو ہر بوجھ سے آزاد ہو گئے اور بہت خوش تھے محسن نے مومو کو بیوٹی پارلر سے تیار کروا کر سیدھا شادی ہال پہنچنا تھا مومو تیار ہو چکی تھی اور سرخ اور گولڈن عروسی جوڑے اور طلائی عروسی زیورات میں وہ اور ہی دنیا کی مخلوق دکھائی دے رہی تھی ایک الوہی حسن اس کے چہرے پر اُٹھ آیا تھا محسن نے اس کی طرف نگاہ کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا وہ نظریں جھکائے رہا تھا مومو چادر میں لپٹی کٹی گاڑی میں آ بیٹھی محسن آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا تھا اور وہاں سے مومو کو شادی ہال پہنچا دیا جہاں انجم آراء اور اس کی کزنز سہیلیاں اس کے استقبال کے لئے موجود تھیں مومو نے محسوس کیا تھا کہ محسن نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں تھا اس سے بات تو اس نے پچھلے دو روز سے نہیں کی تھی وہ محسن کی تنگی سے پریشان تھی اور وجہ سے بے خبر تھی وہ تو یہی سمجھ رہی تھی کہ محسن اس کے وداع ہونے کے خیال سے اداس ہے اداس تو وہ بھی تھی لیکن اسے ایک پر آسائش زندگی دولت کی ریل پیل اور لمبی لمبی گاڑیوں میں گھومنے پھرنے کی خواہش پوری ہونے کی جو کتنی اکبر کی بیوی بننے پر مل رہی تھی اس کی خوشی بھی کم نہیں تھی۔

بارات پہنچی تو اس کا شاندار استقبال کیا گیا قبول و ایجاب کی رسم ادا ہوئی تو مبارک سلامت کا شور مچ گیا محسن کا دل برباد ہو رہا تھا اور مومو کا گھر آباد ہو رہا تھا وہ زخمی دل کے ساتھ مومو کی دائمی خوشیوں کی دعائیں مانگ رہا تھا اور خود وہ ایک دم سے خالی اور ویران ہو گیا تھا اجڑ گیا تھا دیار دل میں روح کے بندی خانے میں صف ماتم نہجی تھی لیکن وہ خود کو یہ کہہ کر بھلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس شادی سے اس کی مومو کی خوشی وابستہ ہے اس کی محبت کے دولت مند بننے کے خواب پورے ہو رہے ہیں مگر یہ دل کب کوئی دلیل سنتا اور مانتا ہے اس کے تو اپنے قانون قاعدے اور اصول ہوتے ہیں اور محبت کے معاملے میں کوئی دلیل کارگر ثابت نہیں ہوتی مومو رخصت ہو گئی تھی اور محسن کے دل کا چین بھی۔

”محسن سو گیا کیا؟“ گھر آتے ہی محسن اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا دادی کو اس کی دلی کیفیت کا احساس تھا جبھی عشاء کی نماز پڑھ کر اس کے کمرے میں چلی آئیں وہ اوندھے منہ بستر پر آڑھتاڑھا لیٹا تھا ان کی آواز سن کر سیدھا ہو گیا اس کی آنکھیں ضبط گریہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔

”کاش! دادی محسن سو گیا ہوتا ہمیشہ کے لئے۔“ وہ آرزوگی سے بولا۔

”اللہ نہ کرے خبردار جو دوبارہ ایسی بات کہی ہو۔“ دادی کا دل دہل گیا تڑپ کر بے قرار لہجے میں بولیں۔

”دادی! زندگی کے سارے رنگ تو مجھ سے چھن گئے ہیں میری ہنسی میری خوشی میری زندگی تک ہر وہ چیز جو میرے جینے کا سامان تھی تقدیر نے مجھ سے چھین لی ہے کیا کروں گا اب میں؟ کس کے لئے جیوں گا دادی؟“ وہ غم آلود لہجے میں بے بسی سے بولا۔

”میرے لئے میں کیا تیری کچھ نہیں لگتی؟ ارے مجھ بوڑھی کا تجھے کوئی خیال نہیں ہے میں بھی تو دکھی ہوں مومو کے چلے جانے سے میں نے کب سوچا تھا کہ وہ..... تیری بجائے..... کسی اور کی دلہن بن جائے گی مجھے بھی بہت دکھ ہے میرے بچے تو اکیلا غمگین نہیں ہے میرا دل بھی غم سے بوجھل ہے اب تو ہم مومو کی خوشیوں کے لئے دعا ہی کر سکتے ہیں۔“ دادی روتے ہوئے اس کے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ کر غمزہ لہجے میں بولیں۔

”دادی! مجھ سے نہیں جیا جائے گا اس کے بغیر میرے لئے دعا کریں دادی وہ مجھے یاد نہ آئے۔“ محسن نے جھپکتے لہجے میں کہا اور دادی گود میں سر رکھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا بوڑھی دادی بھی اس کے ساتھ بلک رہی تھیں۔



شرم و حیا میں ڈوبی مٹی مٹی سی مومو اکبر کے دل پر بجلی گرا رہی تھی گلابی رنگ کا کا مدار جوڑا پہنے وہ تیار ہو گئی تھی اکبر نے سب کے ساتھ ناشتہ کرنے کی بجائے اپنا اور مومو کا ناشتہ بیڈروم میں ہی منگا لیا تھا۔

”ہم اکیلے ناشتہ کریں گے۔“ مومو نے جھپکتے ہوئے کہا کیونکہ مسز انور خود انہیں تیار ہو کر ناشتہ کے لئے ڈائیننگ ہال میں آنے کا کہہ کر گئیں تھیں۔

”ہم دو ہیں اکیلے کیسے ہو گئے؟“ وہ شوخی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”میرا مطلب تھا کہ آنٹی بلانے آئی تھیں وہ کیا سوچیں گی؟“ وہ حیا سے نظریں جھکائے مدھم آواز میں بولی۔

”بہی کہ دولہا، دلہن تخلیہ چاہتے ہیں۔“ اکبر نے شریر لہجے میں کہا اور اس کے رخسار پر اپنی محبت کی مہر ثبت کر دی وہ شرابو کھلا گئی وہ اس کی اس کیفیت سے محفوظ ہو کر ہنس پڑا۔

”آج ہماری شادی شدہ زندگی کی پہلی صبح ہے۔ لہذا میں اپنے ہاتھ سے اپنی دلہن کو ناشتہ کراؤں گا۔“ اکبر نے ٹرائی میں سجے لوازمات میں سے پوی اور مرغ چنے کی پلیٹیں سامنے رکھتے ہوئے کہا تو وہ مزید بوکھلا گئی۔

”نن..... نہیں میں خود سے کھالوں گی۔“

”نہیں تم میرے ہاتھ سے کھاؤ گی یا پھر مجھے اپنے ہاتھ سے کھلاؤ گی۔“ اکبر نے اس کے چہرے کو محبت پاش اور وارفتہ نظر دلہا سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ شش و پنج میں پڑ گئی اس کی شرم و حیا بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ دیکھ کر وہ ہنس پڑا۔

☆☆☆

محسن نے مومو کی جدائی کا غم غلط کرنے کے لئے خود کو کتابوں میں الجھالیا تھا اس کے سی ایس ایس کے امتحانات بھی شروع ہو گئے تھے دادی اس کے کھانے پینے کا خود سے بہت خیال رکھنے لگی تھیں اور انجم آراء کو انہوں نے خاصی ہدایت دی تھی کہ محسن کے کھانے کا اس کی ضرورت کی چیزوں کا خیال رکھا کریں تاکہ وہ اطمینان سے اپنے امتحانات کی تیاری کر کے پرچے دے سکے انجم آراء تو خود بھی چاہتی تھیں کہ محسن امتحان میں کامیاب ہو جائے وہی ان کے بڑھاپے کا سہارا تھا اس لئے ان کے حسن و سلوک میں اضافہ ہو گیا تھا وہ روزانہ رات کو محسن کے لئے دودھ کا گلاس لے کر جاتیں تو محسن شرمندہ سا ہو کر کہتا۔

”چچی جان! اس کی کیا ضرورت تھی۔“

”ضرورت کیوں نہیں ہے میرا بیٹا دن رات پڑھتا ہے محنت کرتا ہے اس کو طاقت بھی تو چاہیے ہوتی ہے دودھ پی کر سوجانا اللہ تمہیں اس امتحان میں ہر امتحان میں کامیابی سے نوازے۔“

انجم آراء نے متاثر ہو کر لہجے میں کہتے ہوئے اس کے سر پر دست شفقت رکھا تو محسن نے ان کی اس دعا پر دل سے آمین کہا۔

☆☆☆

”تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔“ اکبر نے گم صم بیٹھی مومو کو دیکھتے ہوئے کہا وہ دودن پہلے ہی شامی علاقہ جات کی سیر سے واپس لوٹے تھے۔

”یہ کپڑے بہت عجیب سے ہیں میں نے پہلے کبھی ایسے کپڑے نہیں پہنے۔“ مومو نے جھجکتے ہوئے اپنے سامنے بیڈ پر رکھے سیلو لیس بلاؤز میکی کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”تو اب پہن لو آہستہ آہستہ خود ہی عادی ہو جاؤ گی ہماری سوسائٹی میں اسی قسم کا لباس پہنا جاتا ہے۔ تم کیا چادر دوپٹہ پلیٹ کر پھرتی ہو یہ اکیسویں صدی ہے سولہویں صدی نہیں ہے۔ مریم بی بی۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا تو مومواس کے آخری جملے پر بری طرح چوکی تھی اور اس کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب پھر کسی وقت سمجھاؤں گا ابھی تو تم تیار ہو جاؤ وہاں سب دوست ہمارے منتظر ہوں گے۔“ اکبر نے ٹائی باندھتے ہوئے جواب دیا۔

”میں کوئی اور لباس پہن لیتی ہوں۔“ مومو نے بیڑاری سے کہا۔

”پھر میں کسی اور لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔“ اکبر تیز لہجے میں بولا۔

”کیوں کسی اور لڑکی کو کیوں، میں آپ کی بیوی ہوں۔“

”بیوی ہو تو شوہر کی بات ماننا بھی سیکھو تم سے میں نے شادی اس لئے نہیں کی کہ تمہارے نخرے اٹھا تار ہوں تمہاری مفتیں کرتا رہوں ہائی سوسائٹی میں رہنے کے ڈھنگ سیکھو بی بی باقی تو سارے ڈھنگ آتے ہیں تمہیں۔“ وہ غصے اور طنز سے بولا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”دس منٹ میں یہ لباس پہن کر تیار ہو کر باہر آ جاؤ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ اکبر اس کو مطلب سمجھانے کی بجائے سختی سے حکم جاری کرتا کرے سے باہر نکل گیا مومواس کے یکا یک بدلتے رویے پر حیران اور خوفزدہ سی رہ گئی ناچاہتے ہوئے بھی اس نے وہ لباس زیب تن کیا تیار ہو کر جب وہ باہر نکلے تو اکبر کی نظریں اس کے سندسراپے میں گڑھی جا رہی تھیں اور وہ اس نیم عریاں لباس میں شرم سے زمین میں گڑھی جا رہی تھی۔

”ہوں ویس لائیک اے گڈ گرل اب لگی ہونا میری بیوی کم آن سویٹ ہارٹ۔“ اکبر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم کر بڑے دلربا لہجے میں کہا۔

اکبر کے دوست نومی کی اس پارٹی میں آ کر مومو کو اپنا آپ بہت بے مایا بے محسوس ہو رہا تھا وہاں اکبر کے دوسرے دوست بھی اپنی اپنی بیگمات اور گرل فرینڈز کے ساتھ موجود تھے اور تمام خواتین کے لباس مومو کے لباس سے بھی زیادہ بولڈ اور عریانی کا شاہکار تھے مومو کو شرمندگی اور کراہیت سی محسوس ہو رہی تھی مگر سب سے مسکرا کر ملنا اور بات کرنا اس کی مجبوری تھی کیونکہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ اس کی خواہش اور مرضی کے مطابق تیار ہو کر آئی تھی اس پارٹی میں جوان دونوں کے اعزاز میں ہی دی گئی تھی اکبر کے دوستوں نے جس طرح مومو کے حسن کو سراہا تھا جس طرح ہوس بھری نظروں سے دیکھا تھا وہ مومو جیسی باحیا اور معصوم لڑکی کے لئے ڈوب مرنے کا مقام تھا مگر سب کچھ سنتی رہی ضبط کرتی رہی خدا خدا کر کے پارٹی ختم ہوئی تو اس نے سکھ کا سانس لیا بس ڈاننگ فلور پر ڈانس کرتا رہ گیا تھا اکبر اور اس کے دوستوں نے اپنی اپنی بیگمات اور گرل فرینڈز کے ساتھ تیز موسیقی کی تال پر جو دھماکا چوکڑی مچائی تھی مومو کے تو پسینے چھوٹ گئے وہ سب دیکھ کر اسے نئی نوپلی شرمیلی دلہن ہونے کی وجہ سے ڈانس کے لئے زیادہ مجبور نہیں کیا گیا تھا اکبر بھی اسے آہستہ آہستہ اپنے ماحول کا عادی بنانے کا سوچ رہا تھا ایک دم سے اتنی ساری تبدیلیاں اور وہ بھی خدشہ تھا لہذا اسی خیال کے تحت اکبر نے مومو کو دھیرے دھیرے سبق سکھانے اور اپنی ہائی سوسائٹی کے اطوار اپنانے کا فیصلہ کیا تھا اور وہ مطمئن بھی تھا کہ مومو جیسی کم عمر لڑکی جلد ہی اس کے ماحول کے مطابق خود کو ڈھال لے گی اکبر کا خیال تھا کہ یہ نڈل کلاس لڑکیاں امیر بننے کے خواب دیکھتی ہیں اور جب کسی امیر زادے سے بیاہی جاتی ہیں تو اپنی تمام نا آسودہ اور تشنہ خواہشیں اور حسرتیں پوری کرتی ہیں ہر طرح سے اپنی دولت اپنی آزادی کا استعمال کرتی ہیں نت نئے فیشن کرنا ان کی سب سے بڑی خواہش ہوتا ہے اور وہ دنیا کی قیمتی اور حسین چیزیں خرید کر جیولری نئے کپڑے جوتے وغیرہ خرید کر پہن کر خود کو سجا سنوار کر بہت خوش ہوتی ہیں بس اسی خیال نے اکبر کو مومو سے شادی کرنے پر اکسایا تھا درحقیقت وہ اس کا حسن کیش کرنا چاہتا تھا اس کو اپنے ساتھ اپنے بزنس سرکل میں متعارف کرا کے اس کے ذریعے اپنے رکے ہوئے کام اور بڑے بڑے پروڈیکٹ حاصل کرنا چاہتا تھا جیسے اس کے دوسرے دوست اپنے کام نکلوانے کے لئے مطلوبہ لوگوں تک اپنی

بیویوں کو چارہ بنا کر ڈالا کرتے تھے۔ اکبر کی والدہ بھی اسی لئے مومو کو اپنی بہو بنانے پر راضی ہوئی تھیں کہ وہ بے پناہ حسن کی مالک تھی۔

☆☆☆

محسن کے امتحانات کا رزلٹ آؤٹ ہو گیا تھا اس نے چوتھی پوزیشن حاصل کی تھی اور اسے فارن سروسز جوائن کرنے کی آفر بھی ہوئی تھی مگر وہ اپنے ملک میں رہ کر اپنے ملک کے نظام تعلیم کو درست کرنے بہتر بنانے اور قابل عمل بنانے کا ارادہ رکھتا تھا لہذا اس نے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کا انتخاب کیا تھا۔

گھر میں دادی انجم آراء اور عطا احمد بہت زیادہ خوش تھے مومو نے اسے فون پر مبارکباد دی تھی کیونکہ گھر جانے سے اکبر نے اسے منع کر دیا تھا کیونکہ اکبر کا خیال تھا کہ اس کی بیوی ایک معمولی سے گھر میں جائے گی تو اس سے اس کی ناک کٹ جائے گی اکبر نے تو اپنے دوست احباب کو یہی بتایا تھا کہ مومو اس کی دور پرے کی رشتے دار ہے کزن ہے اور وہ اسے دہلی میں ملی تھی مومو کے لئے یہ پابندی بڑی جاں گسل تھی وہ اپنے پیاروں سے ملنے بھی نہیں جاسکتی تھی ایک بار عطا احمد اور انجم آراء اس سے ملنے آئے تھے تو انہیں بھی اپنا آپ اس محل نما گھر میں مس فٹ محسوس ہوا تھا اور مومو کے علاوہ ان سے کسی نے ملنے بات کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی جس کا انہیں رنج تو تھا لیکن وہ یہ سوچ کر مطمئن تھے کہ ان کی اکلوتی بیٹی تو محل میں رانی بن کر راج کر رہی ہے عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہی ہے۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ عیش و آرام کی زندگی مومو کے لئے کانٹوں کی سیج بن گئی تھی وہ روز روز اکبر کے ساتھ اس کے دوستوں سے ملنے اس کے کہنے کے مطابق تیار ہونے اور اس کی خواہش کے مطابق غیر مردوں سے ہنس ہنس کر بیٹھ کر باتیں کرنے انہیں رجھانے اور اکبر کے لئے کانٹریکٹ نکلوانے کے اس ذلت آمیز عمل سے تنگ آ چکی تھی، اکبر کے ایک دوست نے مومو کوٹی وی کمرشل میں کام کرنے اور ماڈلنگ کرنے کی پیشکش کی تو اس نے فوراً انکار کر دیا اکبر نے گھر آ کر وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا۔

”مجھے گھر گھر اپنی نمائش لگوانے اور غیر مردوں کی نگاہوں کی زد میں آنے کی کوئی خواہش نہیں ہے یہ سب بھی میں اب تک آپ کی وجہ سے کرتی رہی ہوں ورنہ یہ میرا مزاج اور ماحول

”نہیں تھا۔“

”جانتا ہوں میں تمہارا مزاج اور ماحول میں اگر تمہیں بیاہ کرنے لانا تو تم رہتیں وہیں اپنے گلے سڑے محلے اور خستہ گھر میں نالی کا کیڑا بن کر میں نے تمہاری حیثیت بڑھائی ہے اعلیٰ مقام دیا ہے عزت دی ہے۔“ وہ طنز سے بولا۔

”عزت کون سی عزت مسٹر اکبر میں آپ کی بیوی ہوں آپ کی عزت میں ہوں جسے آپ غیر مردوں کے سامنے رسوا اور بے مول کرتے پھرتے ہیں بیوی کی عزت کے نام پر اپنی دولت میں اضافہ کیا ہے آپ نے بیوی کا حسن کیش کرانا ہی دراصل آپ کا مشن تھا مجھ سے شادی آپ نے میرے بھلے کے لئے نہیں کی بلکہ اپنے بھلے کے لئے کی ہے مجھے اپنی ترقی اور خوشحالی کے لئے ڈھال بنا کر سیڑھی بنا کر لائے ہیں آپ۔“

”تو کیا غلط کیا ہے میں نے بولو تم بھی تو ایسے ہی کسی شکار کی تلاش میں فلیٹوں میں تتلی کی طرح اڑتی پھرتی تھی مجھ جیسے خوب رو اور امیر لڑکوں کو چھسنے کے لئے۔“ اکبر نے کمینگی سے تیز لہجے میں کہا تو وہ چیخ کر بولی۔

”بکو اس ہے یہ میں اس طرح نہیں رہتی تھی اس طرح سے میری بے پردگی کبھی نہیں ہوئی تھی جس طرح تم نے مجھے تتلی بنا کر اپنے دوستوں کی محفلوں میں سجا کر میری بے پردگی کرائی ہے۔“

”پہلے تو جیسے تم بہت با پردہ با حیا بی بی تھیں ناں میں جیسے تمہیں جانتا نہیں ہوں کہ کس طرح ایک دوپٹے میں زلفیں کھولے فلیٹوں میں گھومتی پھرتی تھیں۔ نجانے کس کس کے دل پر بجلی گراتی ہو اور کتنوں سے اپنے حسن کا خراج وصول کرتی ہوگی۔“ اکبر نے سطحی انداز میں کہا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

”جیسی تمہاری گھٹیا اور سطحی سوچ ہے ویسی ہی باتیں کرو گے نا تم۔“ مومو نے بڑے ضبط سے کہا۔

”میں گھٹیا ہوں ہاں تو تم مجھ سے کیوں ٹکرائیں تھیں؟“

”میں اگر غلطی سے ٹکرائی تھی تو تم تو آنکھیں کھلی رکھتے تم کیوں سوڑے کی لیس بنے تھے تم

نے کیوں ڈائلاگ بولے تھے؟“ مومو نے بھی سوالیہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔

”تم اپنے حسن کی داد پانے کے لئے ہی گھر سے نکلیں تھیں دعوتِ نظارہ تو تم نے خود دیا تھا

پھر میرے ڈائلاگ تمہیں کیوں بُرے لگنے لگے تم ہی بے حیا اور آوارہ تم نے شادی سے پہلے مجھے پٹایا تھا۔“ اکبر نے حد ہی کر دی تو مومو بھی پھٹ پڑی۔

”شٹ اپ۔“

”یو شٹ اپ۔“ اکبر غصے سے چلایا۔

”میرے کہنے سے غیر مردوں کے سامنے جاتے ان سے بات کرتے تمہاری عزت میں کمی آتی ہے بے پردگی ہوتی ہے اور خود ہی شادی سے پہلے فلیٹوں کی بلڈنگ میں مڑگشت کیا کرتی تھیں وہ کس لئے تھا میں اچھی طرح جانتا ہوں تم جیسی لڑکیاں گھر میں ننگ کر رہنا نہیں جانتیں تمہیں بھانت بھانت کے مردوں کو دعوت نظارہ دے کر اپنے حسن کی داد وصول کرنے میں ہی راحت محسوس ہوتی ہے۔“ اکبر نے مزید زہرا گلا۔

”بکواس ہے یہ سب یہ تمہارے اپنے ذہن کی گندگی ہے۔“

”شٹ اپ۔“ اکبر نے اس کے گال پر تھپڑ رسید کر دیا۔

”تم تو جیسے بہت پاک صاف اور مقدس ہونا پونے کے لائق۔“ اکبر نے طنزیہ اور تلخ لہجے میں کہا۔ تو نجمانے مومو کو اچانک کیا ہوا۔ ایک دم سے اس کا ہاتھ اٹھا اور اکبر کے گال پر اپنا نشان چھوڑ گیا۔

”ہاں، ہاں میں مریم ہوں۔“ وہ غصے سے ہانپتی ہوئی بولی اس سے اپنے کردار پر کچڑ اچھالتا برداشت نہیں ہو رہا تھا جیسی اس کا ہاتھ اٹھ گیا تھا وہ اپنی اس جرأت اور حرکت پر خود بھی حیران ہو رہی تھی۔

”تم..... تم نے مجھے تھپڑ مارا مجھ پر ہاتھ اٹھایا تم نے۔“ اکبر کی حالت زخمی سانپ کی سی ہو رہی تھی وہ غصے سے پھنکارا۔

”تم اگر مجھ پر ہاتھ اٹھا سکتے ہو تو میں بھی اپنے ہاتھ میکے نہیں چھوڑ کر آئی ہوں۔“ مومو نے شعلہ بار لہجے میں جواب دیا۔

”اسی میکے روانہ کروں گا تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا مریم بیگم میں تمہیں طلاق دیتا ہوں ابھی اور اسی وقت تمہیں طلاق دیتا ہوں طلاق دیتا ہوں میں تمہیں مریم بیگم اب میرے گھر سے نکل جاؤ فوراً تم جیسی لڑکیوں کی کمی نہیں ہے ایک ڈھونڈ و ہزار ملتی ہیں یہ تمہاری سزا ہے مجھ پر ہاتھ اٹھانے

کی سزا ہے کاغذی ثبوت کے ساتھ طلاق نامہ تمہارے باپ کے گھر بھجوادوں گا میں۔“ اکبر نے آن کی آن میں مومو سے اپنا رشتہ ہی توڑ ڈالا وہ لمحے بھر کو تو سکتے میں آگئی تھی مگر فوراً ہی سنبھل بھی گئی تھی۔

”بہت شکریہ مسٹر اکبر کہ تم نے مجھے خود ہی آزاد کر دیا میں بھی تم جیسے گھنیا اور بے حمیت شخص کے ساتھ مزید نہیں رہ سکتی تھی۔ تمہیں تمہاری گھنیا سوچ اور میرے حسن کے طفیل کمائی گئی دولت مبارک ہو۔“ مومو نے تیز لہجے میں کہا۔

”طلاق کا داغ اپنے ماتھے پر سجا کر ماں باپ کے گھر پہنچو گی تو کیا خیال ہے تمہارا وہ تمہارے گلے میں پھولوں کے ہار پہنائیں گے صدے سے ہی مرجائیں گے۔ لالچ میں آ کر انہوں نے مجھ سے تمہاری شادی کی تھی ناچہ چہ بے چارے۔“ اکبر نے تمسخرانہ اور طنزیہ انداز میں کہا۔

”وہ اللہ کا شکر ادا کریں گے کہ تم جیسے مطلبی شخص سے ان کی بیٹی کو جلد نجات مل گئی ہے۔“ ”ہونہہ رسی جل گئی بل نہیں گیا۔“ اکبر نے تمسخر اڑاتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا مومو نے اپنا وہ سامان جو وہ میکے سے لائی تھی بیگ اور سوٹ کیس میں پیک کیا اور ”انورولا“ سے ہمیشہ کے لئے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

”اسی لئے کہتے ہیں لالچ بری بلا ہے اور جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے دیکھ لیا۔ اپنے لالچ اور جلد بازی کا انجام میری معصوم سی بچی کو۔ اس شیطان نے کس طرح اپنی دولت بڑھانے کو استعمال کیا۔ اور مومو کے اب انکار کرنے پر کیسے اسے اپنی زندگی سے نکال باہر کیا کسی معصوم کا دل توڑ کر بھلا تمہارا دل سکھی اور مطمئن رہ سکتا تھا۔“

دادی صدے اور غصے سے عطا احمد اور انجم آراء پر برس رہی تھیں جبکہ مومو جو اکبر کے سامنے ضبط کرتی آئی تھی اب ان کی گود میں سر رکھے بلک بلک کر رو رہی تھی عطا احمد اور انجم آراء الگ بیٹی کے اجڑ کر آنے پر اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر اشک بہا رہے تھے۔

”ارے یہ دولت مند کسی غریب کو بتا کسی مقصد یا ضرورت کے نہیں اپناتے ہماری مومو انہیں ہیرے کی کان لگی تھی جیسی اس کے حسن و جمال کی خاطر اس سے فائدہ اٹھانے کی خاطر اسے

بیاہ کر لے گئے تھے خدا غارت کرے اس کمینے اکبر کو ایسی سزا ملے گی زندگی بھر یاد رکھے گا۔“ دادی بولتے بولتے خود بھی رو پڑیں۔

محسن گھر میں نہیں تھا ٹریننگ پر گیا ہوا تھا مومو کو اس وقت ایک مخلص دوست کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی اس سے تو اپنے سارے دکھ سکھ شیر کر لیتی تھی اسے محسن کی باتیں اب سمجھ میں آرہی تھیں کہ وہ اسے معصوم اور نادان نا سمجھ بے خبر کیوں کہا کرتا تھا؟

”ٹھیک ہی تو کہتا تھا محسن مجھے بنا چادر کے گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا قصور سار لڑکوں کا تو نہیں ہوتا ہم لڑکیاں ہی کم عقل اور نادان ہوتی ہیں جب ہم اپنی زینت کی حفاظت نہیں کریں گی بنا چادر عبا یا اور حجاب کے کھلے سر کھلے بالوں کے ساتھ کھلی پھریں گی تو دعوتِ نظارہ تو خود بخود دیکھنے والوں کو ملے گا نا ہمارا دین اسلام بھی ہمیں پردے کی تاکید کرتا ہے ہم اپنے مذہب سے دور ہو کر بھٹکتے اور بھٹکتے جا رہے ہیں عورت کا تو معنی ہی ڈھکی چھپی اور پوشیدہ رہنے والی چیز کے ہیں اور آج کی عورت سولہ سنگھار کر کے مردوں کو رجھانے دعوتِ گناہ دینے اور روپیہ پیسہ کمانے کی خاطر اسٹیج تک مردوں کے بیچ عریاں لباس میں رقص کرنے سے نہیں کتراتیں ہم گمراہی کے راستے پر چل نکلے ہیں عورت کو خود اپنی عزت اور حجاب کا احساس نہیں رہا پھر مردوں کو سارا دوش کیوں دیا جائے انہیں اگر کوئی چمکتی دکتی چیز اپنی جانب متوجہ کرے گی تو وہ اس کی طرف ضرور بڑھیں گے عورت کی آبرو تو اس کے پوشیدہ رہنے میں گھر کی چادر دیواری میں رہنے میں منحصر ہے گھر سے باہر اور حد سے باہر نکل کر تو صرف ہوس زدہ نگاہیں لنگتی زبانیں اور شیطانی ہاتھ اپنے مکروہ چہروں کے ساتھ اس کی آمد کے منتظر ہوتے ہیں میرے اللہ ہم سب لڑکیوں کو عورتوں بہنوں بیٹیوں کو نیک ہدایت دے صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرما ہمیں اپنی حفاظت کا احساس عطا فرمادے“ مومو نے دل ہی دل میں خود سے سوال جواب کرتے اپنا تجزیہ کرتے ہوئے آخر میں دعا کی۔

☆☆☆

”مومو۔“ وہ گم صم اور اداس بیٹھی تھی جب محسن کی آواز نے اسے چونکا دیا پورے چھ ماہ بعد وہ اسے دیکھ رہی تھی کتنا بدلا بدلا سا لگ رہا تھا وہ ایک دم سے اٹھ کر اس کی جانب دوڑی۔

”محسن!“ مومو نے اس کے بازو کو پکڑ کر اس کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”مومو جو کچھ ہوا مجھے اس کا افسوس ہے مجھے کل رات ہی دادی نے فون پر بتایا تھا۔“ محسن نے خود کو سنبھالتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”محسن میری زندگی کتنی بے فکری کی زندگی تھی اس شخص نے مجھے بے مول کر دیا محسن اس شخص نے مجھ پر ہاتھ بھی اٹھایا تھا مگر میں نے بھی تھپڑ کا جواب تھپڑ سے ہی دیا تھا وہ بھی ساری زندگی یاد رکھے گا۔“ وہ روتے ہوئے بتا رہی تھی تو محسن نے حیران ہو کر کہا۔

”تم نے اپنے شوہر کو تھپڑ مارا تھا۔“

”اس نے بھی تو مارا تھا میں بھی اپنے ہاتھ میسے میں نہیں رکھ کر گئی تھی اور کب تک برداشت کرتی میں اس کی بدسلوکی اور کمینگی اس نے مجھے شوپیس ماڈل گرل بنا دیا تھا اللہ کرے اسے۔“

”نہ بد دعا مت دینا اسے۔“ محسن نے فوراً اسے ٹوک دیا۔

”کیوں؟“

”کیونکہ بدسلوکی کرنے والے اپنی غرض کے لئے رشتوں کا ناجائز فائدہ اٹھانے والے قدرت کے ہاتھوں خود بخود اپنے انجام کو پہنچ جاتے ہیں سنو مجھ سے شادی کرو گی۔“

”کیوں؟“ مومو نے ایک دم سے سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

”میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“

”وہ خبیث آدمی بھی یہی کہتا تھا۔ پھر بعد میں ذلت اور اذیت کے سوا۔ اس نے مجھے کچھ نہیں دیا۔“

”اور تم مجھے اس شخص سے ملا رہی ہو افسوس تم ہمیشہ سے ہی نا سمجھ اور بے خبر ہو۔ میری محبت روز اول سے تمہاری ہے۔ ہمیشہ سے میں تمہاری محبت کا اسیر ہوں اور میں تمہیں بہت محبت اور چاہت سے رکھوں گا میں تو مطمئن تھا کہ تم میری ہم سفر بنو گی مگر اچانک اکبر بیچ میں آ گیا اور آن کی آن میں تمہیں مجھ سے چھین کر لے گیا تم نہیں جانتیں میں کتنا تڑپا ہوں تمہارے لئے میرے لئے تو یہ احساس ہی جان لیوا تھا کہ تم کسی اور کی بیوی بن گئی ہو میری محبت سچی تھی جیسی تو تم مجھے مل گئیں۔“ محسن نے نرمی سے کہا وہ حیرانگی سے سن رہی تھی۔

”وہ مجھے آوارہ کہتا تھا۔“ مومو نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

اور میں تمہیں چاند ستارہ کہتا ہوں میں بچپن سے تمہیں تمہارے کردار کو جانتا ہوں تمہارے

ہر فعل سے آگاہ ہوں تم پھولوں پر برسنے والی شبنم کی طرح اجلی اور پاکیزہ صبح کی پہلی کرن کی طرح مقدس ہوا کبر کا اپنا ذہن اور زاویہ نگاہ پست تھا تم تو بہت پیاری لڑکی ہو۔ محسن نے نرمی سے کہا اور اس کو پیار سے دیکھا۔

”تم..... تم نے یہ سب پہلے کیوں نہیں کہا تھا؟“ مومو اس کی اپنے لئے اس قدر محبت اور عزت محسوس کر کے پھر سے اس کے شانے پر سر رکھ کر رونے لگی۔

”میں سمجھتا تھا کہ تمہیں دولت سے پیار ہے۔“

”لغت ہے ایسی دولت پر جس سے محبت اور عزت چھن جائے میں نے دولت مند بننے کی خواہش ضرور کی تھی مگر اپنی سیرت و کردار کے عوض نہیں رشتوں کے تقدس کی قیمت پر نہیں۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”میں جانتا ہوں۔“

”جانتے تو مجھے دولت سے پیار کا طعنہ نہ دیتے۔“

”آئی ایم سوری مومو اچھا رو تو مت میرے ہی شانے پر سر رکھ کر رونا تھا تو کسی اور کا ہاتھ کیوں تھاما تھا؟“

”تمہیں میرے آنسو برے لگ رہے ہیں تو جاؤ میں اپنی ہی گود میں سر رکھ کر رولوں گی مجھے کسی شانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ مومو ایک دم سے اس سے الگ ہو کر غصے سے بھگتے لہجے میں بولی تو وہ تڑپ کر بولا۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا مومو صبح تو یہ ہے کہ مجھے تمہارے آنسو بہت دکھی کر رہے ہیں میں نے تو ہمیشہ تمہارے چہرے پر خوشی کے رنگ دیکھنے کی تمنا اور دعا کی ہے۔“

”میں بہت خوش ہوں تم جاؤ یہاں سے۔“

وہ بچوں کی طرح ہاتھوں کی پشت سے اپنے آنسو گڑتے ہوئے بولی تو محسن ایک پیار بھری نگاہ اس کے سندر چہرے پر ڈال کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

محسن دودن بعد واپس چلا گیا تھا اس کی ٹریننگ مکمل ہو گئی تھی محکمہ تعلیم کے ایک اعلیٰ افسر کی حیثیت سے اسے گھر اور دیگر سہولیات فراہم کر دی گئی تھیں تنخواہ بھی پرکشش تھی وہ بہت خوش تھا کہ اس کی محنت اللہ تعالیٰ نے رائیگاں نہیں جانے دی اب وہ مومو کو ایک آرام دہ پرآسائش زندگی

دینے کی اہلیت بھی رکھتا تھا سبھی اس کی اس شاندار جاب سے خوش تھے مومو کو محسن کے جانے کے بعد دھیرے دھیرے احساس ہوا کہ وہ کس خاموشی سے اس کے من کے اندر بکھل مارے بیٹھا ہے وہ جو اس کا بچپن کا جنم جنم کا ساتھ تھا ہمیشہ اس کی پروا کرتا تھا اسے سمجھاتا رہتا تھا اس کا خیال رکھتا تھا اس کے کام کرتا تھا کام آتا تھا اس کی ذرا سی تکلیف پر بے کل و بے قرار ہو جاتا تھا اسے ہر لمحہ خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا اس کے چہرے پر مسکان اور ہنسی بکھیرنے کے جتن کرتا تھا وہ تو اس کا پیار تھا اس کی محبت تھی اس کے محسن کی چاہت تھی سچی لگن تھی جو بالآخر مومو کو پھر سے اس کی راہ پر واپس لے آئی تھی اور خود مو مواف میرا خدایا۔

مومو جوں جوں سوچتی جا رہی تھی ادراک کے نئے در اس پروا ہوتے چلے جا رہے تھے دل نئے اور انوکھے انکشافات کر رہا تھا اب وہ سمجھی کہ محسن اسے بے خبر اور نادان کیوں کہتا تھا وہ اس سے محبت کرتی تھی اور اپنی اس محبت سے اب تک خود ہی بے خبر تھی اب بھی اگر محسن اپنی محبت کا برملا اقرار و انکشاف نہ کرتا تو اس کے دل پر سوچ و خیال پر بے خبری کے قفل پڑے رہتے۔

”شکر ہے کہ مجھے یہ احساس اکبر سے شادی کے بعد نہیں ہوا ورنہ میں کیسے جی پاتی محسن کے بغیر میں تو اپنی نا سمجھی پر خود ہی ساری زندگی ماتم کرتے گزار دیتی تھینک یو محسن تم واقعی بہت اچھے ہو اتنے برس کا ساتھ ہمارا محبت میں نہ ڈھلتا یہ بھلا کیسے ممکن تھا؟ میں نے بہت ستایا ہے نہ محسن تمہیں ہمیشہ تمہیں پریشان کیا ہے تم سے جھگڑا کیا ہے اور تو اور نا سمجھی میں بے خبری میں اکبر سے شادی کر کے تمہارا دل بھی دکھایا ہے تمہیں تڑپانے اور رلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی میں نے پلیز محسن مجھے معاف کر دو۔“ مومو نے محسن کے کمرے میں آ کر اس کی فریم شدہ تصویر ہاتھوں میں اٹھا کر دیکھتے ہوئے اسے دل سے مخاطب کر کے کہا۔

”محسن میں تم سے محبت کرتی تھی کرتی ہوں اور ہمیشہ کرتی رہوں گی اب مجھے سمجھ آ گئی ہے اب میں بے خبری میں نادانی میں تمہیں کوئی دکھ نہیں دوں گی۔ پلیز تم مجھے میری نادانیوں کی سزا مت دینا۔“

”سزا تو نہیں دوں گا ہاں البتہ تمہاری محبتوں کی جزا تمہیں ضرور دوں گا۔“ محسن کی دلکش اور مسروری آواز پر وہ بری طرح شپٹا گئی تصویر ایک دم سے بوکھلا کر میز پر رکھ دی تھی۔

”محسن تم..... تم کب آئے؟“

”ابھی جب تم مجھ سے میری تصویر سے اپنی محبت کا اقرار کر رہی تھیں۔“ وہ خوشی سے ہنستا مسکراتا پیار سے اسے دیکھتا ہوا مسرور لہجے میں بولا تو وہ شرمندہ سی نظریں چرا گئی۔

”تم اچانک کیسے آ گئے؟“

”میں تم سب کو اپنے ساتھ نیا گھر دکھانے کے ارادے سے آیا ہوں مگر اب لگتا ہے کہ ذرا اہتمام کے ساتھ ہی یہاں رخصت ہونا پڑ گا اب تو چچا چچی بھی یہی چاہ رہے ہیں۔“

”کیا چاہ رہے ہیں؟“ مومو نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔

”انہوں نے تمہارے لئے ایک خوب د اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکا دیکھ لیا ہے۔ مومو، مجھے میری زندگی لوٹا دو۔“

”مطلب۔“

”نادان لڑکی تم میری زندگی ہو مجھے میری مومو لوٹا دو کیونکہ مومو میری زندگی ہے اور میں اپنی مومو کے بغیر بے روح بے جان ہوا پھرتا ہوں مجھ میں پھر سے روح پھونک دو مومو۔“ محسن نے اس کے چہرے کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ تو مومو کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں گھر والے مجھ سے کہہ رہے تھے کہ مومو کی شادی کے بعد وہ لوگ میرے ساتھ میرے اس گھر میں چلیں گے دادی بھی راضی ہیں کہ شادی اسی گھر میں ہو جائے کیونکہ سب رشتے داروں کو اس گھر کا علم ہے نئے گھر میں تمہاری شادی کے بعد شفٹ ہو جائیں ہم سب۔ محسن نے اس کے سندھ چہرے پر ہوائیں اڑتی دیکھ کر مزید سسپنس پیدا کرتے ہوئے سنجیدگی سے بتایا۔

”میں اب کسی سے شادی نہیں کروں گی۔“

”لیکن میں تو اب شادی کے لئے تیار ہوں تم مت کرنا شادی میں اپنے گھر میں اپنی بیوی کو لے کر جاؤں گا۔“

”تو جاؤ تمہیں کس نے روکا ہے؟“ وہ یہ کہہ کر دروازے کی سمت بڑھ کر گئی تو وہ ہنس کر بولا۔

”جانتی ہو آج کیا دن ہے پانچ جنوری ہے میرا جنم دن ہے اس بار مبارک باد نہیں دوگی مجھے۔“

”سا لگرہ مبارک ہو۔“ مومو نے مڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہو کہا تو وہ مسکراتے ہوئے اس

کے قریب آ کر بولا۔

”ٹھینکس! تحفہ نہیں دو گی۔“

”تم کیا تحفہ لو گے؟“ چہرے پر قوس و قزح کے رنگ بکھرنے لگے۔

”محسن، تم، تم نے پہلے یہ سب کیوں نہیں کہا تھا؟“ مومو نے اپنا اس روز والا سوال پھر سے

دہرایا۔

”میرا یقین تھا کہ تم میری ہواور میری دہن، نوگی اسی گھر میں رہو گی میرے ساتھ تمہیں کوئی بھی مجھ سے چھین کر نہیں لے جائے گا تقدیر نے تمہیں اچانک ہی مجھ سے دور کر دیا اس کے باوجود تم میرے دل سے تو دور نہیں ہوئی تھیں میری چاہ میری لگن سچی تھی میری تڑپ اور بے قراری میں اتنی شدت اور طاقت تھی کہ تقدیر بھی تمہیں مجھے واپس لوٹانے پر مجبور ہو گئی میں نے سجدہ شکر ادا کیا تھا تمہارے لوٹ آنے پر حالانکہ مجھے تمہارے دکھ پر بہت رنج بھی تھا میں نے ہمیشہ تمہاری خوشیوں کی دعائیں مانگی تھیں اور اب بھی مانگتا ہوں۔“

”میری خوشیاں شاید تمہارے ساتھ لکھی تھیں۔“ مومو نے بھیکتے لہجے میں کہا تو محسن نے

اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

”شاید نہیں یقیناً۔“

”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔“ وہ مسکرا دی۔

”اچھا میں اور کیا کچھ ٹھیک کہتا ہوں۔“ وہ شوخ ہو گیا۔

”تم ہمیشہ بس ٹھیک ہی کہتے ہو۔“ وہ شرکیں لہجے میں بولی۔

”تو پھر لوٹا رہی ہونا مجھے میری زندگی۔“

”ہاں۔“ وہ شرمیلے پن سے ہنس پڑی اور محسن نے مسرور سا ہو کر ہنسنے ہوئے۔ اپنے کوٹ

کی جیب میں سے سونے کی بہت خوبصورت انگوٹھی نکال کر مومو کے ہاتھ کی نازک سی انگلی، میں پہنا، کراہی سالگرہ اپنے جنم دن کو مومو کے، اقرار اور پیار کے اس لمحے کے طفیل ہمیشہ کے لئے

یادگار بنا دیا۔

”ایسا کوئی زندگی میں آئے جو زندگی کو زندگی بنائے۔“ باہر آئینے کے سامنے کھڑا اپنے گیلے بالوں کو تولیے سے خشک کرتے ہوئے گنگنا رہا تھا کہ فرحان نے کمرے میں قدم رکھا اور طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے گانے لگا۔

ایسا کوئی زندگی میں آئے

جو اس گدھے کو آدمی بنائے

”جل لے تو جل جل کر توے کے جیسا رنگ کر لے گا اپنا میرے حسن پہ کوئی آج نہیں آنے والی۔“ باہر نے مسکراتے ہوئے بالوں میں برش پھیرتے ہوئے ادائے ناز سے کہا تو وہ بستر پر نیم دراز ہو کر سر کے نیچے بازو رکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

”اپنی تو قسمت ہی خراب ہے۔“

”کیوں کیا تو نمو کے ہاتھ کا پکا کھانا کھا کے آرہا ہے؟“

”نہیں اس کے اہامیاں کی ڈانٹ کھا کے آرہا ہوں۔“ فرحان نے جواب دیا۔

”ویسے ایک بات ہے نمو کے ہاتھ کا پکا کھانا کھاؤ یا اس کے ابا کی ڈانٹ دونوں کا ایک سا مزا ہے۔“ باہر نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں بتاؤں جا کے نمو کو کہ آپ کے منگیتر صاحب آپ کے ہاتھ کے پکے پکوان میں کیڑے نکال رہے ہیں۔“ فرحان نے اسے دھمکی دی۔

”ابے آہستہ بول اس نے سن لیا تا تو میری جان کو آ جائے گی۔“

”اب تو یہ ڈھول تجھے ساری زندگی بجانا ہے دوست اس سے تیری جان نہیں چھوٹنے والی“ فرحان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بس یار! پتہ نہیں میں نے کیا دیکھ کے اس رشتے کے لئے ہاں کر دی تھی۔“

”میں بتاؤں۔“

”بتا۔“

”نمو کے ہونٹ کے اوپر جوتل ہے نا وہ دیکھ کر ہاں کی تھی۔“ فرحان نے بیٹھتے ہوئے شوخ و شریلہج میں کہا تو باہر کشتن اٹھا کر اسے مارنے کو دوڑا۔

”کینے تو اسے اتنی گہری نظر سے دیکھتا ہے خبیث وہ تیری ہونے والی بھابھی ہے۔“

”تو میں کون سا اسے تیری بھابھی بتا رہا ہوں وہ بد مزہ کھانے پکانے والی پھوڑ حسینہ تجھے ہی مبارک ہو میرے لئے تو کوئی حور پری آئے گی دلہن بن کر دیکھ لینا۔“ فرحان نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”حور تو تجھے مرنے کے بعد جنت میں ملے گی بشرطیکہ تیرے اعمال اچھے ہوئے جس کی کوئی امید نہیں ہے اور پری کوہ قاف میں ہوگی ہاں جن کے لئے پری شاید آجائے۔“ باہر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”اچھا چھوڑ اس بحث کو یہ سوچ کر ایہ کہاں سے دینا ہے یہ مالک مکان تو ہمیں طعنے دے دے کر مار دے گا۔“ فرحان نے سنجیدگی سے کہا۔

”صرف طعنے دے کر نہیں اپنی لڑکی دے کر بھی۔“

”وہ تو تجھے دے گا نامیرا کیا بنے گا؟“ فرحان نے کہا۔

”کچھ سوچ کے ٹو۔“

”یہ سوچنے کا کام مجھ سے نہیں ہوتا اور وہ بھی خالی پیٹ پہلے کچھ کھلا مجھے۔“

”مار کھلاؤں تجھے۔“ فرحان نے اسے مارنے کے لئے مکہ بتایا۔

”نہیں بچپن میں بہت کھائی ہے ابھی تک ہضم نہیں ہو رہی۔“ باہر نے اس انداز سے کہا کہ فرحان کی ہنسی نکل گئی۔

”یہ سامنے والے گھر کے باہر آج گاڑیوں کی قطاریں کیوں لگی ہیں خیر تو ہے؟“

”ہاں وہ مرزا صاحب ہیں ناں ان کی بیٹی کی سالگرہ ہے آج۔“ باہر نے بتایا۔

”واہ یار! ان امیر لوگوں کے مزے ہیں ایسی تقریبات منعقد کر کے خوب مال جمع کر لیتے ہیں میری سالگرہ جنوری کو ہوتی ہے یکم جنوری کو۔“

”جیسی تو ہر طرف دھند چھائی رہتی ہے تیری زندگی میں۔“ باہر نے کہا۔

”تیری زندگی میں تو جیسے بڑا سکون اور ٹھنڈک کا احساس باقی ہے نا تو بھی جھلساتی جون میں پیدا ہوا تھا۔“ فرحان نے فوراً کہا۔

”میں اس بار اپنی سالگرہ مناؤں گا۔“ باہر نے خواہش ظاہر کی۔

”مالک مکان ہمارا سوئم اور چالیسواں منانے کے چکر میں ہے تو کرایے دینے کی فکر کی

ساگرہ بھی منالیں گے اگر اس مالک مکان کے عتاب سے زندہ بچ گئے تو۔“ فرحان نے سنجیدگی سے کہا۔

”تو کہاں سے تین ماہ کا کرایہ؟“ باہر نے بھی سنجیدہ ہو کر کہا۔

”اپنے ابا سے منگوالے۔“ مفت مشورہ آیا۔

”اوبھائی صاحب! میرے ابا نے مجھے گھر سے دھکے دے کر نکالا تھا روپے پیسے دے کر نہیں نکالا تھا جو میں مالک مکان کو دیدوں وہ تو شکر ہے کہ میں اسے اپنی بیٹی کے لئے شوہر شوہر سا دکھائی دیتا ہوں اسی لئے وہ لحاظ کر رہا ہے ورنہ اب تک ہمارا سامان اٹھوا کر گھر سے باہر پھینک چکا ہوتا۔“ باہر نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو وہ جھلا کر بولا۔

”اچھا بس اب بند کر یہ رام کہانی یہ سوچ کہ کرنا کیا ہے؟“

”آئیڈیا۔“ باہر نے چند سیکنڈ سوچنے کے بعد چیخ کر خوشی سے کہا۔

”کیا؟“

”ہم کسی بینک میں ڈاکہ ڈال لیتے ہیں لاکھوں کروڑوں روپے ہاتھ آ جائیں گے ہم اس رقم سے اپنا ذاتی مکان خرید لیں گے کیا ہے؟“

”بالکل بکواس ہے تیری طرح۔“ فرحان نے کہا۔

”اتنی جلدی تو یہی سوچا اور کیا جاسکتا ہے۔“ باہر نے کندھے اچکا کر کہا۔

”تو، تو کر لے حرام کھانے سے مرنا بہتر ہے۔“ فرحان نے تپ کر کہا۔

”جینا حرام ہو جائے تو حرام بھی حلال ہو جاتا ہے میرے دوست! بھول گیا تین تین دن ہم نے اس شہر میں فاتے کرتے گزارے ہیں اگر تجھے اخبار بیچنے کا کام نہ ملتا اور میں مفت میں نمونے کے ابا کے جنرل سٹور میں سلیز مین کی نوکری نہ کر رہا ہوتا تو ہمیں یہ سر چھپانے کا آسرا اور پیٹ کی آگ بجھانے کا ایندھن بھی میسر نہ آتا حق نہ ملے تو چھیننا پڑتا ہے کہاں کہاں دھکے نہیں کھائے ہم نے ملازمت کی تلاش میں تیرا کیا خیال ہے کہ جو بڑے بڑے بنگلوں اور قیمتی گاڑیوں میں رہتے ہیں ان کی یہ حق حلال کی کمائی ہے یا یہ سب حرام کا پیسہ ہے ہم چار دن کی زندگی میں سکتے تڑپتے اور ترستے ہی رہ جائیں اور دوسرے عیش و آرام میں زندگی بسر کریں کیوں یا کیا ہمارا حق نہیں ہے زندگی کی آسائشوں اور خوشیوں پر؟“ باہر نے غصے سے جذباتی پن سے حیرت اور احساس محرومی

سے پر لہجے میں کہا تو فرحان نے گہرا سانس لیوں سے خارج کیا۔

”میرے یار! خوشیاں اگر روپے پیسے اور دولت سے خریدی جاسکتیں تو دنیا کے تمام دولت مند خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہوتے مگر ایسا نہیں ہے تجھے شاید ہی کوئی دولت مند مطمئن اور مسرور نظر آئے گا ہر کسی کے ساتھ کوئی نہ کوئی پریشانی مسئلہ اور مصیبت لگی ہوئی ہے کچھ کو اور دولت کمانے کی ٹینشن ہے اور کسی کو موجودہ دولت کے چھین جانے کا خطرہ ہے ہم کم از کم اس ٹینشن سے تو آزاد ہیں ناں کہ ہمارے پاس کچھ ایسا ہی نہیں جس کے چھین جانے کا اندیشہ یا خوف لاحق ہو۔“ فرحان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر رسانیت سے اسے سمجھایا۔

”ان باتوں سے کتابوں اور اخلاقیات کا پیٹ تو بھرا جاسکتا ہے لیکن یہ پیٹ جو ہمارے جسموں کے ساتھ لگا ہے یہ نہیں بھر سکتا اسے بھرنے کے لئے روٹی چاہیے اور روٹی کے لئے پیسہ چاہیے اور پیسہ کمانے کے لئے کام روزگار چاہیے جو اس ملک میں ”امن“ کی طرح ناپید ہو رہا ہے تیرے پیسوں سے ہم دال روٹی تو کھا لیتے ہیں مگر کرایہ کہاں سے دیں؟“ بابر نے بے بسی سے سلگتے لہجے میں کہا۔

”اللہ مالک ہے یار کچھ نہ کچھ تو کر ہی لیں گے ہم۔“

”اللہ تو مالک ہے ہی اور وہ جو مالک مکان ہے وہ کیسے ٹلے گا؟“

”برا وقت اتنی آسانی سے نہیں ملتا اس کے لئے کچھ سبیل کرنا پڑتی ہے دوست۔“ فرحان

نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تو سبیل کر میں ذرا نمو کو کھن لگا کر کچھ کھانا نکلاؤ کے لاتا ہوں میرے پیٹ میں تو بھوک کے مارے چوہوں کا ہی نہیں ملی کتوں کا دنگل بھی شروع ہو چکا ہے۔ دعا کر اب کے مشن کامیاب ہو۔“ بابر نے مسکراتے ہوئے آہستگی سے کہا اور باہر نکل گیا اور فرحان کی آنکھیں اپنی مفلسی اور بے بسی پر دکھ سے بھیگ گئیں۔

”بار ٹھیک ہی تو کہتا ہے ہمیں اپنا پیٹ بھرنے کے لئے بھی کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں مہینے کے آخری دنوں میں تو میری معمولی سی تنخواہ بھی ختم ہو جاتی ہے کیا ملا باہر کو ایم ایس سی اور مجھے ایم بی اے کی ڈگری حاصل کر کے بے روزگاری انہوں کے طعنے تشنے در در کی ٹھوکریں فاتے اور اندیشے یہ بھی کوئی زندگی ہے۔“ فرحان نے بالوں میں دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھنساتے ہوئے

دکھ اور بے بسی سے کمرے میں ٹہلتے ہوئے سوچا اور اس کا ذہن کسی ایک نقطے پر آ کر رک سا گیا تھا وہ بے بسی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنی مٹھیاں اور ہونٹ بھیجنے لگا تھا۔

☆☆☆

وہ دونوں اپنے مزاج خیال اور سوچ سے ہٹ کر ایک الگ ہی راستے پر چل نکلے تھے اس لئے کہ شاید اُن کی گزر بسر کا کوئی سامان ہو سکے گا اس طرح اور یہ بھی کہ اگر کامیاب ہو گئے تو اپنا کوئی کاروبار شروع کر کے رقم واپس لوٹا دیں گے ان کی نیت میں کھوٹ نہیں تھا صرف مجبوری تھی جو انہیں رات کی تاریکی میں چوروں کی طرح شہر کے دولت مند شخص کے بنگلے کی آہنی دیوار پھلانگنے پر اکسا گئی تھی نجاب نے کیوں گیٹ پر کوئی پہرے دار موجود نہیں تھا اور موسم بھی ان کا ساتھ دے رہا تھا شاید ان کا بھرم رکھنے کے لئے بھڑکایا تھا یہ سیٹھ ٹارا احمد کا بنگلہ تھا متعدد فیکٹریوں اور ملوں کے مالک سیٹھ ٹارا احمد کا بنگلہ جن کی سخاوت بھی مشہور تھی وہ غربا کی مدد کیا کرتے تھے ان کے گھر میں ہر وقت لاکھوں روپیہ کیش کی صورت میں موجود رہتا تھا لیکن بابر اور فرحان اس شہر میں چونکہ نئے تھے اس لئے وہ اس حقیقت سے لاعلم تھے جو نبی انھوں نے بنگلے کے لان میں چھلانگ لگائی گیٹ کے پاس اندر موجود کتا زور زور سے بھونکنے لگا۔

”کے ٹو کتا بھونک رہا ہے۔“ بابر نے فرحان کو آہستگی سے بتایا جیسے وہ کہیں اور ہو وہ فرحان کے اونچے لمبے قد کی وجہ سے اسے کے ٹو کہا کرتا تھا اور فرحان اس کی پھرتیوں کی وجہ سے اسے ٹائیگر کہتا تھا اکثر۔

”ظاہر ہے وہ تو بھونکنے گا ہی آخر کتا ہے۔“

”اوتیری خیر لے لایمٹ بھی چلی گئی۔“ فرحان نے لان اور اس سے آگے طویل راہداریوں میں جلتی لایمٹ کے بجھنے پر جھلا کر کہا۔

”اچھا ہے نا اس طرح ہم کسی کو دکھائی نہیں دیں گے۔“ بابر بولا۔

”ہاں اور ہمیں بھی کچھ دکھائی نہیں دے گا۔“ فرحان چڑھ کر بولا۔

”موبائل کی لایمٹ آن کر۔“ بابر نے مشورہ دیا تو فرحان نے اپنی جیکٹ کی جیب میں سے موبائل نکال کر لایمٹ آن کر لی۔

وہ باآسانی دروازے کا تالا کھول کر اندر داخل ہو گئے تھے باہر موسم لمحہ بہ لمحہ بدل رہا تھا بادل

گرج رہے تھے بجلی کڑک رہی تھی ہوائیں چیخ رہی تھیں ایسے میں رات کا گھپ اندھیرا ماحول کو اور بھی خوفناک بنا رہا تھا۔

”یار اتنے بڑے گھر میں موت کا سناٹا چھایا ہوا ہے لگتا ہے یہاں کوئی نہیں ہے۔“ فرحان نے سرگوشی کی۔

”کیوں نہیں ہے ہم دونوں جو ہیں۔“

”اچھا تو اس حصے میں جا میں اس حصے میں دیکھتا ہوں یہ کیا لایمٹ آگئی۔“ فرحان نے اس سے کہا اسی وقت ان کے چہار جانب روشنی سی پھیل گئی تھی شاید بجلی آگئی تھی۔

”یار کے ٹو یہ تو جزیئر کی آواز ہے اس کا مطلب ہے کہ بنگلہ بالکل خالی نہیں ہے۔“ بابر نے گہرا کر کہا۔

”اچھا جو کہا ہے وہ کراس سے پہلے کہ کوئی آئے اور ہمیں دیکھ کر شور مچا دے ہمیں اپنا کام کر کے یہاں سے نکلنا چاہیے۔“ فرحان نے تیزی سے کہا اور دونوں اپنی اپنی طے شدہ سمتوں میں چلے گئے۔

فرحان نے ایک ایک کر کے سارے کمرے کھول کر دیکھنا چاہے مگر سب لاکڈ تھے لیکن ایک کمرے کا دروازہ اس کی ذرا سی کوشش سے خود بخود کھل گیا اور سامنے کا منظر دیکھ کر فرحان کی آنکھیں لمحے بھر کو تو ساکت رہ گئیں رات میں چاند سے چہرے والی لڑکی ویران آنکھیں سونی کلائیاں بن پھولوں کے الجھے بال ہونٹوں کی سرفی پہ گہری چپ کے تالے ڈالے جہازی سائز کے بیڈ پر بیٹھی تھی یوں جیسے سنائے کی دہشت میں تنہائی اور وہ بھی ادھوری چاروں جانب بکھری ہوئی تھی یہ سب دیکھ کر پہلے تو فرحان کا دل اک دم زور سے دھڑکا تھا اور پھر وہ اس مہتاب روکی گہرا ہٹ سے چونک کر اپنے دل کو سنبھالتا خود کو مضبوط کرتا اندر داخل ہو گیا وہ سندر کوئل سی لڑکی اپنی جگہ پر سمٹ کر رہ گئی۔

”کک..... کون ہو تم؟“

”چور۔“

”ہج..... چور۔“ وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

چیننا مت وہ سخت لہجے میں دانت پیس کر بولا اس لڑکی کی آنکھوں میں خوف چھلک رہا تھا۔

”تمہیں جو چیز پسند آئے اٹھا کر لے جاؤ۔“

”تو اجازت ہے۔“ وہ گہری نظروں سے اس بیس بائیس سالہ پری چہرہ لڑکی کو دیکھتے ہوئے معنی خیزی لہجے میں بولا۔

”کہانا لے جاؤ۔“ وہ لرزتی آواز میں بولی اس لمحے بادل بہت زور سے گر جاتا تھا باہر بارش بھی شروع ہو چکی تھی۔

”اوکے۔“ فرحان نے کہہ کر اس کی جانب بڑھا تھا۔

”یہ..... یہ تم کیا کر رہے ہو؟“ وہ ٹپٹا کر بولی۔

”تم نے خود ہی تو ابھی کہا ہے کہ جو چیز پسند آئے اٹھا کر لے جاؤ۔“

”تو۔“

”تو یہ کہ مجھے تم پسند آگئی ہو اٹھا کر لے جاؤں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”ہرگز نہیں دور رہو مجھ سے..... ہاتھ مت..... لگانا مجھے۔“ وہ صدمے اور خوف سے کانپتی آواز میں بولی۔

”خبردار جو میرے قریب آئے۔“ وہ چلا اٹھی۔

”تو قریب آنے کا اجازت نامہ دے دو۔“ فرحان نے شوخ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے شریر لہجے میں کہا وہ یہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ اس گھر میں ڈاکہ ڈالنے آیا تھا اور خود لٹ گیا تھا ایک نہتی لڑکی کی ایک نظر نے اسے لوٹ لیا تھا وہ کیا چوری کرتا اس کا تو اپنا دل چوری ہو گیا تھا۔

”سٹ اپ میں تم جیسے گھنٹیا آدمی کو اپنے قریب بھی آنے دوں گی کبھی نہیں۔“

”کیا کرو گی اگر میں یہ سارا فاصلہ سمیٹ کر تمہیں اپنے وجود میں سمیٹ لوں بولو۔“ وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس کی اس بات پر مشتعل ہو کر بولا تھا اور وہ سہم کر سمٹ کر بیڈ کی بیک سے لگ گئی تھی۔

”تم ایسا نہیں کر سکتے؟“ وہ لرزتی آواز میں بولی اس کی آنکھوں کی ویرانی میں اس لمحے خوف و دہشت کے سائے اتر آئے تھے۔

”کیوں؟ کیوں نہیں کر سکتا بقول تمہارے میں ایک گھنٹیا آدمی ہوں تو گھنٹیا آدمی تو کچھ بھی کر سکتا ہے بے بی تمہاری آن جان سب کچھ لے سکتا ہوں وہ غصیلے اور خطرناک لہجے میں بولا۔“

”نہیں پلیز۔“ وہ رونے کو ہو گئی۔

”تم نے مجھے اتنا گرا ہوا سمجھا ہے میں صرف چور ہوں اور چوری بھی پہلی بار کرنے نکلا ہوں کسی کی آن اور جان لینا میرا مزاج ہے نہ ہی طریقہ واردات ہے تم نے جس قسم کی بات کی ہے اس پر میں تمہاری آن اور جان دونوں لے سکتا ہوں۔“

”نہیں پلیز تمہیں اللہ رسول کا واسطہ ہے پلیز۔“ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے التجا کی تو اسے اس کی حالت پر بے بسی پر ترس آ گیا وہ بھلا کب اس مزاج کا مالک تھا مگر اس کی اس بات نے اس کی غیرت پر تازیانہ لگایا تھا جیسی وہ غصے میں آ گیا تھا۔

”چلو معاف کیا مگر یاد رکھو آئندہ کبھی کسی مرد کو ایسی بات کہہ کر اس کی غیرت کو مت للکارنا اسے چیلنج مت کرنا ورنہ اپنی آن اور جان سب گنوا بیٹھو گی۔“ فرحان نے دھیمے مگر سپاٹ لہجے میں کہا تو اس کی جان میں جان آئی اور وہ سراور نظر جھکا کر لب کاٹنے لگی۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ فرحان نے اس کے جھکے ہوئے حسین صبح چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”حوریہ۔“

”ہوں، پیارا ہے تمہاری طرح۔“ وہ داد بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا تو حوریہ نے ایک لمحے کو پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور پھر جھکا لیں تھیں۔

”تم چوری کیوں کرنے لگے ہو؟“ حوریہ نے ہمت کر پوچھا۔

”یونہی شوق میں ہابی کے طور پر۔“ وہ کندھے اچکا کر مسکرا کر بولا۔

”کوئی اچھی ہابی نہیں ملی تھی تمہیں؟“

”میں انفرادیت کا قائل ہوں ہر کام میں۔“

”کبھی کبھی اس قسم کی انفرادیت دوسروں کے لئے باعث اذیت بھی بن سکتی ہے اور آپ کے لئے کبھی نہ کبھی ذلت و ندامت کا باعث بھی۔“ حوریہ نے اس کی حسین صورت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”جانتا ہوں۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولا۔

”پھر بھی۔“

”دروازے تو لاک تھے تم اندر کیسے آ گئے؟“ حور یہ نے پوچھا۔

”ایک چور سے یہ پوچھنا کہ وہ گھر کے دروازے کیسے کھول کر اندر آ گیا خاصا حقائق سوال ہے، ہے نا۔“ فرحان نے مسکراتے ہوئے اس کی جھیل کنول سی آنکھوں میں دیکھ کر کہا تو وہ شرمندہ سی ہو گئی فرحان نے مسکراتے ہوئے اپنے موبائل پر بابر کو ایک طویل میسج SMS کیا اور حور یہ کو دیکھنے لگا، اسی پل موبائل پر بابر کی کال آ گئی اسے فرحان کی ساری بات مذاق جو لگی تھی۔

”ہاں ٹائیگر۔“

”یہ کیا بکواس لکھی ہے تو نے؟“ بابر مدہم آواز میں چیخا تھا۔

”جو لکھا ہے سچ ہے فوراً بندوبست کر میں سنجیدہ ہوں اور دیکھ دیر نہیں ہونی چاہیے فوراً جاؤ“

”اوکے۔“ بابر نے کہا اور فرحان نے موبائل آف کر دیا بابر بادل برس برس کر زمین کو جل

تھل کر رہے تھے۔

”کسے بلارہے ہو؟“

”باراتیوں کو۔“

”کیا“ وہ حیرت خوف اور صدمے سے چیخی ”گھبراؤ نہیں میں اتنا بے دین اور بے ہدایت

نہیں ہوں قانون اور شرع کو سمجھتا ہوں کوئی غیر اخلاقی یا غیر اسلامی رویہ نہیں اپناؤں گا تمہارے

ساتھ۔“ وہ یہ کہتا ہوا اٹھ کر اس کی وارڈ روپ کھول کر دیکھنے لگا۔

”یہ تمہاری وارڈ روپ ہے۔“ فرحان نے حور یہ کی طرف دیکھا۔

”جی۔“

”یہ سب کپڑے تمہارے ہیں۔“ بے لکا سوال تھا جواب میں وہ چڑ کر بولی۔

”جی نہیں آپ کے بھی ہیں۔“

”ہا ہا ہا۔“ وہ ہنس کر اس کے چپے ہوئے چہرے کو بغور دیکھنے کے بعد بولا۔

”ہاں ایسا ہو بھی سکتا ہے تمہاری وارڈ روپ میں میرے ملبوسات بھی موجود ہونے چاہئیں

اس کا بندوبست میں کرنے والا ہوں۔ تم یہ ڈریس پہن کر تیار ہو جاؤ۔“ فرحان نے اس کی وارڈ

روپ میں سے سب سے شاندار سرخ کا مڈار سوٹ نکال کر اس کی طرف آتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“ وہ نا سنجی کے عالم میں اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”کیونکہ اس گرجتی، برستی، کڑکتی اور بھیکتی رات میں تمہارے لئے عروسی جوڑے، یعنی برائیدل ڈریس کا بندوبست کرنا ممکن نہیں ہے مارکیٹ بھی بند ہے لویہ لباس پہن لو، تم تو اس میں بھی جھوکی قیامت لگو گی“ فرحان نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے ڈریس اس کے سامنے بیڈ پر رکھ دیا۔

”تم..... اونو تم۔“ وہ اس کی باتوں سے اس کے ارادوں کو سمجھ گئی تھی اور خوف کے مارے اس کے پورے بدن میں کپکپی دوڑ گئی تھی۔

”تم نہیں..... آپ ہوں۔“ فرحان نے شہادت کی انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کی۔

”آپ۔“ وہ صدمے سے خوف سے بولی۔

”تم کیا کر رہے ہو میرے ساتھ؟“

”نکاح میں تمہارے ساتھ نکاح کرنے والا ہوں۔“

”کیا؟“ وہ چلائی۔

”ہاں اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ یہ لباس پہن لو۔“

”میں نہیں پہنوں گی۔“ وہ رخ پھیر کے غصے سے بولی۔

”دیکھو آرام سے پہن لو ورنہ میں خود بھی پہنا سکتا ہوں۔“

”خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا تو۔“ وہ بد کی تھی۔

”ہاتھ لگانے کا ہی حق حاصل کرنا چاہتا ہوں اٹھو شاباش جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا کرو۔“

فرحان نے پستول کا رخ اس کی سمت کر کے سنجیدہ لہجے میں کہا تو وہ شرم سے آب آب ہوتی ناچار وہ لباس اٹھا کر کمرے سے ملحق واش روم میں چلی گئی، دس منٹ بعد وہ منہ ہاتھ دھو کر لباس تبدیل کر کے واپس بیڈ روم میں آئی تو فرحان موبائل پر کسی سے بات کر رہا تھا اس کی جانب نگاہ اٹھی تو پلٹنا ہی بھول گئی وہ حسن و معصومیت کا پیکر تھی سرخ لباس میں اس کی سفید رنگت دک رہی تھی بھرا بھر بدن شکر فی لیوں کی لرزش جھیل کنول آنکھوں میں آنسوؤں کی جل تھل متناسب قد کاٹھ اور سیاہ گھنے سلکی بالوں کی آبشاریں اس کے چاندنی بکھیرتے چہرے کو اور بھی جاذب نظر اور پرکشش بنا رہی تھیں۔

”اب میں بابر کو بتاؤں گا کہ مجھے مرنے سے پہلے ہی جنت کی حور مل گئی ہے حور یہ مل گئی ہے“

وہ مدھم آواز میں بولتا اس کے سامنے آ کر رک گیا۔

”زبردست میک اپ کی ضرورت تو نہیں ہے پھر بھی ہلکا سا میک اپ بھی کر لو۔“ وہ اس کے چہرے کو دالہانہ پن سے دیکھتے ہوئے بولا۔
 ”کس لئے؟“

”میرے لئے۔“ فرحان نے یوں کہا جیسے اس سے برسوں کی شناسائی ہو پیار کا خجوک ہو محبت کا چاہت کا رشتہ ہو حوریہ نے نظریں چرا کر قدم ڈرینگ ٹیبل کی جانب بڑھا دیئے ہلکا سا میک اپ کیا اور اپنے بیڈ پر آئیٹھی رات کے ڈھائی بج رہے تھے وہ بے چینی سے اپنے ہاتھوں کو آپس میں کبھی رگڑ رہی تھی کبھی سمجھ رہی تھی تنکے کے نیچے اس کا موبائل رکھا تھا جو آدھا تنکے سے باہر نظر آ رہا تھا اس نے کچھ سوچ کر موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ فرحان کی عتابی نظروں نے اس کی یہ حرکت دیکھ لی حوریہ گھبرا گئی اور وہ نفی میں سر ہلاتا اس کے پاس چلا آیا اور ہاتھ آگے کر دیا حوریہ نے بے بسی کے عالم میں موبائل اس کے ہاتھ پر رکھ دیا تو وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔
 ”تم کیوں مجھے مجبور کر رہی ہو کہ میں تمہیں ہاتھ لگاؤں؟“

”مم..... میں نے کیا کیا ہے؟“

”اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔“

”تو مر جاؤ جان چھوڑو میری۔“ حوریہ غصے اور بے بسی سے بھیکتی آواز میں بولی وہ ہنس کر

بولا۔

”تمہاری جان تو اب میں مر کر ہی چھوڑوں گا۔“

”برگد کے پیڑ کٹ جائیں۔ تو ان کی چھاؤں میں بیٹھنے والے برستی بارشوں میں بھی دھوپ میں آ جاتے ہیں ہمیشہ کے لئے۔“ حوریہ نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ تو فرحان نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں اتنا کمزور نہیں ہوں کہ تمہیں سایہ فراہم نہ کر سکوں۔“

”کمزور نہ ہوتے تو پستول ہاتھ میں لئے یوں چوروں کی طرح میرے گھر میں داخل نہ ہوتے۔“ حوریہ نے طنز سے مسکراتے ہوئے کہا فرحان شرمندہ سا ہو گیا۔

”اور چور تو یہاں پہلے ہی بہت ہیں تمہیں میرے سوا اور کیا کچھ چاہیے اس گھر سے“ حوریہ نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

”تمہارے سوا کچھ نہیں چاہیے کچھ بھی نہیں۔“ فرحان نے دل سے ایمانداری سے کہا تو وہ اس کی آنکھوں میں چھلکتی سچائی کی رنق کو پہچاننے اس پر یقین کرنے پر نیم رضامندی ہو گئی تھی مگر دل کو جو گھاؤ لگے تھے وہ اس کا یقین اعتبار تو پہلے ہی چھین کر لے گئے تھے۔

گھر کے ملازموں کو فرحان کے کہنے پر حوریہ نے انٹرکام پر ٹیل دے کر بلا لیا تھا رحمت بابا اور زینت بی بی اس کی پیدائش سے پہلے سے ”نارولا“ میں خدمت کر رہے تھے محمد بخش بھی بیس سال پرانے خادم تھے اس خاندان کے وہ اتنی رات گئے اس طرح سے حوریہ کو بلا دیا کہ پریشان ہو گئے تھے اور جب معاملے کی حقیقت اور نزاکت کا انہیں علم ہوا تو سبھی سہم کر رہ گئے فرحان نے ان سب سے علیحدگی میں جانے کی بات کہی تھی کہ وہ مطمئن ہو کر فرحان اور حوریہ کے نکاح میں بطور گواہ شریک ہونے پر رضامند ہو گئے تھے، باہر قرہی مسجد کے مولوی صاحب کو بڑی مشکل سے ساتھ لایا تھا چند منٹ بعد قبول و ایجاب کی رسم ادا ہو گئی تو حوریہ کو لگا جیسے وہ کسی امتحان گاہ میں داخل ہو گئی ہے اس کے ساتھ آنے والے وقت میں کیا ہو گا یہ وہ نہیں جانتی تھی وہ ایک چور کی بیوی بن چکی تھی اسے پہلے تو اپنی بے بسی پر بہت ہنسی آئی اور پھر یکا یک وہ پھوٹ پھوٹ کر ہلک ہلک کر رونے لگی اس نے کئی بار سوچا تھا نکاح نامے پر دستخط کرتے ہوئے پھر یہ سوچ کر کے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے اس نے بسم اللہ پڑھی اور اپنے جملہ حقوق ایک دستخط کے ذریعے فرحان علی کے نام کر دیئے فرحان بہت مسرور تھا ایک غلط قدم نے ایک صحیح کام کر دیا تھا گھر کے ملازم منہ میٹھا کرنے کرانے کے بعد اپنے سروٹ کو ارٹرز میں واپس چلے گئے تھے ڈرائنگ روم میں صرف باہر اور فرحان رہ گئے تھے۔

”واہ یا تو نے تو بڑا المباہاتھ مارا ہے سیٹھ کی اکلوتی بیٹی سے شادی رچا کے اس جائیداد کا اکلوتا وارث بن بیٹھا ہے بڑی چیز ہے تو۔“ باہر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بکواس نہ کر تو کیا مجھے جانتا نہیں ہے۔“ فرحان نے اسے ڈپٹ کر کہا۔

”جانتا تھا تو ایک دم سے کسی لڑکی پہ یوں عاشق ہو سکتا ہے یہ نہیں جانتا تھا تیری زندگی میں ان کاموں کے لئے کوئی وقت ہی نہیں تھا اہمیت ہی نہیں تھی لڑکی سے عشق بگھارنے کی۔“

”تو میں کب عشق بگھار رہا ہوں سیدھے طریقے سے شادی کی ہے میں نے اس سے ایک وجہ یہ ہے کہ وہ میرے دل کو چھو گئی تھی اور دوسری وجہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“ فرحان نے کہا

حور یہ اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی ان کی گفتگو سن رہی تھی۔

”کٹو یار یہ لڑکی تو ہماری پلاننگ میں شامل نہیں تھی۔“ باہر کو یہ ساری کارروائی ہضم نہیں ہو رہی تھی باوجود اس کے منع کرنے کے بولے چلا جا رہا تھا۔

”یہ اوپر والے کی پلاننگ میں شامل تھی۔“ فرحان نے کہا۔

”دولت لینے آئے تھے، عورت لے کر جائیں گے۔“

”عورت نہیں لڑکی۔“ فرحان نے تصحیح کرنا ضروری سمجھا۔

”ہاں کرنسی لینے آئے تھے لڑکی لے کر جائیں گے اب۔“

”اب نہیں صبح جائیں گے اب گھر گئے تو تیرے ہونے والے سرجی سوال کر کر کے تاک میں دم کر دیں گے اور ہی مطلب لیں گے کہ ہم اتنی رات کو جوان لڑکی کو کہاں سے اٹھا کر لائے ہیں؟“

”ہاں کہتا تو، تو ٹھیک ہے چل میں بھی کسی کمرے میں سو جاتا ہوں یہ چوری و دوری ہمارے بس کا کام نہیں ہے۔“

”ٹھیک کہتا ہے تو مگر شاید یہ سب ہونا قسمت میں لکھا تھا جیسی ہم اس طرح یہاں داخل ہوئے تھے اچھا سن وہ دائیں جانب جودو کمرے ہیں ان کی طرف جانا بھی مت یہ سامنے والے کمرے میں سو جاؤ انشا اللہ صبح ملاقات ہوگی او کے شب بخیر۔“

”شب بخیر یہ پھول لیتا جا بڑی مشکل سے لان سے توڑ کر گلستا بنایا ہے۔“ باہر نے سینٹر ٹیبل سر رکھا پانچ سرخ گلابوں کے گلدستے اور پلیٹ میں رکھی پھولوں کی پتیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور دونوں چیزیں اسے اٹھا کر دے دیں۔

”شکریہ یار، دوست ہو تو تیرے جیسا۔“

”اچھا چل زیادہ بنامت جا اپنی دلہنیا کے پاس صبح ملیں گے اور سن..... میسٹ آف لک۔“ باہر نے مسکراتے ہوئے کہا تو فرحان ”شکریہ“ کہتے ہوئے اس سے بغل گیر ہو گیا۔

☆☆☆

عجب قدرت کی مرضی تھی

بہت انمول ہیروں کو

مٹی میں سلا ڈالا

چٹکتی ہسکراتی کلی کو موسم گل میں

رُلا ڈالا

عجب قدرت کی مرضی تھی

اکیلی رہ گئی تھی ڈال پہ منہی کلی اب

جسے تھا چار سو کانٹوں نے گھیرا

نظر آتا نہ تھا اس کا سویرا

چمن آہوں میں اس کا گھر گیا تھا

کلی کا باغبان ہی تو گیا تھا

اچانک سارا گلشن سو گیا تھا

کلی کے ساتھ ہاتھ ہو گیا تھا

سیٹھ نثار اور بیگم سفینہ نثار دس دن پہلے ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو گئے تھے حوریہ نثار ان کی اکلوتی لاڈلی اور چیمپی بیٹی تھی۔ بہت ذہین حسین مگر بااخلاق ملنسار اور پر خلوص لڑکی تھی کروڑوں کی مالک تھی وارث تھی لیکن غرور رتی برابر بھی نہ تھا اس میں، بی ایس سی کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی وہ سیٹھ نثار احمد بزنس اور فلاحی کاموں دونوں میں مصروف و مقبول تھے انہوں نے اپنی زندگی میں ہی کچھ حصہ فلاحی ٹرسٹ کے نام کر کے باقی کی ساری جائیداد حوریہ کے نام کر دی تھی اور اس بات کا علم حوریہ کے تایا اور ماموں کو بھی علم تھا اور وہ دونوں حوریہ کو اپنی بہو بنانے کے خواہش مند تھے سیٹھ نثار اپنے عزیز رشتے داروں پر بھی دل کھول کر خرچ کرتے تھے ان کی مالی مدد بھی کرتے تھے۔ ان کی اچانک وفات کے بعد حوریہ کے ماموں اور تایا اپنی بیویوں کے ساتھ ”نارولا“ میں آ کر ٹھہر گئے تھے دونوں کوشش کر رہے تھے حوریہ نے ان کی نصیحتوں اور ارادوں کو بھانپ لیا تھا اتفاق سے ان کی باتیں بھی سن لی تھیں اور ان کی اصلیت اس پر عیاں ہو گئی تھی سیٹھ نثار احمد اور بیگم سفینہ نثار کے دسویں کے بعد وہ حوریہ سے اس کی شادی کی بات کرنے کا سوچ رہے تھے اور اتفاق سے دسویں کی رات فرحان وہاں چور بن کر آیا اور اس کا شوہر بن گیا تھا حوریہ نے اپنوں کی خود غرضیوں اور منافقانہ رویوں سے دلبرداشتہ ہو کر فرحان سے نکاح کرنا قبول

کر لیا تھا یہ سوچ کر کہ وہ کچھ برا کرے گا بھی تو اسے یہ غم تو نہیں ہوگا کہ وہ اس کا کزن ہے اس کا خون اور خاندان ہے اور اسے دھوکہ دے رہا ہے وہ اس وقت اپنے ان رشتے داروں کے رحم و کرم پر تھی فرحان جس وقت کمروں کی تلاشی کے لئے نکلا تھا اس وقت اسے دو کمروں میں افراد کی موجودگی کا احساس ہوا تھا وہ ٹھٹھک کر رک گیا تھا اور اندر سے آتی آوازوں پر کان لگا کر کھڑا ہوا گیا تھا۔

”ہمیں ابراہیم کو کامیاب نہیں ہونے دینا اگر سیٹھ نثار مرحوم کی اکلوتی بیٹی ابراہیم کی بہو بن گئی۔ تو ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا آخر وہ حوری بیٹی میری سگی بھانجی ہے اس ناطے اس کی ہر چیز پر میرا حق بنتا ہے ہمیں کسی بھی طرح اس کو اپنے تایا ابراہیم کی طرف سے بدظن کرنا ہوگا دیکھا تھا تم کیسے محبت اور شفقت جتا رہا تھا حوری سے۔“ یہ حوریہ کے ماموں غیاث الدین کی آواز تھی جو اس کمرے میں اپنی بیوی کے ساتھ مقیم تھے اور ان سے ہی مخاطب تھے۔

”ظاہر ہے سکے تایا ہیں وہ حوریہ کے اور وہ تو شروع سے ہی حوریہ سے محبت کا برتاؤ کرتے آ رہے ہیں۔“ زرقامی نے کہا تھا۔

”ابراہیم کی نظر تو شروع سے ہی نثار بھائی کی دولت و جائیداد پر تھی اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے ان کی بیوی میری اکلوتی بہن تھی ان کے ساتھ حادثے کا شکار ہو کر مر گئی وہ معصوم بچی تو یتیم و مسکین ہو گئی اب مجھے ہی اس کے سر پر ہاتھ رکھنا ہے۔“ غیاث الدین نے کہا تھا فرحان حیرت اور افسوس سے ان کی گفتگو سنتا آگے بڑھ گیا دو کمرے چھوڑ کے ایک اور کمرے کی جلّتی لائیٹ اور اندر سے آتی مدھم سی سرگوشیوں نے پھر سے اس کے قدم روک لئے۔

”میں بھی دیکھتا ہوں کہ غیاث کیسے میری بھتیجی کو اپنی بہو بناتا ہے؟ میں بیس سال سے اس دن کا انتظار کر رہا تھا کہ کب وہ دن آئے گا اور میں حوریہ کو خزانے کی کنجی کو اپنے بیٹے سے بیاہ کر اس کی ساری دولت اپنے قبضے میں کر لوں گا بھائی بھابھی مر گئے ہیں تو اب کوئی تیسرا میرے اس ارادے میں دیوار نہیں بن سکتا بنے گا تو میں اسے دھکا دے کر گرا دوں گا۔“ یہ ابراہیم کی آواز تھی۔

”اچھا اب آپ سو جائیں انشا اللہ ایسا ہی ہوگا حوریہ اور اس کی دولت کہیں نہیں جائے گی ہاں۔“ بیگم رخشدہ ابراہیم نے کہا تھا اور وہ دونوں میاں بیوی ہنس پڑے تھے فرحان الجھتا افسوس کرتا دبے پاؤں وہاں سے ہٹ گیا تھا اور اس جانب جانے والا مین دروازہ اس نے آہستگی بند کر کے

لاک کر دیا تھا تا کہ ان چاروں میں سے کوئی بھی اپنے کمروں سے باہر آئے تو دوسری جانب نہ آ سکے اور ان کے کام میں رکاوٹ نہ ڈال سکے وہ اب چوری کا مقصد بھول گیا تھا۔ اور اسے بے بس اور تنہا لڑکی کے متعلق تجسس ہو رہا تھا۔ کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟ اور کیا وہ اپنے ان سنگے رشتے داروں کی چال بازیوں سے واقف بھی ہے نہیں؟

”مجھے حوریہ نامی اس لڑکی کو ان لالچی لوگوں کے چنگل سے آزاد کرانا چاہیے ان کے فریب سے بچانا چاہیے۔“ فرحان کے دل نے کہا تو دماغ نے فوراً سوال کیا۔
”مگر کیسے؟ تم نے تو اسے ابھی تک دیکھا ہی نہیں ہے۔“

”وہ یقیناً یہیں اپنے بیڈروم میں ہوگی۔“ وہ خود سے بولا تھا۔

”تو کیا کرو گے تم؟ کیسے بچاؤ گے اسے؟“ دماغ نے پھر جرح کی۔

”پتا نہیں۔“ وہ ابھمن آ میز لہجے میں دھیرے سے بولا اور اسی کشمکش میں اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا تو سامنے ایک اداس غمزہ اور تنہا لڑکی اس کی آنکھوں کو خیرہ کرتی دل پر دستک دے گئی اور وہ حیرت زدہ سا چند لمحے کھڑا اسے دیکھتا ہی رہ گیا اور وہ سمجھ گیا کہ یہی وہ لڑکی ہے سیٹھ نثار کی اکلوتی بیٹی جو اب ماں باپ کے سائے سے محروم ہو کر جتنی جلتی دھوپ میں بے آسرا و بے امان کھڑی ہے رحم ہمدردی مدد سے ماورا ہو کر فرحان علی کا دل اس وقت صرف اور صرف اسے دل کے کہنے پر اپنی دھڑکنوں میں بسانے اور زندگی میں لانے کا طلبگار ہو رہا تھا اسے لمحہ لگا تھا فیصلہ کرنے میں اور اس نے حوریہ پر اس کے رشتے داروں کی حقیقت ظاہر کیے بنا بڑے طریقے سے اس سے نکاح کر لیا تھا وہ اپنے دل میں حوریہ کے لئے محبت اور خلوص کے جذبات محسوس کر رہا تھا اسے اندازہ تھا کہ جس انداز سے اور جن حالات میں اس نے حوریہ سے شادی کی ہے حوریہ اتنی آسانی سے اسے دل سے قبول نہیں کر پائے گی اور وہ اتنا خود غرض بھی نہیں تھا کہ زبردستی اسے اپنے سے تعلق جوڑنے پر مجبور کر دیتا وہ تو اسے بچانا چاہتا تھا اس لئے شادی کرنا ہی اس سارے مسئلے اور دل کے معاملے کا حل محسوس ہوا تھا اسے اور وہ حیران تھا کہ اتنی آسانی سے یہ سب کیسے ہوتا چلا گیا تھا شاید قدرت کی یہی حکمت تھی دونوں کی یہی قسمت تھی ان دونوں کو اس طرح ہی ملنا تھا وہ قسمت کے اس لکھے پر بہت مطمئن اور مسرور تھا۔

ہم دونوں کے ملن کی خاطر
رات میں جگنو ٹھہر گئے ہیں

فرحان نے حوریہ کے کمرے میں آ کر پھولوں کا گلدستہ اس کی گود میں رکھتے ہوئے یہ شعر پڑھا اور پلیٹ میں موجود پھولوں کی پیتاں اس پر نچھاور کر دیں حوریہ نے اپنی بھیگی بھیگی آنکھوں سے فرحان کی طرف دیکھا تو اس کا دل بے قرار ہو کر رُپ کر بڑے زور سے دھڑکا تھا اس کا دل چاہا کہ اس معصوم غمزہ لڑکی کو اپنے سینے میں چھپالے اور اس کے سارے آنسو اپنے دامن دل میں سمو لے۔

”شادی مبارک ہو۔“ فرحان نے خود کو سنبھالتے ہوئے مسکرا کر مبارک باد دی اور خالی پلیٹ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی اور خود کھنی کے بل اس کے سامنے نیم دراز ہو گیا اور اس کی حسین صورت کو دیکھتے ہوئے پستول ایک طرف رکھ کر بولا۔

”کتنی منفرد ہے نا ہماری شادی تو رونمائی بھی منفرد ہونی چاہیے ہے نا۔“ حوریہ نے اس کے وجہہ چہرے کو دیکھا۔ تو دل اتھل پھل ہونے لگا فرحان علی چھٹ دواغ کا خو برو کسرتی بدن والا سرخ و سفید رنگت اور دلکش نین نقش کا مالک ایک مضبوط مرد تھا وہ کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل ہو سکتا تھا مگر وہ چوری کے ارادے سے حوریہ کے گھر آیا تھا اس خیال نے اسے ایک دم سے متفرک کر دیا تھا۔

”دولہا تو ہمیشہ ہی دلہن کو رونمائی کا تحفہ دیتا ہے آج دلہن اپنے دولہا کو رونمائی کا تحفہ دے گی لاؤ دو مجھے میرا تحفہ۔“ فرحان نے اس کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا تو حوریہ نے پلک جھپکتے ہی اس کا پستول اٹھا لیا اور اس پر نشانہ باندھ لیا۔

”ارے یہ کیا؟“ فرحان مسکرایا۔

”آپ کی رونمائی کا تحفہ۔“ وہ لرزتی آواز میں بولی۔

”چلا نا آتا ہے۔“ وہ ہنسا۔

”چلا نا کون سا مشکل ہے آپ کو منفرد تحفہ چاہیے نا تو لیں۔“

”ایک منٹ اتنے قریب سے تو تم مجھے پیار دینا مار مت دنیا چلو اب چلاؤ گولی۔“ فرحان نے بیڈ سے اٹھ کر اپنی جیکٹ اتاری اور کرسی پر ڈال دی اور اس کے ساتھ ساتھ ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہو گیا حوریہ کو اس سے اس حرکت کی توقع نہیں تھی اس کا خیال تھا کہ وہ اس سے پستول چھین لے گا اس

کے ساتھ زبردستی کرے گا اسے ڈرائے دھمکائے گا وہ اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا تھا اس کے ہاتھوں گولی کھانے کے لئے بخوشی تیار کھڑا تھا۔

”ضرور پستول خالی ہے ورنہ یہ یوں اتنی دیدہ دلیری سے میرے سامنے نہ کھڑا ہوتا“ حوریہ نے دل میں کہا وہ اس کی نڈر اور بے خوف طبیعت سے خود ہی خوفزدہ ہو رہی تھی۔

”اگر پستول میں گولی موجود ہے تو وہ اپنی زندگی خطرے میں کیوں ڈال رہا ہے؟ شاید وہ تم پر اپنی محبت کی سچائی، خلوص کی گہرائی ثابت کرنا چاہتا ہے۔“ حوریہ کے دل نے جواز تراشا۔

”کم آن بے بی، گولی چلاؤ تیار کیا ساری رات اسی کام میں گزارنی ہے شاباش گولی چلاؤ“ فرحان نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بیڈ سے نیچے اتر آئی اس کے ہاتھ مارے خوف کے کانپ رہے تھے۔ پستول چلانا تو دور کی بات تھی اس نے تو کبھی پستول کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ فرحان کو ایک چور ایک مجرم سمجھ کر نجانے کن الجھنوں میں گھر کر گولی مارنے کو تیار ہو گئی تھی حالانکہ اسے اس کا نقصان ہی ہوتا تھا فائدہ نہیں ہوتا تھا۔

”میں ایسا کیوں کر رہی ہوں اگر میں نے فرحان پر گولی ہی چلائی تھی تو میں نے اس سے شادی کیوں کی؟ اگر اسے سچ مچ گولی لگ گئی اور کچھ ہو گیا تو میرا کیا بنے گا؟ ہزاروں سوال، طنزیہ نظریں شک، جگ ہنساؤ، ذلت اور جیل کی چار دیواری میرا مقدر بن جائے گی، پھر اس نے ابھی تک تو مجھ سے کوئی غیر اخلاقی سلوک نہیں کیا پھر ہو سکتا ہے یہی شخص میرا نجات دہندہ ہو ہو سکتا ہے اسے مجھ سے واقعی پیار ہو گیا ہو پہلی نظر کا پیار مگر میری دولت۔“

”حوریہ یار کیا سوچنے لگیں گولی چلاؤ میری جان۔“ فرحان کی محبت بھری آواز نے اسے اپنی سوچوں کے سمندر سے نکال باہر پھینکا اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے اور وہ خوف سے پہلی پڑ رہی تھی اس نے پوری قوت سے ٹریگر دبایا تو فرحان کی ہلکی سی چیخ کمرے میں گونجی تھی اور وہ نیچے کارپٹ پر جا گرا تھا پستول میں ساکسینر لگا ہوا تھا اس لئے گولی چلنے کی آواز نہیں آئی تھی فرحان کو نیچے گرتا خون میں ڈوبتا دیکھ کر حوریہ کے تو اوسان خطا ہو گئے پستول اس کے ہاتھوں سے پھسل کر نیچے جا گرا تھا۔

”اونو، یہ میں نے کیا کر دیا۔“ وہ چیخ مار کر بے اختیار فرحان کی طرف دوڑی تھی وہ اپنا زخمی بازو لئے کارپٹ پر گر کر اکراہ رہا تھا۔

”فا.....فر.....حان۔“ حوریہ نے لرزتی کانپتی آواز میں انک انک کر اس کا نام لیا تو اس نے اس کی پریشان صورت کو دیکھا۔

”ایمان سے بہت ہی غلط نشانہ ہے تمہارا گولی بھی اسی طرح میرے دل میں اتارتی جس طرح تم خود میرے دل میں اتر گئیں تھیں پل بھر میں۔“ وہ مسکراتے ہوئے دور ہٹتے ہوئے بولا۔

”آ.....آئی ایم سوری۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”اللہ نہ کرے۔“ حوریہ نے تڑپ کر بے ساختہ اس کے ہونٹوں پہ اپنا کول سا ہاتھ رکھ دیا تھا وہ اس کی بے قراری اور بے اختیار پر مسرور ہو گیا۔

”آپ نے مجھے روکا کیوں نہیں؟ میں سمجھی تھی کہ پستول میں گولی نہیں ہے اسی لئے آپ..... اچھا انھیں میں آپ کی بیڈنگ کر دیتی ہوں۔“ وہ روتے ہوئے اسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے بولی فرحان مسرور سا مسکراتا رہا اور بیڈ پر آ بیٹھا وہ دوڑ کر گئی اور نجانے کہاں سے فرسٹ ایڈ کس نکال لائی اور اس کا زخم صاف کر کے پٹی باندھنے لگی اور تو شکر تھا کہ گولی فرحان کے بائیں بازو کو چھو کر گزر گئی تھی زخم زیادہ گہرا بھی نہیں تھا حوریہ پٹی کرتی جا رہی تھی اور روتی جا رہی تھی اور فرحان اس پاگل لڑکی کی بے قراری اضطراب اور تڑپ دیکھ دیکھ کر حیران اور خوش ہو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے نکاح کے بولوں میں واقعی اتنی تاثیر رکھی ہے کہ دو انجان اور اجنبی انسان ایک دم سے اپنے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت توجہ اور خیال و احساس کے جذبات جگا دیتے ہیں حوریہ نے اسے اپنے پاپا کی شرٹ لا کر دی تھی۔

”رو کیوں رہی ہو؟ میں تم پر مقدمہ تھوڑی کروں گا لاؤ کاغذ قلم دو میں لکھ کر دے دیتا ہوں کہ تم سے انجانے میں گولی چل گئی تھی تمہارا کوئی قصور نہیں ہے لہذا تمہیں کچھ نہ کہا جائے۔“ وہ مذاق سے بولا تو وہ کہنے لگی۔

”میں اس لئے تو نہیں رو رہی۔“

”پھر کس لئے رو رہی ہو؟“

”آپ نے مجھے روکا کیوں نہیں پستول کیوں نہیں چھینا میرے ہاتھ سے سامنے سے ہٹ کیوں نہیں گئے؟“

”حوریہ جان بھلا تھفہ بھی کوئی ٹھکرایا جاتا ہے وہ بھی اپنی محبوب ترین ہستی کا تھفہ۔“ وہ اس کے آنسو اپنی ہتھیلیوں میں جذب کرتے ہوئے پیار سے بولا تو اس نے شرمندہ ہو کر کہا۔
”خدا نخواستہ گولی کہیں اور لگ جاتی تو۔“

”تو میں اپنی محبت کے سامنے سرخرو ہو جاتا تمہیں اعتبار تو آ جاتا کہ میں نے تم سے کسی لالچ میں یا غفل کے طور پر شادی نہیں کی ہے بلکہ اپنے دل کے کہنے پر تمہیں اپنا جیون ساتھی بنایا ہے تمہیں دیکھ کر دل یکدم ہی بڑے انوکھے انداز میں دھڑکا تھا یوں لگا تھا جیسے مجھے تمہاری ہی تلاش تھی مجھے تمہاری تلاش یہاں کھینچ لائی تھی حوریہ میری زندگی تمہارے ہاتھوں تو مجھے موت بھی قبول ہے میری جان۔“ وہ اس کے چہرے کو پیار سے دیکھتے ہوئے بولا تو چند لمحے تو وہ اسے حیرت سے دیکھتی رہی پھر بے اختیار اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

فرحان نے اس کے گرد اپنا بازو حائل کر لیا اور اس کے سر پر بوسہ دیا وہ اس کی پناہوں میں سٹ کر روتے روتے سو گئی تھی۔

رات چلی ہے جھوم کر
زلفوں کو تیری چوم کر
آ بھی جا، آ بھی جا

صبح ہو گئی تھی نئے دن کا سورج نکل آیا تھا روشنی ہر سو پھیل تھی حوریہ جو فرحان کے سینے پر سر رکھے رکھے سو گئی تھی کھڑکی سے چھن کر آتی کرنیں اپنے چہرے پر محسوس کر کے بیدار ہو گئی اس نے خود کو ایک مرد کی پناہوں میں دیکھا تو حیرت سے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور پھر اسے رات کا ایک ایک پل یاد آ گیا۔

”فر..... حان..... فرحان۔“ وہ بے اختیار پکار اٹھی۔

”جی میری جان۔“ فرحان نے آنکھیں کھول دیں۔

”اتنی جلدی صبح ہو گئی ہے دن نکل آیا ہے۔“ حوریہ نے کہا تو وہ بھی معنی خیز لہجے میں شرارت

سمو کر بولا۔

”تمہیں جلدی لگی ہے میری جان پر بنی ہوئی تھی۔“

”کیا آپ کے بازو میں بہت درد ہو رہا تھا؟“ وہ یہی سمجھی تھی مصیبت سے سوال کیا تو وہ

مسکرا دیا۔

”نہیں میری جان، تم میرے اتنے قریب تھیں پھر بھلا درد میرے قریب کیسے آ سکتا تھا۔“ وہ محبت سے بولا تو وہ حیا سے سرخ ہو گئی۔

”اس ایک رات میں کتنا کچھ ہو گیا نا۔“

”ہاں، چلو اٹھو فریش ہو جاؤ پھر تمہارے تایا اور ماموں وغیرہ سے بھی تو ملنا ہے نا۔“

”آپ کو ان کا کیسے پتہ؟“

”مجھے سب پتہ ہے تم پریشان مت ہو جلدی سے تیار ہو جاؤ پھر مجھے بھی تیار ہونا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تو وہ اثبات میں سر ہلاتی اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔

نئے سورج کی کرنوں نے

غموں کے در پہ دستک دی

اور

چپکے سے کہا آنسو پونچھو اور مسکاؤ

نئے جیون کا لطف اٹھاؤ

پیالمن کے نغمے لگاؤ

دکھ کی باتیں اب بھول جاؤ

خوشبوؤں کو تم پاس بلاؤ

پیاری لڑکی!

خوش ہو جاؤ اور مسکاؤ

حور یہ اپنے بالوں میں برش کر رہی تھی اس کے لمبے بالوں کو فرحان بہت دلچسپی سے دیکھ رہا تھا آئینے میں حور یہ کو فرحان کا عکس دکھائی دیا تو اس کے برش کرتے ہاتھ کی حرکت رک گئی اس نے نظریں جھکا لیں فرحان مسکرا دیا اور اس کے قریب آ کر اس کے شانوں کو تھام لیا۔

”حور یہ! آئی لو یو۔“ فرحان نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے دل سے کہا تو وہ شیشا کر اس کے چہرے سے نگاہ ہٹاتے ہوئے بولی۔

”آپ کا بازو درد تو نہیں کر رہا آپ ڈرائیور کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلے جائیے گا وہ آپ

کا چیک اپ کر کے درست بینڈ تاج کر دے گا۔“

”میری ڈاکٹر تو تم ہولنڈ اینڈ تاج بھی تم ہی کرو گی۔“

”پلیزی یہ مذاق کی بات نہیں ہے ڈاکٹر سے چیک اپ کرانا بے حد ضروری ہے۔“ حوریہ نے اس کی محبت سے گھبرا کر کہا۔

”اوکے لیکن میں ڈرائیور کے ساتھ نہیں جاؤں گا تم میرے ساتھ جاؤ گی تو ہی جاؤں گا بولو جاؤ گی نا۔“ فرحان نے اس کے چہرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑے مان سے پوچھا تو ناچار اسے اثبات میں سر ہلانا پڑا۔

”تھینکس، چلو ناشتے کی میز پر تمہارے رشتے داروں سے ملاقات ہو جائے۔“

”مگر آپ..... وہ لوگ۔“

”ڈونٹ وری جان مجھے معلوم ہے کہ مجھے کیا کہنا ہے اور کیا کرنا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تو وہ گھبرائی گھبرائی اس کے کمرے سے باہر نکل آئی صبح کے سوانو بج رہے تھے وہ دونوں ڈائننگ ہال میں پہنچے تو حوریہ کے ماموں، مامی، تایا تاٹی فرحان کو اس کے ساتھ آتا دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے وہ کبھی فرحان اور حوریہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے اور کبھی ایک دوسرے کو نہ سمجھنے میں آنے والی نگاہوں سے گھر کے ملازم اور باہر البتہ خوشی سے مسکرا رہے تھے۔

”السلام وعلیکم!“ فرحان نے ان سب کو بالخصوص حوریہ کے رشتے داروں کو بخور دیکھتے ہوئے سلام کیا۔

”و..... علیکم السلام!“

”پلیز تشریف رکھیے نا، آپ لوگ کھڑے کیوں ہو گئے۔“ فرحان نے مسکراتے ہوئے بہت مہذب لہجے میں کہا تو وہ چاروں اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

”حوریہ! آپ بھی بیٹھیے۔“ فرحان نے حوریہ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا تو وہ آگے آ کر بیٹھ گئی فرحان اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے تایا جان، ماموں جان، آپ شروع کیجئے نا۔“ فرحان نے ابرار احمد اور غیاث الدین کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ، وہ اس کے اس انداز مخاطب پر حیران رہ گئے۔

”ہاں..... آں..... مگر آپ کون ہیں؟“ ابرار احمد نے سوال کیا۔

”یہ اپنی حوریہ بی بی کے شوہر ہیں جی۔“ زینت بی بی نے خوشی سے بتایا۔
 ”کیا؟“ ان سب کی سماعتوں پر تو جیسے آتش فشاں پھٹ پڑا تھا، ایک ساتھ چلائے۔
 ”جی ہاں صاحب! پچھلے مہینے جب صاحب اور بیگم صاحب لوگ بی بی کو لے کر لندن گئے تھے تو وہیں بی بی کا نکاح ان کے ساتھ ہوا تھا یہ اب صاحب لوگ کی موت کی خبر سن کر رات ہی یہاں پہنچے ہیں۔“ رحمت بابا نے منصوبہ بندی کے مطابق اپنی بات ان چاروں تک پہنچائی تو وہ ہکا بکارہ گئے۔

”جی ہاں اور اب میں یہیں رہوں گا کیونکہ حوریہ کو میری بہت ضرورت ہے آپ سب کا بے حد شکریہ کے آپ نے دکھ اور غم کی اس گھڑی میں میری حوریہ کا ہر طرح سے خیال رکھا اسے اپنوں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی، اسے اپنی اولاد کی طرح سمجھا اور اپنا گھریا کام کاروبار چھوڑ کر اتنے دنوں سے آپ حوریہ کی دلجوئی کی خاطر یہاں حوریہ اب اکیلی نہیں ہوگی آپ چاروں جب چاہیں اپنے اپنے گھروں کو واپس جاسکتے ہیں ظاہر ہے آپ کے گھر کو بھی تو آپ کی ضرورت ہے ارے ہاں اس ساری بات میں آپ کو میں اپنا نام تو بتاتا ہی بھول گیا میرا نام فرحان ہے فرحان علی اور یہ میری بیوی ہے حوریہ فرحان۔“ فرحان نے بڑی عمدگی اور سمجھداری سے ان پر اپنے اور حوریہ کے رشتے کی نوعیت اور حقیقت ظاہر کر دی تھی اور انہیں یہاں سے جانے کا کہہ کر گویا انہیں یہ باور کرا دیا تھا کہ اب اس گھر کی کسی چیز اور دولت و جائیداد پر ان کا کسی قسم کا کوئی حق نہیں ہے حوریہ اور فرحان ہی سیٹھ ٹار کی ساری دولت و جائیداد کے مالک وارث اور حقدار ہیں۔

”کمال ہے بھائی صاحب نے ہم سے تو حوریہ کے نکاح کا ذکر تک نہیں کیا۔“ مامی رخشندہ بولیں۔

”مامی، دراصل پاپا آپ سب کو سر پرانز دینا چاہتے تھے۔“ حوریہ نے بھی فرحان کی سمجھداری میں اپنا حصہ ڈالتے ہوئے کہا۔

”واقعی تمہارا نکاح بھائی صاحب نے کرایا تھا یا تمہارا ہی اس لڑکے کے ساتھ کوئی چکر تھا۔“ مامی نے طنز سے کہا۔

”شٹ اپ۔“ فرحان غصے سے بولا۔

”میں اپنی بیوی کے متعلق ایسی گھٹی بات سننا پسند نہیں کروں گا۔“

”تم کون ہو تمہارا خاندان کیسا ہے یہ ہم ضرور جاننا چاہیں گے؟“ ابراہیم نے سپاٹ لہجے میں کہا ان کی تو امیدوں پر پانی پھر گیا تھا۔

”آپ سب کے لئے یہی جاننا کافی ہے کہ میں حوریہ کا شوہر ہوں اور اب اس خاندان کا حصہ ہوں حوریہ اب میری زندگی ہی نہیں میری ذمہ داری بھی ہے آپ لوگوں کو اب حوریہ کے لئے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے میں ہوں ناں۔“ فرحان نے سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں کہا اور ناشتہ کرنے لگا حوریہ بھی خاموشی سے چائے کے سیپ لے رہی تھی۔

”حوریہ تم خوش ہو اس شادی سے رخشندہ تائی نے پوچھا۔“

”جی۔“ وہ حیرانی سے انہیں دیکھنے لگی۔

”یہ جی“ حیرت کی ہے کہ اقرار کی؟“ دوبارہ سوال کیا گیا۔

”ارے بھابھی، آپ اس سے کیا پوچھتی ہیں رات ہی تو اس کا دولہا غم کی اس گھڑی میں اس کے پاس آیا ہے یہ تو جب حوریہ، فرحان میاں کے ساتھ کچھ دن مہینے رہے گی تب ہی پتا چلے گا نہ کہ یہ کیسا ہے۔ اور یہ اس کے ساتھ شادی کر کے خوش ہے کہ نہیں۔“ زرقامی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا حوریہ اور فرحان نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

”نثار نے یہ اچھا نہیں کیا گھر کے رشتے چھوڑ کر باہر اکلوتی بیٹی کو بیاہ دیا اور غضب خدا کا کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہونے دی، مگر کے ملازموں کو علم تھا اور ہماری یہ اوقات بھی نثار کی نظر میں کہ ہمیں اس نے بتانا تک پسند نہ کیا۔“ ابراہیم نے تاسف غصے اور بے بسی سے کہا۔

”ارے چھوڑیں بھائی صاحب! اب مرے ہوئے کی کیا برائی کرنی مرے ہوؤں سے شکوے گلے کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا ہے آپ ناشتہ کریں۔“ ماموں غیاث الدین نے سنجیدگی سے کہا۔

”میری تو بھوک ہی مر گئی ہے۔“ ابراہیم بولے۔

”حالانکہ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ آپ کی اکلوتی بیٹی کا گھر بس چکا ہے اس کا شوہر اس کے پاس موجود ہے۔“ فرحان نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ”ہونہہ“ کہہ کر کرسی کھسکا کر کھڑے ہو گئے۔

”رحمت بابا، یہ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں تو گیٹ روم کو اچھی طرح سے

صفائی کروا کر لاک کر دیجئے گا۔“ فرحان نے جان بوجھ کر رحمت بابا سے یہ بات کہی۔ تاکہ وہ چاروں شرمندہ ہو کر وہاں سے جانے میں ہی عافیت سمجھیں۔

”اظہور خشنده بیگم ناشتہ ہم اپنے گھر جا کر کر لیں گے۔ فوراً اپنا سامان سیٹھا اور چلو گھر، بھائی بھابھو ج کیا مرے ہمارا تو اس گھر سے دانہ پانی ہی اٹھ گیا ہے۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ بھائی کے بعد ہمارے ساتھ اس گھر میں غیروں کا سا سلوک ہو گا یہ لڑکا حوریہ کی جائیداد پر قابض ہونا چاہتا ہے“ ابراہیم بولتے چلے گئے رخنہ تائی بھی ان کے ساتھ ہی چلی گئیں غیاث الدین اور زرقا ماما کو بھی وہاں بیٹھنا مناسب نہیں لگا سو وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

”آپ بھی جا رہے ہیں ناشتہ تو کرتے جاتے ماموں جان۔“ فرحان نے انہیں دیکھ کر معصومیت سے کہا۔

”شکریہ ہم گھر جا کر ناشتہ کر لیں گے۔“ وہ غصے سے بولے۔

”جیسے آپ کی مرضی اللہ حافظ۔“ فرحان نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ دانت پیستے ہوئے وہاں سے چلے گئے، فرحان نے گھر کے ملازموں کو دیکھا جو ان چاروں کے وہاں سے چلے جانے پر خوشی سے مسکرا رہے تھے، حوریہ البتہ خاموش اور سپاٹ چہرہ لئے بیٹھی تھی۔

”آپ کو ان کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ حوریہ نے کمرے میں آتے ہی فرحان سے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”ان کو بھی آپ کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ فرحان بولا۔

”کچھ بھی سہی وہ میرے ماما پاپا کے بھائی ہیں۔ یہاں رہنے اور رکنے کا حق ہے انہیں۔“ فرحان کو دیکھتے ہوئے وہ قدرے تیز لہجے میں بولی تو فرحان نے کہا۔

”رہنے اور رکنے کا یا لونٹے اور کھانے کا۔“

”وہ لوگ برسوں سے اس گھر میں آ جا رہے ہیں اور آپ ایک ہی رات میں یہاں کے سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے ہیں، رات سے پہلے نہ میں آپ کو جانتی تھی اور نہ ہی آپ مجھے جانتے تھے آپ تو چوری کرنے آئے تھے مالک بن کر بیٹھ گئے ہیں میں آپ کا اعتبار کیسے کر لوں؟“ وہ نجانے کیوں اس بحث میں پڑ رہی تھی جبکہ اس کا دل فرحان کے پیار پر نیک نیتی پر اعتبار کر چکا تھا وہ تو اس کی زندگی کی سیاہ راتوں کا چاند بن کر طلوع ہوا تھا۔

”اگر مجھ پر اعتبار نہیں تھا تو ان سب کے سامنے میرا اصل چہرہ بے نقاب کیوں نہیں کیا تم نے؟“ اور رہی بات سیاہ و سفید کا مالک بننے کی تو حوریہ ڈیر، آپ کے والد کے تمام پر اپنی اور بینک بیلنس آپ کے نام ہیں اس پر آپ کا حق ہے آپ ہی اس کی اصل وارث اور حقدار ہیں میں نے تو اس میں سے ایک روپیہ بھی نہیں لیا اور نہ ہی مجھے بیوی کی دولت پر عیش کرنے کا شوق ہے آپ کی دولت آپ کو مبارک ہو، آپ کے یہ سکے رشتے دار صرف دولت کی خاطر آپ کو اپنی بہو بنانا چاہتے تھے، ان کے ارادے کامیاب نہیں ہو سکے کیونکہ اب میں آپ کا شوہر ہوں، سو وہ اس دولت کے لالچ میں کوئی اور حربہ بھی استعمال کر سکتے ہیں آپ کو ان سے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے آپ کو میرا اعتبار ابھی تک نہیں آیا، چلیں کوئی بات نہیں آجائے گا اعتبار بھی اور یقین کریں آپ کے اعتبار اور اجازت کے بغیر میں اس رشتے کا حق بھی استعمال نہیں کروں گا، میں رشتوں میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں، آپ سے فوراً شادی کر لینا صرف اس لئے ضروری نہیں تھا کہ میں آپ سے پیار کرنے لگا تھا بلکہ آپ کو آپ کے لالچی رشتے داروں سے بچانے کے لئے میں نے فوراً آپ سے شادی کرنا ہی ضروری سمجھا، آپ کو بنا کسی رشتے کے نہ تو میں اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاسکتا تھا اور نہ ہی آپ کی ان حالات میں مدد کر سکتا تھا میں چور نہیں ہوں حوریہ ڈیر یہ پہلی واردات تو شاید قسمت میں لکھی تھی کیونکہ تم میری قسمت میں لکھی تھیں چلتا ہوں۔“

”ڈاکٹر کے پاس۔“ حوریہ کی زبان سے بے ساختہ جملہ پھسلا تھا اور وہ اپنی اس بے اختیاری پر شرمندہ بھی ہو گئی تھی اس کی باتوں کی حقیقت نے حوریہ کو اپنے کہے پر ہی نادم کر دیا تھا۔

”نہیں اپنے کرایے کے اس چھوٹے سے گھر میں جہاں میں اور ٹائیگر اکٹھے رہتے ہیں فرحان نے اس کی بے اختیاری میں چھپی اس کے احساس کو محسوس کرتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔“

”پہلے آپ کو ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے۔“

”نہیں یہ زخم مجھے عزیز ہے۔“ فرحان نے اپنے بازو پر بندھی پٹی کو دیکھ کر کہا۔

”کیونکہ یہ مجھے میری عزیز ترین ہستی نے دیا ہے اور آپ کے عزیز اور پیارے اگر آپ کو کچھ دیں تو اسے سنبھال کر رکھنا چاہیے خواہ وہ زخم ہی کیوں نہ ہو۔“ یہ کہہ کر وہ دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

”فرحان!“ اس نے اس بے قراری سے پکارا تھا کہ فرحان کے دل پر قیامت گزر گئی۔
 ”جی میری جان۔“ اس نے پلٹ کر اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پیار سے کہا۔
 ”آپ میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلیں۔“ وہ نظریں چرا کر بولی۔
 ”ایک چور کا علاج کراؤ گی۔“

”چور کا نہیں شوہر کا اور پلیز مجھے شرمندہ نہ کریں آپ میرے ساتھ۔“ وہ تیزی سے کہتی ہوئی اس کے قریب سے گزر کر دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

”کیا تھی وہ کبھی اجنبی سی کبھی اپنی سی۔“ فرحان نے حیرت سے مسکراتے ہوئے سوچا اور اس کے پیچھے ہولیا، ڈاکٹر نے فرحان کا چیک اپ کرنے کے بعد اس کی مرہم پٹی کر دی اور دوا کا نسخہ بھی لکھ دیا، حور یہ اس سارے عمل کے دوران بے چینی سے فرحان کو دیکھتی رہی تھی، ڈاکٹر سے اس کے زخم کی نوعیت کے متعلق پوچھتی رہی تھی ڈاکٹر کے مطابق پریشانی والی کوئی بات نہیں تھی چند روز میں زخم بھر جانا تھا احتیاطاً دوا لکھ دی تھی تاکہ درد ہونے کی صورت میں استعمال ہو سکے اور زخم جلدی مندمل ہو جائے کلینک سے واپسی پر حور یہ نے ڈرائیور کو دوا والا نسخہ دے کر میڈیکل سٹور سے دوائیں منگوائیں اور فرحان کو دیتے ہوئے بولی۔

”یہ دوائیں ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق استعمال کیجئے گا۔“ وہ کتنا خوش ہو رہا تھا اس کی اتنی توجہ اور پروا پر لیکن اس نے یہ بات کہہ کر اس کی خوش فہمی دور کر دی تھی۔

”میرا خیال تھا کہ آپ مجھے خود یہ میڈیسن استعمال کروائیں گی۔“ فرحان نے زخمی سی مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجا کر کہا تو وہ شپٹا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

”اس کا مطلب ہے کہ حور یہ مجھے یہ زخم لگانے پر جس شرمندگی اور احساس جرم کا شکار ہے جو تکلیف مجھے پہنچا چکی ہے یہ پروا یہ توجہ محض اس غلطی کی تلافی کرنے کی کوشش ہے اور میں اس پل بدلتی لڑکی کی ذرا سی توجہ کو اس کی محبت سمجھ بیٹھا تھا ہاں بھلا ایک کروڑ پتی لڑکی ایک لکھ پتی کو جو مجبوراً اس کا پتی بن بیٹھا ہے اس سے محبت کیسے کر سکتی ہے؟“

”اس احساس مندانہ احسان کا بہت شکریہ مجھے یہیں ڈراپ کر دیں میں خود ہی اپنے گھر چلا جاؤں گا۔“ وہ تھک کر دکھی لہجے میں بولا تو حور یہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”مجھے اپنے گھر نہیں لے جائیں گے۔“

”وہ میرا گھر نہیں ہے کرائے کا گھر ہے اور آپ اس گھر میں اس وقت قدم رکھ سکتی ہیں جب آپ کو میرے خلوص اور پیار پر اعتبار آ جائے اللہ حافظ۔“

”آپ۔“

”ڈرائیور گاڑی روکو۔“ حوریہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی فرحان نے ڈرائیور سے کہا تو اس نے فوراً گاڑی روک دی اور فرحان تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا دروازہ بند کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھ گیا حوریہ نے دیکھا دواؤں کا لفافہ وہ وہیں سیٹ پر چھوڑ گیا تھا نجانے کیوں حوریہ کا دل ڈوبنے لگا اس کی آنکھیں آپ ہی آپ بھینکنے لگیں اس نے ڈرائیور کو گھر چلنے کا کہا۔ اور گھر پہنچ کر باہر کو دواؤں کا لفافہ دے کر ڈرائیور کے ساتھ ان کے گھر بھیج دیا۔ تاکہ ڈرائیور ان کے ٹھکانے سے واقف ہو جائے اور اسے فرحان تک پہنچنے میں مشکل پیش نہ آئے۔

”بڑا اکی ہے یار تو اتنی اچھی لڑکی تیری بیوی بنی ہے۔“ باہر نے گھر آ کر فرحان سے ملتے ہی کہا تو وہ تلخی سے بولا۔

”ہاں اس اتنی اچھی لڑکی نے ہی یہ زخم دیا ہے گولی چلائی تھی اس نے مجھ پر مگر اس کے اپنے ہاتھ کا نپ رہے تھے نشانہ خطا ہو گیا اگر صحیح جگہ پر لگ جاتا تو تو اس وقت میرے جنازے کو کندھا دے رہا ہوتا۔“

”بکواس نہ کر جو منہ میں آ رہا ہے بکے چلا جا رہا ہے۔“ باہر نے بے قرار لہجے میں اسے ڈپٹے ہوئے کہا۔

”یار وہ جس صورتحال سے دوچار ہوئی تھی اور ہم جس انداز سے اس کے گھر میں داخل ہوئے تھے اس کا یہ رد عمل نہایت فطری تھا اب دیکھ اس نے مجھے ساری حقیقت سے آگاہ کرنے کے بعد یہ دوائیں دے کر بھیجا ہے۔ اور تیرا خیال رکھنے کی تاکید بھی کی ہے۔“ باہر نے دواؤں کا لفافہ میز پر رکھ دیا۔

”کیا ہے یہ لڑکی؟ میری تو سمجھ سے باہر ہے۔“

محبت اس کی

ایسی جیسے

روپ لٹاتا

چاند ہو

میلوں دور

”یہ تم دونوں رات بھر کہاں آوارہ گردی کر کے آئے ہو؟“ مالک مکان شیخ ریاض صاحب ان دونوں کے سر پہ کھڑے پوچھ رہے تھے۔

”ایک تو یہ برے وقت کی طرح بے وقت نازل ہو جاتے ہیں۔“ فرحان بڑبڑایا۔

”شیخ صاحب! رات بھر جو طوفانی بارش ہوئی ہے بھلا اس میں کوئی شریف بدمعاش آوارہ گردی کرنے کی جرأت کر سکتا تھا ہم تو جہاں گئے تھے وہیں اس بارش کے سبب رک گئے تھے۔“
بابر نے جواب دیا۔

”کہاں گئے تھے تم؟“

”یہ بتانا ضروری ہے کیا؟“ بابر نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ تم اپنی ہونے والی سسرال میں کھڑے ہو۔“

”میں فرحان کے سسرال گیا تھا اس کے ساتھ راستے میں چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا وہ تو حوریہ بھابھی نے اس کی مرہم پٹی کرائی اور اسے رات گھر نہیں آنے دیا میں اس کے بغیر کیسے آ سکتا تھا میں بھی وہیں رک گیا اس کے ساتھ۔“ بابر نے سنجیدگی سے مناسب لفظوں میں کچھ حقیقت کچھ فسانہ انہیں سنا ڈالا شیخ ریاض نے فرحان کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”تم نے پہلے تو کبھی اپنی سسرال کا ذکر نہیں کیا تھا۔“

”پہلے سسرال تھی ہی کب رات ہی تو بنی ہے۔“ بابر کی زبان پھسلی فرحان نے اسے کڑی نظروں سے گھورا تھا۔

”کیا کہا؟“ شیخ ریاض نے بابر کو دیکھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ مسکرایا۔

”کہیں تمہاری سسرال حوالات تو نہیں تھی۔“ شیخ ریاض نے اندازہ لگایا اور مشکوک نظروں

سے فرحان کو دیکھا وہ غصے سے تپ گیا۔

”لاحول ولا قوۃ“ باہر نے بے ساختہ کہا وہ ٹپٹا گئے۔

”شیخ صاحب! میں بے روزگار ہوں مفلس ہوں اور غلطی سے ایک کرایے دار کی حیثیت سے آپ کے در پر آ پڑا ہوں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ میری ذات اور کردار کو میری عزت نفس کو مجروح کریں اور میرے کردار کو مشکوک بنادیں کرایے دار کی بھی عزت ہوتی ہے اگر آج اللہ نے مجھے کرایے دار بنایا ہے تو وہی اللہ کل مجھے مالک مکان بھی بنائے گا انشاء اللہ! آپ کو مکان کا کرایہ مل جائے گا برائے مہربانی آئندہ اس قسم کی قیاس آرائی اور اظہار خیال سے پرہیز کیجئے گا آپ میرے بڑے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اس قسم کا رویہ مجھے آپ کی شان میں گستاخی کرنے پر مجبور کر دے۔“

”چل بس کر کے ٹو۔“ باہر نے اسے اپنے گلے سے لگا کر تسلی دیتے ہوئے کہا شیخ ریاض اپنی بات پر شرمندہ سے نظر آ رہے تھے۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں آج کل جن حالات میں ہم لوگ رہ رہے ہیں اس کا تقاضا ہے کہ ہر کرایے دار پر کڑی نظر رکھی جائے تم سمجھ رہے ہونا میں کیا کہہ رہا ہوں؟“ شیخ ریاض نے کھسیانا ہو کر کہا۔

”جی خوب سمجھ رہے ہیں اور کچھ۔“ باہر نے فرحان کو بیڈ پر بیٹھاتے ہوئے کہا۔

”تم ابھی جس گاڑی میں یہاں آئے تھے وہ کس کی تھی؟“

”فرحان کے سسرال کی۔“

”تو یہ پیدل کیوں آیا؟“

”یہ عقل سے پیدل ہے نا اس لئے۔“ باہر نے شوخ لہجے میں کہا۔

”ٹائیگر۔“ فرحان نے اس کے بازو پر مکہ رسید کر دیا۔

”اوئی، دراصل فرحان کی سسرال کروڑ پتی ہے اور یہ ان کا احسان نہیں لینا چاہتا تھا جیہی

پیدل مارچ کو ترجیح دی۔“

”بھئی جب بیٹی لے لی تو احسان کیسا؟“ شیخ ریاض نے فرحان کی سسرال سے مرعوب

ہوتے ہوئے کہا۔

”درست کہا آپ نے مگر فرحان کا فلسفہ اس معاملے میں ذرا سا مختلف ہے آپ چلیں

میرے ساتھ میں آپ کو سمجھاتا ہوں“ باہر نے سنجیدگی سے کہا اور فرحان کو آنکھ ماری اور شیخ ریاض کو شانوں سے پکڑ کر کمرے سے باہر لے گیا، فرحان نے گہرا سانس لیوں سے خارج کیا اور دوا کے لفافے میں سے کپسول نکال کر پانی کے ساتھ نگل لیا اور سونے کے لئے اپنے بستر پر لیٹ گیا مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی اس کی آنکھوں میں حوریہ کی صورت آسمانی تھی اور اس کے بازو میں یکا یک ہی درد نے سراٹھایا تھا وہ بے بسی سے تڑپ کر رہ گیا اسے پیار ہوا بھی تھا تو یوں اچانک ایک کروڑ پتی لڑکی سے اور اسے لگ رہا تھا کہ وہ لڑکی وہ حوروں جیسی لڑکی نکاح کے بندھن میں بندھنے کے باوجود اس سے میلوں کے فاصلے پر ہے اور نجانے یہ فاصلے کبھی مٹ بھی پائیں گے یا وہ یونہی اس کی محبت میں تڑپتا سکتا ہے قرار ہوتا رہے گا غربت اور امارت کا فرق ایک بار پھر محبت کے آنچ آکھڑا ہوا تھا۔

”میرا تو حوریہ سے نکاح ہو چکا ہے اس کے والدین حیات نہیں رہے رشتے کو کیسے ختم کرا سکتے جب تک کہ حوریہ خود نہ چاہے اور اگر حوریہ نے مجھ سے نہیں نہیں میں اسے کبھی اس بندھن سے آزاد نہیں کروں گا یہ شہر ہی چھوڑ جاؤں گا لیکن کیا ہو گا میرے شہر چھوڑ جانے سے؟ پہلے ماں باپ نے اپنے گھر سے نکالا اور اب میں اپنی محبت کی وجہ سے اس شہر سے چلا جاؤں نہیں اب میں کہیں نہیں جاؤں گا حوریہ کو میری محبت پر یقین کرنا ہو گا میں اسے کبھی نہیں چھوڑوں گا اسے مجھے دل سے اپنانا ہو گا اپنا شوہر سمجھنا ہو گا۔“ فرحان دل میں اپنے آپ سے بحث میں الجھا ہوا تھا اس کا سر درد سے پھٹنے لگا تھا وہ بے بسی سے تنکے پر سر کو دائیں بائیں حرکت دے رہا تھا پھر بھی سکون نہیں پار رہا تھا بے بسی سی بے بسی تھی۔

نہ تجھ کو چھوڑ سکتے ہیں

تیرے ہو بھی نہیں سکتے

یہ کیسی بے بسی ہے آج

ہم رو بھی نہیں سکتے

یہ کیسا درد ہے پل پل ہمیں تڑپائے رکھتا ہے

تمہاری یاد آئی ہے تو پھر سو بھی نہیں سکتے

چھپا سکتے ہیں اور نہ ہم دکھا سکتے ہیں لوگوں کو

کچھ ایسے داغ ہیں دل پر جو ہم دھو بھی نہیں سکتے
 کہا تھا چھوڑ دیں گے یہ نگر
 پھر رک گئے لیکن
 تمہیں پا بھی نہیں سکتے
 تمہیں کھو بھی نہیں سکتے

نجانے تھکن بے بسی، درد اور تکلیف کی شدت نے کب اسے نڈھال کر دیا اور وہ نیند کی
 وادی میں جا پہنچا۔

☆☆☆

”حوریہ! یہ میں نے کیا سنا ہے تمہارا نکاح ہو چکا ہے۔“ حوریہ کے ماموں غیاث کا بیٹا نعیم
 اس کے سامنے بیٹھا بے چینی سے بولا تو اس نے اطمینان سے جواب دیا۔
 ”ہاں تم نے ٹھیک سنا ہے۔“
 ”آئی ڈونٹ بلیواٹ۔“ وہ اٹھ کر ٹہلے ہوئے بے بسی سے بولا۔
 ”کہو تو نکاح نامہ دکھاؤں۔“

”نہیں، لیکن حوریہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔“

”میرے اللہ کی مرضی اور پسند ہی میری پسند ہے تقدیر نے فرحان کو میرا شریک حیات چن
 رکھا تھا سو وہ مجھے مل گئے تم میرا خیال اپنے دل سے نکال دو اور کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر لو،“
 حوریہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”حوریہ! تم سے تو میرا مستقبل وابستہ تھا۔“

”مجھ سے یا میری کروڑوں کی جائیداد سے۔“ حوریہ نے تلخی سے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ
 ہٹا گیا۔

”یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟“

”ہار سنگھار کیے بنا زیور میک اپ کے لوازمات کے بغیر تو کوئی دلہن کو بھی دلہن نہیں کہتا اور نہ
 قبول کرتا ہے کیا تم مجھے اسی طرح قبول کر سکتے ہو؟“ حوریہ نے سنجیدہ لہجے میں سوال کیا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ اگر میں اپنی ساری دولت کسی ٹرسٹ کو ڈونیٹ کر دوں فرحان سے خلع لے لوں تو کیا تم مجھے میری دولت کے بغیر صرف اور صرف میری ذاتی حیثیت میں قبول کر لو گے؟“

”تم یقیناً مذاق کر رہی ہو۔“ وہ ہنسا۔

”گو کیا تم قبول نہیں کرو گے ہے نا۔“ حور یہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے یقین سے کہا تھا وہ شپٹا گیا اور بات بناتے ہوئے گویا ہوا۔

”یہ بات نہیں ہے تم تو اتنی حسین ہو کہ تمہیں کسی میک اپ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے لیکن تم کو پھوپھا پھوپھو نے بہت ناز و نعم سے پالا ہے۔ تمہاری ہر ضرورت اور خوشی کا ہمیشہ خیال رکھا ہے ایک پر آسائش زندگی دی ہے۔ انہوں نے تمہیں پھر بھلا تم یہ سب کچھ ڈونیٹ کر کے اس پر آسائش زندگی سے محروم ہو کر کیسے رہ سکو گی؟“

”کیوں کیا تم میں اتنی صلاحیت اور ہمت نہیں ہے کہ تم اپنی بیوی کو یہ تمام سہولیات اور آسائشیں مہیا کر سکو؟“ حور یہ نے اس کی اصلیت ظاہر ہوتے دیکھ کر تاسف سے مسکراتے ہوئے پوچھا تو وہ کہنے لگا۔

”ہے مگر مجھے اس مقام تک پہنچنے میں برسوں لگ جائیں گے اور ہو سکتا ہے قسمت میرا ساتھ نہ دے اور مجھے یہ سب کچھ حاصل نہ ہو سکے۔“

”ہاں یہ آخری بات درست ہے قسمت نے تمہارا ساتھ نہیں دیا اور اب تم یہ سب حاصل نہیں کر سکتے اب تو تمہیں اپنے زور بازو پر ہی بھروسہ کرنا پڑے گا اور یہ سب کمانا پڑے گا۔“ حور یہ نے معنی خیز بات کہی تو وہ جانے کے لئے پرتو لے گا۔

”ہاں اوکے میں چلتا ہوں، کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے ضرور بتانا۔“

”مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو میں اپنے شوہر فرحان کو بتاؤں گی تمہیں نہیں، اپنی ماؤ اس غم کی گھڑی میں میرا خیال رکھنے کا بہت بہت شکریہ ہم کزن ہیں ملتے رہیں گے اوکے ٹیک کثیر۔“

”یو ٹو بائے۔“ نعیم نے مرے مرے انداز میں کہا۔ اور حور یہ نے ”اللہ حافظ“ کہہ کر اسے

دروازے کا راستہ دکھایا، وہ ناکام و نامراد لوٹ گیا تھا، حور یہ کو ان سب کی نیتوں کا اندازہ ہو گیا تھا مگر وہ انہیں مستقل طور پر نہ تو چھوڑ سکتی تھی اور نہ ہی ان سے بگاڑ سکتی تھی فرحان پر بھی کبھی اس کا دل یقین کرنے لگتا تھا تو کبھی دماغ شک کے چالے بننے لگتا تھا وہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھی اور

فرحان کو چاہتے ہوئے بھی اچھی طرح آزما کر ہمیشہ کے لئے اس کی پناہوں میں جانا چاہتی تھی اسے اس کی باتوں پر اعتبار تو آ گیا تھا کہ وہ مجبوراً پہلی بار ایڈونچر کے طور پر چوری کرنے نکلے تھے مگر انہوں نے اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی یا بد اخلاقی نہیں کی تھی اور فرحان نے تو اس کی نظروں میں اپنا اعتبار قائم کرنے کی خاطر اس کے ہاتھوں موت کے منہ جانا بھی قبول کر لیا تھا اگر خدا نخواستہ کوئی اس کی جان لے لیتی تو پھر بھلا حوریہ کی دولت اس کے کس کام آ سکتی تھی یہی بات حوریہ کو فرحان پر اس کے پیار پر اعتبار کرنے پر اکسار ہی تھی وہ ہاں ناں یقین و بے یقینی انکار و اقرار کے بل صراط پر کھڑی تھی وہ اس اذیت سے نکلنا چاہتی تھی رات کا پچھلا پہر تھا حوریہ کو بے چینی اور خوف نے گھیر رکھا تھا اسے اس وقت ایک مضبوط سہارے اور پناہ گاہ کی ضرورت بہت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

”فرحان!“ اس کی زبان پر بے اختیار ہی فرحان کا نام آ گیا تھا دل کی دھڑکنیں بہت تیزی سے دھڑکنے لگیں۔

”فرحان..... فرحان۔“ حوریہ کئی بار اس کے نام کو اپنے لہجے میں زبان سے ادا کیا تو اسے دلی سکون محسوس ہوا۔

”وہی تو ہیں میرا سہارا میری پناہ گاہ زندگی کی سیاہ راتوں کے چاند میرے وہی تو ہیں۔“ فرحان علی ہی اب میرا سب کچھ ہیں۔“ حوریہ نے مسکراتے ہوئے خود سے اعتراف کیا۔ یکا یک اسے محسوس ہوا کہ اس کے کمرے میں دھوئیں کی بو پھیل رہی ہے۔ پہلے تو وہ اپنا دھم سمجھ کر ٹال گئی پھر جب دروازے کی درزوں اور کھڑکیوں کے پاس سے دھواں نکلنے دیکھا اور آگ جلنے کی مخصوص آواز نے اس کی سماعتوں کو بیدار کیا تو وہ چیخ مار کر بستر سے نیچے اتر آئی اس نے دروازہ کھولنا چاہا۔ مگر دروازہ باہر سے لاک تھا۔

”فرحان..... فرحان۔“ وہ زور زور سے چیختی گئی۔

”رحمت بابا، دینو بابا، یا اللہ میری مدد فرما، ماما، پاپا..... پاپا۔“ وہ روتے ہوئے چیخ چیخ کر سب کو پکار رہی تھی، ایک دم اسے لگا کہ دروازے کے باہر کافی شور ہو رہا ہے اس نے سننے کی کوشش کی اسے فرحان کی آواز سنائی دی وہ کسی کو مار رہا تھا برا بھلا کہہ رہا تھا پھر دروازے اور کھڑکیوں پر پانی پھینکا گیا آگ بجھ گئی تھی شاید کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا تھا فرحان

پریشان نظروں سے اسے ڈھونڈتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تھا۔

”حوریہ!“ وہ بے قراری سے پکارا اٹھا ساتھ ہی حوریہ کی دبی دبی چیخ سنائی دی تو دائیں جانب گھوم گیا وہ خوف سے بری طرح کانپ رہی تھی اس کے دیکھنے پر دوڑ کر اس کی پناہوں میں آسمائی اور بلک بلک کر رونے لگی۔

”خدا غارت کرے اسرار تجھے ارے تو نے اس معصوم بچی کو جان سے مارنے کی کوشش کی اسے آگ میں جلانا چاہا جسے اس کے ماں باپ نے پھولوں کی طرح پالا تھا شہزادیوں کی طرح جس کے ناز اٹھائے تھے ارے دولت کے لالچ میں اندھے ہو گئے ہو تم تائے، مامے اور ان کی ناہنجار اولاد، پر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے؟“ زینت بی بی کی آواز حوریہ کے کانوں میں پڑ رہی تھی اور وہ اپنے خون کے رشتوں کی خود غرضی اور بے حسی پر اور بھی تڑپ تڑپ کر رونے لگی، اسے ماما پاپا یاد آرہے تھے، فرحان اسے دھیرے دھیرے تھپک رہا تھا، اس کی تو اپنی روح کانپ گئی تھی یہ دیکھ کر کہ اس کی محبت اس کی بیوی حوریہ کے کمرے کو آگ لگا دی گئی ہے اگر حوریہ کو اس آگ کی تپش بھی پہنچ گئی تو بس اس سے آگے فرحان سے سوچا نہ گیا وہ تو اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر حوریہ کو دیکھنے آیا تھا بہت خاموشی سے اس کے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ ایک نقاب پوش کو حوریہ کے کمرے کے دروازے کو آگ لگاتے دیکھ کر ٹھٹھک گیا اس نے ریسیکوس کو موبائل سے فون کر دیا اور اس شخص کے وہاں سے باہر نکلنے سے پہلے ہی اسے قابو کر لیا اور دور لے جا کر اس کی خوب دھنائی کی گھر کے ملازم آوازن کروہاں آگئے اور مجرم کے چہرے سے نقاب ہٹنے پر سبھی انگشت بدنداں رہ گئے وہ حوریہ کے سکے تایا ابراہیم کا بیٹا اسرار احمد تھا جس کی شادی وہ حوریہ سے کر کے ثار احمد کی جائیداد کے مالک بننا چاہتے تھے اسرار نے حوریہ کو جلا کر مارنے کا منصوبہ بنایا تھا کہ اس قتل کا الزام وہ فرحان پر عائد کر کے فرحان کو پھانسی کے تختے پر پہنچا دیں اور عدالت میں ثابت کر دیں کہ وہ ایک غیر خاندان کا انجان شخص ہے جس نے دولت کے لالچ میں حوریہ سے شادی کی اور پھر اسے مار کر اس کی ساری دولت کا تنہا وارث بننے کا منصوبہ بنایا تھا اس ساری کارروائی کے بعد فرحان اس کے راستے سے ہٹ جاتا اور وہ سیٹھ ثار احمد کے بھائی بھتیجے ہونے کی حیثیت سے ان کی ساری جائیداد کے وارث اور حقدار ٹھہرتے اس حقیقت نے جہاں فرحان کو اذیت سے دوچار کیا تھا وہاں حوریہ کا خون خشک کر دیا تھا وہ مارے ڈر خوف کے فرحان کے سینے

میں جھپتی جا رہی تھی روتی بلکتی جا رہی تھی۔

”بس حوریہ میری جان! ہمت سے کام لو مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے انشا اللہ تمہارا بال بھی بیکا نہیں ہونے دوں گا میں حوصلہ کرو بے بی میں ہوں ناں ہوں چپ ہو جاؤ بس۔“ وہ نرمی سے اس کے سر کو سہلاتے ہوئے بولا۔

”ماما، پاپا نے تو کبھی مجھے رونے بھی نہیں دیا تھا وہ کیا گئے آنسو میرا مقدر ہو گئے ہیں انہوں نے تو کبھی مجھے ہلکی سی خراش بھی نہیں آنے دی اور یہ لوگ ان کے گئے بھائی اور ان کی اولادیں مجھے زندہ جلانے چلے تھے۔“ وہ ہچکیاں لے لے کر روتے ہوئے بولی۔

”میں نے ان کی نیت کا فتور بھانپ لیا تھا اسی لئے انہیں یہاں سے بڑے طریقے سے چلتا کیا تھا مگر آپ ہی کو میرے اس عمل پر غصہ تھا اب تو آپ پر ان کی حقیقت عیاں ہو گئی نا۔“ وہ نرمی سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔

”بہت اچھی طرح۔“

”تو اب آپ کھنٹا رہنا ہو گا میں سکیورٹی گارڈ رکھوا دیتا ہوں بے چارے چوکیدار کو تو چوروں کے یہاں آنے کا پتہ نہیں چلتا تو بھلا وہ محبت اور رشتے داری کے پردے میں چھپے ان موت کے علمبرداروں کو کیسے پہچان اور روک سکتا ہے آپ زینت بی بی کو اپنے پاس سلا لیا کریں اسرار کی گرفتاری کے بعد امید تو ہے کہ اب آپ کے ماموں اور دیگر رشتے دار اس قسم کی کوئی حرکت کرنے سے باز رہیں گے پھر بھی احتیاطاً سکیورٹی گارڈ کا بندوبست کیے دیتا ہوں فی الحال تو پولیس کے گارڈ گیٹ پر تعینات ہو جائیں گے آپ سونے کی کوشش کریں میں اب چلتا ہوں۔“ وہ اسے بیڈ پر ریلیکس انداز میں بٹھاتے ہوئے بولا وہ مسلسل رور رہی تھی۔

”پلیز مت جائیں مجھے ڈر لگے گا۔“ وہ روتے ہوئے بے اختیار بولی۔

”اعتبار تو آپ کو مجھ پر بھی نہیں ہے۔“ فرحان نے اس کے آنسوؤں سے بھیگتے چہرے کو بے قراری سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ نے میری زندگی بچائی ہے اگر آپ نہ ہوتے تو آج نجمانے میرے.....“ وہ اس سے آگے کچھ نہ بول سکی اور بھی شدت سے رونے لگی اور اس سے آگے تو فرحان بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا اس خیال سے ہی اس کی روح کا نپ اٹھی تھی کہ اگر آج وہ یہاں نہ آتا تو شاید وہ حوریہ کو

ہمیشہ کے لئے کھودیتا۔

”حوریہ! بس جو ہوا اسے بھولنے کی کوشش کریں۔ جب تک اللہ نہ چاہے کوئی آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا اور اللہ آپ کے ساتھ ہے اللہ کا کرم اس کی رحمت آپ کے سر پہ سایہ فگن ہے اور میں بھی تو ہوں اب آپ کا محافظ آپ کو میرے ہوتے ہوئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے انشا اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا آپ سونے کی کوشش کریں۔“ فرحان نے بے اختیار آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لگالیا اور پر غم لہجے میں نرمی سے کہا۔

”آ..... آپ جائیں گے تو نہیں ناں۔“

”نہیں میں ادھر ہی ہوں آپ کے پاس شاہاش سو جائیں۔“ وہ دھیرے دھیرے اسے تھپکتے ہوئے بولا وہ اس کے سینے سے لگی اپنے ماما پاپا کے بیڈروم میں ان کے بیڈ پر بیٹھی بیٹھی روتی بلکتی ہچکیاں لیتی آخر تھک کر سو ہی گئی تھی فرحان نے اس کے چہرے کو دیکھا جس پر معصومیت اور افسردگی رقم تھی اس کا دل چاہا کہ وہ اس چہرے پر اپنے پیار کے پھول کھلا دے مگر وہ اس کی مجبوری کا فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا سو اپنی دلی خواہش پر عمل کرنے سے باز رہا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ گہری نیند سو گئی ہے تو اس نے بہت احتیاط اور آہستگی سے اسے بیڈ پر لٹایا اور اس پر کمر کھول کر اچھی طرح سے پھیلا دیا اور خود اس کے چہرے کو چند لمحے پیار بھری نظروں سے دیکھنے کے بعد دروازے کی جانب مڑ گیا۔

”مت جاؤ، رک جاؤ سیاہ راتوں کے چاند میرے، مجھے چھوڑ کے مت جاؤ پلیز۔“ حوریہ کی نیند اچانک ہی ٹوٹ ہی گئی تھی اور اس نے فرحان کو جاتا دیکھ کر دل میں بے قراری سے مخاطب کر کے کہا تھا، فرحان کے دل میں ہلچل اور بے قراری نے کروٹ لی تھی شاید اس کے دل نے حوریہ کے دل کی آواز سن لی تھی وہ ایک دم ہی واپس پلٹا تو حوریہ نے فوراً آنکھیں موند لیں۔

وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے سر ہانے آ کر کھڑا ہو گیا اور اس کی پیشانی پر بکھرے بالوں کو اپنی انگلیوں سے نرمی سے ہٹاتے ہوئے بولا۔

”لو میں رک گیا ہوں۔ کہیں نہیں جا رہا تمہیں چھوڑ کر اب تم اطمینان سے سو جاؤ ہوں۔ گڈ گرل۔“ اور حوریہ کا دل بے اختیار تشکر اور پیار کے جذبات سے بھرتا چلا گیا وہ اس کے دل کی بات جان گیا تھا اس کا مطلب تھا کہ وہ اس سے سچی محبت کرتا تھا اسے دل سے چاہتا تھا بنا کسی

لاج کے اس نے حوریہ کو اپنے نکاح میں قبول کیا تھا وہ ایک اچھا حساس اور مخلص انسان ہے آج حوریہ کو بھی دل سے اس کی سچائی پر یقین اور محبت اور خلوص پر اعتبار آ گیا تھا وہ ایک دم سے ہی اپنی ساری تکلیف ساری اذیت اور دکھ بھول گئی تھی وہ خوش تھی کہ ناگہانی حالات نے اسے ایک شاندار باوقار اور بھرپور پیار دینے والے جیون ساتھی سے نوازا تھا یہ اس کے لئے یقیناً قدرت کا تحفہ ہی تو تھا ورنہ ماما پاپا کے بعد تو اس کے پاس جینے کی کوئی خواہش کوئی امید ہی باقی نہیں بچی تھی فرحان کی محبت نے اس کے بے دم ہوتے وجود میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی تھی وہ خود کو مضبوط قلعے میں محسوس کرتے ہوئے نیند سے ہم آغوش ہو گئی کرسی پر بیٹھے بیٹھے فرحان کی بھی آنکھ لگ گئی تھی صبح کے سوانوح رہے تھے جب اس کی آنکھ کھلی سردی میں کرسی پر کئی گھنٹے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے بیٹھے اس کی ٹانگیں اکڑ گئیں تھیں حوریہ گہری اور پرسکون نیند سو رہی تھی وہ اس پر ایک نگاہ ڈال کر کمرے سے باہر نکل آیا زینت بی بی پر اس کی نظر پڑی تو فوراً سلام کیا۔

”السلام وعلیکم بی بی!“

”علیکم السلام بیٹا جیتے رہو سدا خوش رہو اللہ تمہیں ڈھیروں کامیابیاں عطا کرے تمہاری ہر دلی مراد پوری کرے۔“ زینت بی بی نے اسے متا بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے دل سے دعائیں دیں تو فرحان نے مسکراتے ہوئے دل سے آئین کہا۔

”بی بی ایک کپ چائے ملے گی ساری رات کرسی پر بیٹھے رہنے سے پورا بدن اکڑ سا گیا

ہے“

”بیٹا تم منہ ہاتھ دھو لو وہ دائیں جانب واش روم ہے چائے کیا میں تمہارے لئے ناشتہ لگواتی ہوں۔“ زینت بی بی نے انہیں تشکر سے دیکھتے ہوئے کہا جوان کی حوریہ کی خاطر اپنا چین آرام اور نیند برباد کیے ہوئے تھا۔

”نہیں بی بی ناشتے کو دل نہیں چاہ رہا بس ایک کپ اچھی سی چائے پلو ادیس پھر میں چلوں گا ادھر ٹائیگر پریشان ہو رہا ہو گا میں اسے بتائے بغیر رات کو یہاں آ گیا تھا۔“ فرحان نے جلدی سے کہا اور واش روم کی طرف چلا گیا اور چائے پینے کے بعد وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تو زینت بی بی کہنے لگیں۔

”بیٹا فرحان تم ادھر ہی کیوں نہیں شفٹ ہو جاتے یہ گھر بھی تو اب تمہارا ہے۔“

”تمہیں بی بی یہ گھر حوریہ کا ہے میرا گھر وہ ہوگا جو میں اپنی محنت کی کمائی سے بناؤں گا آپ میرے لئے دعا کیجئے گا کہ مجھے اچھی سی جاب مل جائے اور میں اپنے سارے خواب پورے کر سکوں حوریہ کو وہ سب کچھ دے سکوں جو اسے اپنے ماں باپ کے گھر میں میسر ہے۔“ فرحان نے نرم مگر سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

”انشا اللہ ایسا ہی ہوگا میں تو روز تمہارے لئے دعا کرتی ہوں اللہ تمہاری محنت کا پھل تمہیں ضرور دے گا انشا اللہ آج کل میں تمہیں اچھی نوکری بھی مل جائے گی لیکن بیٹا حوریہ کے شوہر کی حیثیت سے اس کی جائیداد پر تمہارا بھی حق ہے اس گھر میں کوئی مرد تو رہا نہیں رشتے داروں کا رویہ اور سلوک تمہارے سامنے ہے ایسے میں حوریہ معصوم اتنا بڑا کاروبار کیسے سنبھال سکتی ہے اور وہ تو ابھی بہت چھوٹی ہے اسے بزنس کی الف ب کا کیا پتہ بیٹا میری مانو تو تم سیٹھ صاحب کا بزنس سنبھال لو حوریہ کو بھی سکھا دینا ورنہ یہ لالچی رشتے دار تو کاروبار بھی تباہ کر دیں گے۔“ زینت بی بی نے سنجیدگی سے سمجھاتے اور قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تو وہ پر سوچ انداز میں بولا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں میں سوچتا ہوں اس بارے میں واقعی یہ لالچی رشتے دار سیٹھ صاحب کے بزنس پر قبضہ کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔“

”تو اور کیا بیٹا، سیٹھ صاحب کے داماد کی حیثیت سے اب یہ تمہارا فرض بنتا ہے کہ ان کی اس جائیداد کی کاروبار کی دیکھ بھال اور بہتری کے لئے کام کرو۔“

”ٹھیک ہے بی بی میں سوچ کر بتاؤں گا لیکن حوریہ کی مرضی کے بغیر میں کچھ نہیں کروں گا آپ حوریہ سے بات کیجئے گا اگر وہ مجھ پر اعتبار کر سکیں۔ تو میں اس بارے میں اپنی خدمات مہیا کروں گا ورنہ نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ ہاں سے رخصت ہو گیا، زینت بی بی کو اس کی انا خود داری اور خود سے اپنا کچھ کرنے کی لگن نے بہت متاثر کیا تھا وہ خوشی سے مسکرا دیں۔

☆☆☆

”لو آ گیا میرا شیر، میرا شہزادہ۔“ وہ گھر میں داخل ہوا تو باہر نے اسے دیکھتے ہی نموی طرف دیکھ کر اسے اطلاع دینے والے انداز میں کہا۔

”او کہاں تھا یا تو؟“ باہر نے اس کے پاس آ کر پوچھا۔

”حوریہ کے گھر۔“

”او.....“ باہر نے اوکو بڑا لمبا کھینچا تھا اور شرارت سے مسکراتے ہوئے نمو کے چہرے کو دیکھا تھا وہ بھی مسکرا رہی تھی۔

”تو پوری رات وہاں گزار کے آرہے ہو بڑے مزے ہیں بھی تیرے رات کو چپکے سے غائب ہو گیا میں صبح سے پریشان ہو رہا ہوں کہ تو مجھے بتائے بغیر کہاں چلا گیا؟“

”اور کہاں جاسکتا ہوں میں اس شہر میں وہ دوسرا گھر ہے جو مجھے پہچانتا ہے۔“ فرحان نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”ہاں یہ بات میرے دماغ میں نہیں آئی تھی جیسی پریشان ہو رہا تھا مگر تیرے منہ پہ بارہ کیوں بج رہے ہیں بیوی سے مل کر آ رہا ہے تجھے تو خوش ہونا چاہیے۔“

”تو جانتا ہے ناکہ یہ شادی کن حالات میں ہوئی ہے؟“

”جانتا ہوں تو حور یہ بھابھی کے لئے اور وہ تیرے لئے بہت کئی ثابت ہوئی ہیں۔“ باہر نے کہا تو نمونے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

”آپ اپنی کہے جا رہے ہیں۔ فرحان بھائی سے بھی پوچھیں کہ وہ پریشان اور افسردہ کیوں ہیں؟“

”ہاں بھی بتا دے رات کیا ہوا تھا جو تیرا منہ اترا ہوا ہے؟“

”حور یہ کے کزن اسرار احمد نے رات حور یہ کے بیڈروم کو آگ لگا دی تھی۔“ فرحان نے گہرا سانس لے کر جواب دیا۔

”کیا؟“ وہ دونوں صدمے سے ایک ساتھ چیخ اٹھے۔

”ہاں۔“

”حور یہ بھابھی تو خیریت سے ہیں ناں۔“ باہر نے تیزی سے پوچھا۔

”ہاں الحمد للہ وہ بچ گئی ہے اگر میں وہاں بروقت نہ پہنچتا تو۔“ فرحان نے جملہ ادھورا چھوڑ

دیا اور اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔

”کیوں نہ پہنچتا تو ہیرو ہے ہیرو اچھا اب ساری کہانی سنا۔“ باہر نے اس کے پاس بیٹھ کر

اس کے شانوں کے گرد اپنا بازو محاکل کر کے مسکراتے ہوئے کہا اس نے ساری حقیقت ان دونوں کے گوش گزار کر دی۔

”زینت بی بی ٹھیک کہہ رہی ہیں فرحان بھائی آپ کو حوریہ بھابی کا بزنس سنبھال لینا چاہیے۔“ نمونے سنجیدگی سے کہا۔

”اور حوریہ کو بھی۔“ باہر نے شوخی سے کہا۔

”میں بیوی کے گھر میں نہیں رہ سکتا۔“ فرحان نے کہا۔

”تو بیوی کو اپنے گھر لے آؤ۔“

”اپنی دال روٹی تو مشکل سے پوری ہوتی ہے تن پر لباس بھی لنڈے بازار سے خرید کر پہنتے ہیں۔ اور بات کر رہا ہے تو کہ میں اس نازوں پٹی شہزادیوں کی طرح پر آسائش زندگی گزارنے والی لڑکی کو یہاں اس ڈربے میں لے آؤں اور وہ کیوں آئے گی میرے ساتھ؟ کیوں رہے گی اس ڈربے میں میرے ساتھ جہاں ضروریات زندگی ہی بمشکل میسر آتی ہیں یہاں اس کی شان کے مطابق کچھ بھی تو نہیں ہے۔“ وہ تلخی سے بولا نمونہ اپنی اماں کی آواز پر وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

”تو کسی سے کم ہے کیا؟“ باہر نے اس کے کندھوں کو تھام کر اس کے چہرے کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”سر سے پاؤں تک اللہ نے تجھے شاندار شخصیت سے نوازا ہے تعلیم ہے تیرے پاس سب سے بڑھ کر احساس کی دولت ہے تیرے پاس حوریہ بھابی کو تو تیرا احسان مند ہونا چاہیے تو نے دوبار ان کی زندگی بچائی ہے ان کی حفاظت کی ہے تیرے جیسا پیار کرنے والا اور مخلص انسان انہیں کوئی اور نہیں مل سکتا میں جانتا ہوں تجھے حوریہ سے پیار ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ تو نے ان پر احسان کیا ہے۔“

”کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا بہت کمینگی ہے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ فرحان نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”اچھا چھوڑا داسی میرے پاس تیرے لئے ایک خوشخبری ہے۔“

”کیسی خوشخبری؟“

”یہ دیکھ یہ دس بجے ابھی تیرے آنے سے پہلے ٹی سی ایس والا دے کر گیا ہے خط تو تیرے نام تھا مگر میں کھولے بنا رہ نہیں سکا کیونکہ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس میں ضرور میرے یار کے لئے کوئی خوشخبری ہے اور جب میں نے یہ لیٹر کھول کر دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا میرا دل باغ باغ ہو

گیا مبارک ہو یا تو نے جو پچھلے ہفتے خولجہ گروپ آف انڈسٹریز میں میٹنگ ڈائریکٹر کی جاب کے لئے انٹرویو دیا تھا نا وہ جاب تجھے مل گئی ہے۔“

”کیا تو سچ کہہ رہا ہے؟“ فرحان نے بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھا۔

”ہاں لے تو خود پڑھ لے۔“ بابر نے مسکراتے ہوئے لیٹر اس کے حوالے کر دیا۔

”ٹھیکس گاڈ، شکر الحمد للہ۔“ وہ واقعی فرحان کا اپائنٹ منٹ لیٹر تھا وہ خوشی سے مسکرا دیا۔

”بہت بہت مبارک ہو۔“ بابر نے اسے گلے لگاتے ہوئے مبارکباد دی۔

”خیر مبارک شکر ہے مالک مایوسی اور مفلسی کے بادل تو چھٹنے شروع ہوئے۔“ فرحان نے

خوشی سے بھٹکتی ہوئی آواز میں کہا۔

”دیکھا اللہ میاں کسی انسان پر اس کی گنجائش سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا اس نے تجھے بیوی

دی ہے تو ساتھ ہی نوکری بھی دی ہے تاکہ تو بیوی کے اخراجات انفرڈ کر سکے دیکھ لینا گھر گاڑی کی

سہولت تو لازمی دیں گے وہ تجھے پھر کیا خیال ہے حوریہ بھابھی کو اپنے گھر لانے کے متعلق۔“ بابر

نے شوخ و شریر لہجے میں پوچھا۔

”لاؤں گا اسے اپنے گھر مگر اس کی رضا مندی سے میں اس سے پیار کرتا ہوں لیکن وہ تو

نہیں کرتی۔“

”تجھے کیا پتہ ایویں اداس ہونے کے بہانے نہ ڈھونڈ نوکری ملنے کی خوشی میں مجھے شاندار

ساڈز کرانا ہے آج تو نے۔“ بابر نے خوشی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے نوکری ملی ہے ابھی تنخواہ نہیں ملی ہے جو تجھے شاندار ساڈز کرواؤں ڈنر کے لئے پہلی

تنخواہ ملنے تک انتظار کرنا پڑے گا تجھے۔“ فرحان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کروں گا انتظار لے تو منہ میٹھا کر نمو کی امی نے تیری نوکری کی خبر سنتے ہی بیسن کا حلوہ بنانا

شروع کر دیا تھا آہا کیا خوشبو ہے زبردست۔“ نمو بڑی سی پلیٹ میں بیسن کا حلوہ لئے وہاں آئی

تھی اور بابر نے اسے دیکھتے ہوئے حلوے کی خوشبو سونگھتے ہوئے کہا تھا۔

”یہ حلوہ صرف فرحان بھائی کے لئے ہے آپ صرف خوشبو سونگھیں۔“ نمونے بابر کو دیکھتے

ہوئے کہا تو فرحان کو ہنسی آ گئی۔

”ہاں جی میں بھلا اس قابل کہاں کہ ایسا مزیدار حلوہ کھانے کو دیا جائے سچ ہے بھئی ماں بھی

اپنے کماؤ پوت سے ہی پیار کرتی ہے فارغ اور بیکار بیٹے کو تو وہ گھر میں برداشت نہیں کرتی۔“ باہر ایک دم سے سنجیدہ اور افسردہ ہو کر بولا تو نمونہ بھی شرمندہ سی ہو گئی اس کے کہنے کا یہ مطلب تو نہیں تھا جو وہ سمجھتا تھا۔

”اے یہ اداس ہونے کی نہیں ہو رہی اچھا ویسے بھی یہ سنجیدگی اس چہرے پر بہت بھیانک لگتی انشا اللہ تجھے بھی نوکری مل جائے گی بلکہ سمجھو کہ مل گئی چل اسی خوشی میں حلوہ کھالے میرا یار پہلے منہ میٹھا کرے گا۔“ فرحان نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا اور جھج میں حلوہ بھر کے اس کے منہ میں دے دیا وہ ہنس دیا۔

”یہ تو بتا نوکری کہاں ملی ہے مجھے؟“ باہر نے پوچھا۔

”سیٹھ شارمر حوم کی فیکٹریز کا انچارج میں تجھے بنا دیتا ہوں ویسے بھی وہاں کسی ایماندار اور مخلص شخص کا ہونا بہت ضروری ہے اور میری نظر میں وہ شخص تو ہی ہو سکتا ہے جسے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“ فرحان نے سنجیدگی سے کہا۔

”شکریہ یار پر کہیں حوریہ بھابھی کو کوئی اعتراض نہ ہو۔“

”اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”اچھا پھر حلوہ کھانا بنتا ہے تو تم بھی کھاؤ کیا یاد کرو گی کہ کسی سخی سے رشتہ جڑا ہے۔“ باہر نے مسکراتے شوخ لہجے میں کہتے ہوئے حلوے کا جھج بھر کر نمونہ کے منہ میں دے دیا وہ شرمائی اور منہ پر ہاتھ رکھ کر تیزی سے اپنے پورشن کی طرف بھاگی تو وہ دونوں بے ساختہ ہنس پڑے۔

☆☆☆

”حوریہ بیٹی بہت نصیبوں والی ہو تم کہ تمہیں فرحان جیسا خود دار اور مخلص شریک زندگی ملا ہے اللہ بڑا کار ساز ہے اس نے تم سے تمہارے ماں باپ کو واپس لے لیا اور فرحان کو تمہارا سہارا بنکھان بنا دیا اللہ کے بعد اب وہی تمہارا سہارا ہے بیٹی اس کی قدر کرنا اب دیکھو نا مجھے فون کر کے اس نے کہا ہے کہ میرا دوست باہر فیکٹریوں کی مگرانی کا کام کرے گا خود فرحان میاں کو بہت اچھی نوکری مل گئی ہے اللہ انہیں ترقی اور کامیابی دے ماشا اللہ بہت ہی اچھا اور نیک بچہ ہے۔“ زینت بی بی نے مسکراتے ہوئے سنجیدگی سے خوشی سے اسے بتایا۔

”بی بی وہ یہاں آ کر کیوں نہیں رہتے؟ ان سے کہیں نا کہ میں اب ان کے خلوص پر شک

نہیں کروں گی وہ یہاں آ جائیں مجھے ماما پاپا کے بعد اب اس گھر میں ڈر لگتا ہے ہر وقت ان کی یاد آتی ہے موت کا رقص دکھائی دیتا ہے ہر سو کیوں چلے گئے ماما پاپا مجھے تنہا چھوڑ کے لوگ اس قدر اندھا دھند گاڑی کیوں چلاتے ہیں۔ وہ یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ ان کی تیز رفتاری کسی کی زندگی کا چراغ گل کر سکتی ہے کسی کو یتیم و بے سہارا کر سکتی ہے کیوں نہیں سوچتے یہ لوگ کیوں چھین لیا اس ٹریفک کے حادثے نے میرے پیارے ماما پاپا کو مجھ سے کیوں بی بی بی؟ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتی ان کے ساتھ ہی مر جاتی۔“

”تو پھر میرا کیا بنتا میں تو کنوارہ ہی مر جاتا۔“ فرحان کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی اس نے یکدم سر اٹھا کر دیکھا سامنے کھڑا مسکرارہا تھا سفید شرٹ اور سیاہ پینٹ کوٹ میں وہ بے حد جیہ لگ رہا تھا۔

”آپ۔“ حوریہ نے دھیرے سے کہا۔

”جی میں دیکھنے آیا تھا کہ موسم خوشگوار ہے مطلع اُردا آلود ہے یہاں تو خوب زوروں کی بارش ہو رہی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”بیٹا تم ہی اسے سمجھاؤ جانے والے تو چلے گئے ہیں اور.....“

”آنے والے آگئے ہیں۔“ فرحان نے ان کی بات کاٹ کر کہا تو حوریہ نے بے ساختہ

پوچھا۔

”تو آپ ادھر ہی رہیں گے ناں۔“

”نہیں۔“ فرحان نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر اچانک در آنے والی خوشی یکدم معدوم ہو

گئی تھی اس کے ”نہیں“ کہنے سے۔

”میں چائے لاتی ہوں۔“ زینت بی بی ان دونوں کو بات کرنے کا موقع فراہم کرنا چاہتی

تھیں بہانے سے وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔

”بیوی کے گھر میں وہ مرد رہتے ہیں جن میں اپنا گھر بنانے کی ہمت اور صلاحیت نہیں ہوتی

میں اتنا بڑا گھر نہ سہی لیکن چھوٹا سا گھر تو بنا ہی سکتا ہوں۔“

”گھر تو گھر والوں سے بنتا ہے اور یہ گھر تو اب کھنڈر بن کر رہ گیا ہے دل گھبراتا ہے میرا اس

گھر میں اب۔“ وہ روتے ہوئے بولی تو فرحان نے اس کے سامنے بیٹھ کر اس کے دوپٹے سے

اس کے آنسو صاف کیے اور رسان سے بولا۔

”حوریہ میں چاہتا ہوں کہ تم جب بھی میرے پاس آؤ دل سے مجھے اپنا شوہر اپنا ساتھی اپنا پیار سمجھ کر آؤ کسی ڈر خوف یا مجبوری کے تحت میری رفاقت قبول نہ کرو جتنی شدت سے میں تمہیں چاہتا ہوں۔ تمہارا دل بھی مجھے اتنی ہی شدت سے چاہے۔ اور تم اپنی مرضی سے میرے پاس خوشی خوشی آؤ۔“

”پتہ نہیں خوشی میرے نصیب میں لکھی بھی ہے کہ نہیں۔“

”تمہیں نصیب بنانے والے پر اور مجھ پر یقین نہیں ہے نا اس لئے تم ایسا کہہ رہی ہو جب دکھ اور غم کے اس فیر سے تم باہر نکل آؤ گی تو تمہیں ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں دکھائی دیں گی۔“ فرحان نے اس کے سندر چہرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے یقین سے کہا تو وہ بس اس کے چہرے کو اپنی بھینکتی آنکھوں سے دیکھتی چلی گئی اور فرحان کو اپنا آپ اس کی جھیل سی آنکھوں میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا وہ بے بسی سے لب بھینچتا ہوا اٹھا اور تیزی سے وہاں سے باہر نکل گیا اور ساتھ ہی حوریہ کا دل بھی اس کے تعاقب میں نکل گیا تھا وہ حیرت زدہ تھی اس کے یوں جانے اور اپنے دل کے چھن جانے پر۔

☆☆☆

ان دونوں نے اپنی اپنی جاب سنبھال لی تھی شیخ ریاض اور ان کی بیگم اب نمو اور بابر کی شادی کرنا چاہتے تھے بابر الگ گھر خریدنا چاہتا تھا لیکن اس کے لئے ابھی بہت سارا پیسہ درکار تھا اور نئی نئی نوکری میں یہ ممکن نہیں تھا اس کو تین فیکٹریوں کا انچارج ہونے کی حیثیت سے 75 ہزار روپے تنخواہ دیگر الاؤنسز کے ساتھ مل رہی تھی جبکہ فرحان کی تنخواہ پچاس ہزار روپے ماہانہ تھی کمپنی نے گاڑی کی سہولت اسے دے رکھی تھی مکان فی الحال وہ لینا نہیں چاہتا تھا وہیں شیخ صاحب کے گھر میں بطور کرایے دار رہنا چاہتا تھا ابھی ان دونوں کو اپنے اپنے گھر والے بہت یاد آتے تھے اور اب جب سے انہیں ملازمت ملی تھی انہیں اور زیادہ شدت سے اپنے ماں باپ اور بہن بھائی یاد آنے لگے تھے۔

”کیا فائدہ ہوا مجھے تم پر لاکھوں روپے خرچ کرنے کا ایک ڈھنگ کی نوکری تو ڈھونڈ نہیں سکے تم میں نے سوچا تھا کہ بڑے ہو کر پڑھ لکھ کر تم میرا بازو بنو گے سہارا بنو گے لیکن تم خود ابھی تک

میرے محتاج ہو آوارہ اور ناکارہ کھٹو اور نالائق لوگوں کو کوئی نوکری نہیں دیتا اور نہ ہی ایسے ناکار اور ہڈ حرام بیٹے کے لیے میرے گھر میں کوئی جگہ ہے نکل جاؤ میرے گھر سے اور اس وقت تک مجھے اپنی یہ منحوس شکل مت دکھانا جب تک میرے لاکھوں روپے لوٹانے کے قابل نہ ہو جاؤ۔“ فرحان کی سماعتوں میں اپنے والد فیضان علی کی غصے سے گرجتی آواز گونجی تو وہ بے کل ہو کر اٹھ بیٹھا۔

”ابا باپ بیٹے کے رشتے میں یہ کاروبار کیسے آ گیا؟“ اس نے کہا تھا۔

”مجھے سبق پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے سمجھا نکل جا میرے گھر سے اور خالی ہاتھ اس گھر میں قدم رکھنے کی کوشش کی تو تیری ٹانگیں توڑ دوں گا۔“ فیضان علی کے الفاظ کا نشتر فرحان کو مزید چھلنی کر گیا۔

”میں نے سوچا تھا ٹاپ کیا ہے تو نوکری بھی ٹاپ کی ملے گی اسے اور میں اچھے خاندان اور بڑے گھر میں اس کی شادی کروں گی مگر اس کی بے روزگاری نے تو میرے سارے خواب چکنا چور کر دیئے۔“

”ایک بے کار بے روزگار اور کھٹو لڑکے کو بھلا کون اپنی بیٹی دے گا؟“ فرحان کی والدہ انجم آراء نے کہا تھا۔

”اماں اللہ نے چاہا تو آپ کے بیٹے کو بڑے گھر اعلیٰ خاندان و حسب نسب کی لڑکی کا رشتہ ملے گا۔“ فرحان نے کہا تھا۔

”ہو نہ ہو خود ہی بیاہ کر لے آنا اسے خوابوں میں حقیقت میں تو ایسا ہونے سے رہا۔“ انجم آراء نے کہا تھا۔

فرحان کو ساری باتیں یاد آ کر پھر سے دکھی کر رہی تھیں آج اس کے پاس ایک اچھی ملازمت تھی ایک پیاری سی لڑکی جو اعلیٰ خاندان و حسب نسب کی تھی اس کی بیوی بھی اللہ کے کرم سے اسے سب کچھ مل گیا تھا اس کے ماں باپ کے طعنے ان کی قیاس آرائیاں غلط ثابت ہو گئیں تھیں فرحان کو پھر بھی یقین تھا کہ اس کے ماں باپ دل میں اس کے لئے دعا ضرور کرتے ہوں گے۔

”اکبر بھائی نے صاف کہہ دیا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ کہیں اور ملے کر رہے ہیں اور یہ بھی کہ تمہارے باپ کو تو اتنی اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کے باوجود ابھی تک کوئی ڈھنگ کی نوکری نہیں ملی

میں اتنا اچھا رشتہ بابر کے نوکری ملنے کے انتظار میں تو نہیں ٹھکرا سکتا تمہارے بیٹے کو تو پیہ نہیں کب نوکری ملے میں تو اپنی بیٹی کے فرض سے جلد از جلد فارغ ہونا چاہتا ہوں اب مجھ سے گلہ مت کرنا اصغر کے بڑے بھائی نے خیال نہیں کیا اس سے زیادہ انتظار میں نہیں کر سکتا۔“ بابر کے کانوں میں اپنے ابو اصغر مجید کی آواز گونجی تھی وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

”تو نہ کریں انتظار کر دیں اپنی بیٹی کی شادی اب میں ان کی بیٹی سے شادی کرنے کے چکر میں غلط چکروں میں تو پڑنے سے رہا۔“ بابر نے منہ بسور کر کہا تھا۔

”بکو اس بند کر آج تیری وجہ سے میری اپنے بھائی سے بات کرنے کی ہمت نہیں رہی کتنی شرمندگی اٹھانا پڑی ہے مجھے بھائی صاحب کے سامنے تجھے اس کا احساس ہی نہیں ہے۔“ اصغر مجید نے غصے سے کہا تھا۔

”ابو اس میں میرا کیا قصور ہے کہ نوکری نہیں مل رہی؟“

”تیرا ہی قصور ہے تجھے مفت میں کھانے کو مل رہا ہے تا اس لئے تیرا دل ہی نہیں چاہتا کام کرنے کو کام چور ہذا حرام ٹھیک ہی کہتے ہیں بھائی صاحب آخر ایک بیکار اور بے روزگار شخص کو وہ اپنی بیٹی کا رشتہ کیوں دیں گے ہو جائے گی ان کی سسلی کی شادی اور سب کو پیہ چل جائے گا کہ بھائی صاحب نے تجھے اپنا داماد بنانے سے انکار کر دیا ہے دیکھنا پھر خاندان کیا محلے میں بھی کوئی تجھے اپنی بیٹی کا رشتہ نہیں دے گا خاندان والے تھو تھو کریں گے ہم پر تم نے ہماری ناک ہی کٹوا دی ہے۔“ اصغر صاحب غصے سے بولے تھے۔

”تو کیا چاہتے ہیں آپ لوگ؟ میں چوری کروں ڈاکے ڈالوں۔“ وہ بے بسی اور احساسِ ذلت سے سلگ کر بولا تھا۔

”تم یہی کچھ سوچ سکتے ہو ایسی ہی گھٹیا سوچ ہوگی تا تمہاری دن رات آوارہ دوستوں میں پھرتا ہے وہ تیرا یار ہے تا فرمانِ شاہ ہے اسے بھی اس کے باپ نے گھر سے نکال دیا ہے وہ بھی تیری طرح آوارہ اور ناکارہ ہے دفعہ ہو جا تو بھی میری نظروں سے دور ہو جا آئندہ مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔“ اصغر صاحب نے غصیلے اور تفر آ میز لہجے میں کہا تھا اور وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھتا کہ راحیلہ بیگم بولیں۔

”کہاں جا رہا ہے تو؟“

”اپنی ضروری چیزیں سمیٹے“ بابر نے جواب دیا تھا۔

”دیکھنا اس کی ضروری چیزوں میں کہیں گھر کی کوئی قیمتی چیز نہ چھپا کر لے جائے بیکار شخص کو چار دن تو باہر گزارہ کرنے کے لئے روپے پیسے چاہیے ہوتے ہیں۔“ اصغر صاحب نے کہا تھا تو بابر اپنے کمرے سے اپنا بیگ لے کر نکلا تھا۔

”گھر کی قیمتی چیز تو اولاد ہوتی ہے ابو جی، جسے آپ یہاں سے وقفہ ہو جانے کا حکم صادر کر رہے ہیں۔ دیکھ لیجئے یہ میرے دو جوڑے کپڑے ہیں اور تعلیمی اسناد ہیں جن کا قرض اتارنا ہے اب مجھے اور کچھ نہیں لے جا رہا آپ کے گھر سے۔“ بابر نے بیگ ان کے سامنے خالی کرتے ہوئے کہا سب گھر والے یہ منظر دیکھ رہے تھے بہن بھائی اسے روکنا چاہتے تھے مگر باپ کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت و جرأت کسی میں بھی نہیں تھی۔

”ارے کہاں جائے گا تو؟“ راحیلہ بیگم نے فکر مندی سے پوچھا۔

”جانا کہاں ہے جائے گا کسی آوارہ دوست کی طرف اور تم میری یہ بات لکھ کے رکھ لو وہ اسے ایک دو دن سے زیادہ اپنے پاس نہیں رکھنے کا چار دن میں صاحبزادے کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا اور آ خر لوٹ کے بدھو گھر کو ہی آئے گا تم فکر نہ کرو اتنا غیرت مند نہیں ہے یہ کہ اتنی ذلت کے بعد یہ کچھ کام کی فکر کر لے گا۔“

”اب بس بھی کریں آپ نے تو حد ہی کر دی ہے۔“ راحیلہ بیگم نے کہا تھا۔

”جب تک یہ میرے سامنے ہے مجھے غصہ آتا رہے گا اور میں یونہی بولتا رہوں گا اس سے کہو دور ہو جائے میری نظروں سے۔“ اصغر صاحب نے اونچے لہجے خویر و گندی رنگت والے اپنے اس بڑے بیٹے بابر کو دیکھتے ہوئے غصیلے اور تیز لہجے میں کہا تھا۔

”جار ہا ہوں آپ کی نظروں سے دور نوکری اور بیوی دونوں حاصل کر کے ہی دکھاؤں گا میں اب آپ کو اللہ حافظ۔“ یہ کہہ کر بابر وہاں سے چلا آیا۔

”اوگا ڈکتنی سردی ہے۔“ بابر کو سرد ہوا کے تیز جھونکے نے چھوا تو وہ کپکپاتے ہوئے بولا ماضی کا در یکدم بند ہو گیا تھا۔

”تو بھی گھر والوں کی یاد میں کھویا ہے آج ہے نا۔“ فرحان نے اس کے پاس آ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں اس کا مطلب ہے کہ تو بھی؟“ باہر نے اس کی صورت کو دیکھا۔

”ہاں یار بے شک انہوں نے ہمیں لعن طعن کر کے گھر سے نکال دیا تھا لیکن وہ ہمارے دل سے تو نہیں نکل سکے اب تک آج ہمارے پاس اچھی نوکری بھی ہے اور بیوی بھی پھر بھی ہم ان کو اپنی خوشیوں میں شریک کرنے سے قاصر ہیں۔“ فرحان نے اس کے ساتھ کھڑے ہو کر سنجیدگی سے کہا تو وہ بولا۔

”تو کیا خیال ہے پھر چلیں اپنے اپنے گھروں کو؟“
 ”نہ بھی تو نے جانا ہے تو مجھے اپنی ٹانگیں نہیں تڑوانیں۔“
 ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ابامیاں نے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ میرے لالھوں روپے جو میں نے تم پر خرچ کیے ہیں۔ وہ لوٹانے کے قابل ہو جاؤ تو آنا ورنہ اس گھر میں قدم رکھا تو تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔“ فرحان نے مسکراتے ہوئے بتایا تو وہ پٹ سے بولا۔
 ”تیرے ابا ہیں کہ ہلا کو خان ہیں۔“

”حداد میرے ابا میاں کی شان میں کوئی گستاخی نہیں ہونی چاہیے سبھے میں پانچ لاکھ جمع کر کے انہیں اکٹھے ہی واپس کروں گا“ فرحان نے اس کے کندھے پر اپنی کہنی رکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

”تب تو پورا سال چاہیے تجھے اور پھر کیا تو خود جائے گا انہیں رقم دینے۔“ باہر نے اس کے چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔
 ”نہیں تجھے بھیجوں گا۔“

”نہ بھائی میں نہیں جانے کا تمہارے ہلا کو ابا سے ملنے یا رقم دینے ہم دونوں رقم جمع کر کے منی آرڈر بھیجوا دیں گے یا کسی اعتبار کے آدمی کے ہاتھ بھیجوا دیں گے جتنی عزت افزائی کر کے ہمیں انہوں نے اپنے گھروں سے نکالا تھا اس کے بعد ہم کیسے بے غیرت بن کے وہاں دوبارہ چلے جائیں میں تو نہیں جاؤں گا وہ ہمارے بغیر خوش ہیں تو ہم بھی کوئی مروت نہیں گئے زندگی نے بہت کچھ سیکھا دیا ہے ہمیں۔“ باہر نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”واہ بھئی میرا ٹائیگر تو بڑا ہو گیا ہے ایک دم سے اتنی سمجھداری کی باتیں کرنے لگا ہے۔“

فرحان نے مسکراتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا کر کہا تو وہ ہنس کر بولا۔
 ”شکریہ دوست بس کبھی غرور نہیں کیا اپنی سمجھداری پر۔“ اور فرحان مسکرا دیا۔

☆☆☆

”فرحان نہ تو حوریہ کو اپنے ساتھ لے کر گیا ہے اور نہ ہی اس کے ساتھ ”نارولا“ میں رہ رہا ہے ابھی ہمارے پاس وقت ہے ہم ان دونوں کے راستے الگ کر سکتے ہیں ان دونوں کے بیچ بدگمانی اور غلط فہمی پیدا کر کے۔“ غیاث الدین اپنی بیگم زرقا سے مخاطب تھے۔

”یہ تم جانو اس سے ملتی رہا کرو اتنی آسانی سے تو کروڑوں کی جائیداد اس فقرے کو ہڑپ نہیں کرنے دیں گے میں نے سب پتہ کر لیا ہے وہ اپنے اس دوست کے ساتھ کرایے کے مکان میں رہتا ہے مجھے تو لگتا ہے کہ حوریہ کو انہیں نے ڈرا دھمکا کر نکاح کرایا ہوگا اور وہ دونوں لڑکے تو اس مکان میں نثار بھائی اور سفینہ کے انتقال سے دو ماہ پہلے سے اُس مکان میں کرایے دار کی حیثیت سے رہ رہے ہیں پھر اگر ان کا نثار بھائی سے اتنا گہرا تعلق تھا تو فرحان نے شہر میں ہوتے ہوئے بھی ان کے جنازے میں شرکت کیوں نہیں کی؟ اور دس دن بعد وہ کہاں سے نمودار ہو گئے کہیں حوریہ کسی مشکل میں تو نہیں ہے؟“ غیاث الدین نے سنجیدگی سے ساری صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”کہتے تو آپ ٹھیک ہیں یہ لیرے اچانک اس بچی کے وارث بن کر آ گئے ہیں ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ فرحان اپنا اور حوریہ کا نکاح نامہ دکھانے کی بات کر رہا تھا۔ تو ہمیں نکاح نامہ دیکھ لینا چاہیے تھا کیا خبر نکاح سرے سے ہوا ہی نہ ہو۔“ زرقا سے سنجیدگی سے کہا۔

”ہاں یہ بھی ممکن ہے تم آج ہی حوریہ سے ملو اور طریقے سے حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرو اگر ہمارے اندازے درست نہیں تو پھر حوریہ کو راستے سے ہٹانا ضروری ہو جائے گا تم یہ گولیاں سنبھال کر رکھو اور کسی بھی چیز میں گھول کر اسے پلا دینا لیکن ہوشیاری سے۔“ غیاث الدین نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے ایک چھوٹا سا خاکے لفافہ نکال کر انہیں دیتے ہوئے سفاکی سے کہا۔

”کیسی گولیاں ہیں یہ؟“ زرقا نے لفافہ لے کر پوچھا۔

”سلو پوائزننگ۔“

”کیا؟“

”ہاں بے ذائقہ مگر با اثر ہیں حور یہ جیسی نازک لڑکی کے لئے تو دو گولیاں ہی کافی ہوں گی ہم اس کو قتل نہیں کریں گے بس وہ ہسپتال ضرور پہنچ جائے گی اور الزام فرحان کے سر آئے گا پھر ہم حور یہ کو فرحان سے بدگمان اور متنفر کرنے میں آسانی سے کامیاب ہو سکتے ہیں۔“ غیاث الدین نے بے رحمی اور سنگدلی سے اپنا پلان بتایا۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے غیاث الدین اگر اسرار کی طرح میں بھی پکڑی گئی تو۔“

”بیوقوف ہوتم ہوشیاری سے کام لینا بھلا ذرا سی گولی حور یہ کے جوس یا چائے وغیرہ میں ملانا کون ہما مشکل ہے نظر بچا کر چپکے سے ڈال دینا اور ہاں حور یہ کے لئے اس کی پسند کا کیک اور پیزا خرید کر لے جانا اس کے ساتھ ظاہر ہے کہ وہ چائے تو ضرور منگوائے گی اور ایک بات اور.....“

”وہ کیا؟“

”جب تم چائے پی چکو تو تھوڑی سی مزید چائے اس کپ میں ڈال کر یا اپنی چائے ہی پہلے سے بچا لینا ایک گولی اس بچی ہوئی چائے میں ڈال کر ہلا دینا تاکہ اگر بات کھلے تو تم پر کسی کا شک نہ جائے اور اگر چائے دانی میں چائے پیش کی جائے تو ایک آدھ گولی اس میں بھی ڈال دینا اس طرح تم صاف بچ جاؤ گی۔“

”واہ زبردست پلاننگ کی ہے آپ نے کیا دماغ پایا ہے سر تاج آپ نے۔“ زرقانے انہیں داد دیتے ہوئے کہا تو وہ بڑے مسرور انداز میں ہنس پڑے۔

☆☆☆

فرحان اپنے آفس میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ اس کے موبائل کی بیپ بجی اس نے دیکھا اجنبی نمبر تھا اسے یاد نہیں آیا کہ یہ نمبر کس کا ہے؟ چوتھی بیل پر اس نے کال رسیو کر لی۔

”ہیلو السلام وعلیکم!“

”وعلیکم السلام فرحان کیسے ہو بیٹا!“

”جی الحمد للہ میں بالکل خیریت سے ہوں معاف کیجئے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“ وہ واقعی نہیں پہچان سکا تھا کہ دوسری جانب سے آتی یہ تیز سے لہجے والی مردانہ آواز کس کی تھی؟

”ارے نالائق تو تو سدا کا بھلکھو ہے اپنے باپ کی آواز نہیں پہچانتا۔“

”ابا، ابا جان آپ۔“ فرحان بیٹھے سے کھڑا ہو گیا اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا اُن کے پاس اس کا موبائل نمبر کہاں سے آیا تھا اس نے تو یہاں آنے کے بعد موبائل کی سم ہی تبدیل کر لی تھی۔

”ہاں بھئی میں تمہارا باپ بول رہا ہوں مبارک ہو سنا ہے بہت شاندار نوکری مل گئی ہے تمہیں اور یہ بھی کہ کروڑ پتی لڑکی سے شادی کر لی ہے خاندان بھی سنا ہے بہت اچھا ہے ساس سر حادثے میں چند روز قبل انتقال کر گئے ہیں اللہ جنت نصیب کرے انہیں۔“

”آپ کو یہ ساری معلومات کس نے فراہم کی ہیں؟“ فرحان نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا تو وہ جو شیلے لہجے میں گویا ہوئے۔

”بابر ہے نا تمہارا دوست اس نے فون پر بات کی تھی مجھ سے پہلے تو اس نے پانچ لاکھ کی رقم میرے بینک اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرانے کے لئے فون کیا تھا اور مجھ سے میری بہو کی بات بھی کرائی تھی اس نے تم نے تو جی جی میرا سارا قرض اتار دیا۔ میں نے تو صرف تمہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلانے کے لئے طعنہ دیا تھا ورنہ بیٹا اولاد پر خرچ کرنا تو باپ کا فرض ہوتا ہے۔“

”ابا میں نے بیٹا ہونے کے ناطے اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کی ہے ہماری روزی روٹی اسی شہر میں لکھی تھی لہذا حالات ایسے ہو گئے تھے ہمیں یہاں آنا پڑا خیر آپ یہ بتائیں کہ اماں اور باقی سب کیسے ہیں؟“ فرحان نے اپنی حیرت اور الجھن پر قابو پاتے ہوئے پوچھا تو وہ اسی جو شیلے انداز میں بتانے لگے۔

”سب خیریت سے ہیں اور تجھے بہت یاد کرتے ہیں تیری بہن کی شادی طے کر دی ہے انشا اللہ اب دھوم دھام سے اس کی شادی کروں گا تو نے بروقت رقم بھیج کر سارا مسئلہ ہی حل کر دیا ہے یہ بتا گھر کب آ رہا ہے؟“

”ابھی تو مجھے کام ہے ابا اچھا ابا پھر بات ہو گی میرے پاس کا بلاوا آیا ہے گھر میں سب کو سلام کہیے گا اللہ حافظ۔“ فرحان نے جلدی سے بات ختم کر کے موبائل آف کر دیا۔

”حوریہ نے کیوں اتنی بڑی رقم انہیں بھجوائی ہے کیا سمجھتی ہے وہ خود کو اپنی دولت سے مجھے مرعوب کرنا چاہتی ہے اور بابر اس کی تو میں ابھی خبر لیتا ہوں۔“ فرحان نے غصے سے کہتے ہوئے بابر کا سیل فون ملایا۔

”ہاں کے ٹو بول۔“ بابر نے دوسری نسل پر ہی کال ریسیو کر لی۔

”تو نے حوریہ کے ذریعے ابا کو پانچ لاکھ روپے بھجوائے ہیں۔“
 ”ہاں لیکن تیرا نام لے کر بھجوائے ہیں کہ تو نے انہیں یہ رقم بھجوائی ہے۔“
 ”کیوں؟“

”میں نے حوریہ بھابھی سے یونہی ذکر کر دیا تھا کہ تیرے ابا نے پانچ لاکھ مانگے تھے تو انہوں نے فوراً مجھے پانچ لاکھ، کاچیک کاٹ کر دے دیا۔“ باہر نے سنجیدگی سے بتایا تو وہ غصے سے بولا۔

”تو نے حوریہ کی نظروں میں مجھے دو کوڑی کا کر دیا ہے کیا سوچتی ہو گی وہ میرے بارے میں اور تجھے کیا ضرورت تھی حوریہ کے سامنے میرا دکھڑا رونے کی؟“
 ”یارتو اتنے غصے کیوں ہو رہا ہے؟ میں نے حوریہ بھابھی کو کہا تھا کہ فرحان کے والدین اب میرے والدین بھی ہیں۔“ وہ وضاحت پیش کرنے لگا۔

”یہاں ہر کوئی پیسے کا باپ ہے پیسے سے محبت ہے سب کو پیسہ ہاتھ میں آ جائے تو آوارہ اور ناکارہ بیٹا، ہیرے موتی جیسا ہو جاتا ہے ہونہر۔“ فرحان نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔
 ”پانچ لاکھ ملنے پر بیٹے کی یاد بھی آ گئی اور محبت بھی جاگ اٹھی ہے واہ اے مولا تیری دنیا کے رنگ۔“ فرحان کی آنکھیں دکھ سے بھیگ گئیں اور گاڑی کی چابی اٹھا کر وہ حوریہ سے اس مہربانی کا سبب پوچھنے چل دیا۔

وہ غصے سے چلتا ہوا سیدھا حوریہ کے کمرے میں آیا تھا۔ وہ ابھی ابھی مغرب کی نماز کی ادائیگی سے فارغ ہوئی تھی اسے یوں لال بھسکا دیکھ کر سہمی گئی۔
 ”کیوں کیا ہے تم نے مجھ پر یہ احسان بھیک تو نہیں مانگی تھی میں نے تم سے بہت پیسہ ہے نا تمہارے پاس بولو۔“ فرحان نے غصے سے بولتے ہوئے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

”میرا پیسہ اب آپ کا بھی تو ہے۔“ وہ سہمی کانپتی آواز میں بولی تو وہ غصے سے بولا۔
 ”تم خود تو میری ہونے سے گھبراتی ہو اور تمہارا پیسہ میرا کیسے ہو گیا مجھے اپنا احسان مند کرنا چاہتی ہو میری انا اور خود داری کا مذاق اڑا کر تماشا دیکھنا چاہتی تھیں میری بے بسی کا جواب دو۔“
 ”اگر آپ اتنے ہی غیرت مند، خود دار اور انا پرست ہیں۔ تو اس وقت آپ کی انا اور خود داری کہاں جاسوئی تھی جب آپ آدمی رات کو چوروں کی طرح میرے گھر میں نقب لگانے آئے

تھے تب بھی آپ کو یہ روپیہ پیسہ ہی چاہیے تھا نا مگر حالات کی سنگدلی نے آپ کو چور سے میرا شوہر بنا دیا حالات وہ نہ ہوتے جو آپ کو یہاں آنے پر نظر آئے تو آپ رقم چرا کر فرار ہو جاتے تب کون سائیک عمل ہوتا وہ۔“ حور یہ نے اس کے ہاتھوں کو اپنے شانوں سے جھٹک کر تیز لہجے میں کہا تو ایک لمحے کو تو گنگ سا ہو گیا مگر فوراً ہی سنبھل کر بولا۔

”اگر میرا احساس اور ضمیر مردہ ہوتا تو میں تمہاری اس بے بسی کی پوری پوری قیمت وصول کر سکتا تھا یہ ساری دولت جس کے لئے تمہارے تایا ماموں تمہیں موت کے منہ میں دھکیلنا چاہتے ہیں یہ سب گن پوائنٹ پر اپنے نام لکھوا سکتا تھا مگر میں نے ایسا کچھ نہیں کیا تمہیں ان لاپچی لوگوں سے بچانے کی خاطر تم سے نکاح کیا تھا اگر میں اتنا ہی بے غیرت ہوتا تو تمہیں اغواء کر کے لے جاتا یوں تم سے شرعی رشتہ ہرگز نہ جوڑتا اور رہی بات رقم کی تو چوری کر بھی لیتا تو یہ سوچ کر میں اس گھر میں داخل ہوا تھا کہ ایک دن وہ رقم میں واپس اس گھر کے مالک کو لوٹا دوں گا قرض سمجھ کر یہاں سے رقم لے جاتا خیر تمہارے پانچ لاکھ بھی اب مجھ پر تمہارا قرض ہیں جو میں جلد لوٹانے کی کوشش کروں گا لیکن کان کھول کر سن لو آئندہ مجھ پر کوئی احسان کرنے کی ضرورت نہیں ہے سمجھیں تم بہت شوق ہے تمہیں اپنی دولت لوٹانے کا تو اپنے ان حریص رشتے داروں پر لوٹا دو۔ جو اس دولت کی خاطر تمہاری جان کے دشمن ہو گئے ہیں۔“ فرحان نے غصیلے سخت اور سپاٹ لہجے میں کہا اور تیزی سے وہاں سے باہر نکل گیا جس وقت فرحان کی گاڑی ”نثارولا“ سے نکل کر جا رہی تھی اسی وقت زرقا اپنی گاڑی میں ”نثارولا“ آ رہی تھی انہوں نے فرحان کا غصے سے لال چہرہ دیکھ کر گڑبڑ ہونے کا اندازہ لگا لیا تھا انہیں یقین تھا کہ وہ ضرور حور یہ سے جھگڑ کر گیا ہے اور یہ بھی کہ حور یہ ضرور اس وقت رور رہی ہوگی اور یہ حور یہ پر اپنی محبت ہمدردی اپنائیت جتانے کا بہترین موقع تھا وہ تیزی سے اپنی گاڑی ”نثارولا“ کے گیٹ سے اندر لے آئیں کیک اور پیزا کے پیک والے شاپر اٹھا کر اندر چلی آئیں۔

”السلام وعلیکم بیگم صاحبہ!“ زینت بی بی نے انہیں دیکھتے ہی سلام کیا۔

”علیکم السلام زینت یہ کیک اور پیزا پلٹینوں میں سیٹ کر کے لاؤ میں اپنی حور یہ کی پسند کے

فلیور لائی ہوں۔“

”اچھا ابھی لائی چائے بھی ساتھ ہی بتالوں پیس گئی ناں۔“ زینت بی بی نے شاپران کے

ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں کیوں نہیں ان لوازمات کے ساتھ تو چائے ہی مزادے گی یہ اپنی حوریہ کہاں ہے؟“
”اپنے کمرے میں ہے۔“

”اچھا میں اس سے وہیں مل لیتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ حوریہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں
دروازہ کھولا تو حسب توقع وہ بیڈ پر بیٹھی رو رہی تھی۔

”حوریہ میری بچی کیا ہوا چندا کیوں رو رہی ہو؟“ زرقانے فوراً اس کے پاس آتے ہوئے
بہت دلار سے پوچھا۔

”مامی۔“ حوریہ کو اس وقت رونے کے لئے ایک مہربان دامن کی ضرورت تھی سو وہ ملتے ہی
ان کے گلے سے لگ کر شدت سے رونے لگی وہ اسے بڑے پیار سے تھکنے لگیں۔

”مامی، ماما پاپا، کیوں چلے گئے مجھے چھوڑ کر؟“ وہ روتے ہوئے بولی۔
”بیٹا، صبر کرو ان کی عمر ہی بس اتنی لکھی تھی اب تمہارے سامنے پہاڑ جیسی زندگی پڑی ہے
خود کو سنبھالو میری بچی اس طرح رو رو کر تو تم آدھی رہ گئی ہو اور یہ فرحان کیوں اتنے غصے میں گیا
ہے کوئی لڑائی ہوئی ہے کیا تم دونوں کے بیچ؟“

”نہیں تو وہ تو مجھے رونے سے منع کر رہے تھے میں ان کے چپ کرانے سے بھی نہیں چپ
ہوئی تو وہ غصے سے چلے گئے۔“ اس نے بہانہ بنایا وہ اتنا تو سمجھ ہی چکی تھی کہ وہ بھی جھوٹی محبت جتنا
کر اس کی دولت حاصل کرنے کی راہ ہموار کر رہی ہیں۔

”لو یہ کیا بات ہوئی باہر تو لڑکیوں سے بہت ہنس ہنس کے ملتا ہے گھر میں بیوی کو تسلی دلا رہے
دینے کی بجائے الٹا غصہ کر کے چلا گیا ہائے میری پھول سی بچی کس پتھر دل شخص سے بیاہ دی گئی“
زرقانے بڑے میٹھے نرم ہمدردانہ لہجے میں کہا اسی وقت زینت بی بی ٹرائی میں کیک پیز اور چائے
سجا کر لے آئیں زرقانے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے پیار سے کہا۔

”لو بیٹا کیک پیز اکھاؤ تمہاری پسند کالائی ہوں میں۔“

”مامی آپ نے کیوں تکلف کیا؟“

”ارے تکلف کیسا بس میرا دل چاہا کہ میں اپنی بیٹی کے ساتھ چائے پیوؤں اور کیک پیز
کھاؤں تو لے آئی چلو شاباش پہلے منہ ہاتھ دھو آؤ۔“ انہوں نے بہت پیار سے کہا زینت بی بی

ٹرائی چھوڑ کر چلی گئیں چائے کپوں میں تھی زر قانے جلدی سے گولیوں لفافہ نکالا اور دو گولیاں حوریہ کے کپ میں ڈال دیں اور دو گولیاں زہ مٹھی میں لے کر بیٹھی رہیں تاکہ آدھی چائے پینے کے بعد اس میں ڈال دیں۔

☆☆☆

”یار فرحان شرم کر اس لڑکی کی محبت کو تو اتنا غلط سمجھ رہا ہے وہ بہت کم سن ہے معصوم ہے تو نے اگر اس کی زندگی بچا کر اس پر احسان کیا ہے تو اس طرح اسے ذلیل کر کے ہرٹ تو نہ کرو تو پہلے ہی بہت دکھی ہے۔“ باہر نے اس کے گھر آنے پر اسے کھری کھری سنائیں۔

”میں تو جیسے بہت خوش ہوں ناں۔“ وہ تلخی سے بولا۔

”تو کس نے کہا ہے اداس رہنے کو حوریہ کو گھر لے آؤ اور اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز کرو اسے بھی مکمل تحفظ اور سکون مل جائے گا اور تمہیں بھی اس بے سکونی سے نجات مل جائے گی۔“ باہر نے سنجیدگی سے مشورہ دیا تو وہ بے بسی سے بولا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں یار نا سنگر میں نے تو نجانے غصے میں آ کر اس کو کیا کچھ کہہ دیا تھا۔“

”سب جانتا ہوں میں جو کچھ تو نے حوریہ سے کہا ہے میں نے اسے فون کیا تھا وہ بہت رو رہی تھی بہت ہرٹ کیا ہے تیرے اس رویے نے اسے تو کس انا اور خودداری کو سینے سے لگائے پھر رہا ہے؟ وہ جو کسی کو دکھ پہنچائے کسی کا مان توڑ دے یا خود تجھے غریبی بے بسی اور بے سکونی کی نذر کر دے کم آن یار چھوڑ دے اپنی انا کا علم گرا دے اس خودداری کی دیوار کو جو تیرے اور حوریہ کے بیچ حائل ہو گئی ہے وہ معصوم تو پیار کی طلبگار ہے۔ ڈانٹ پھنکار نہیں ماں باپ کی موت کا زخم ہی اسے دکھی رکھتا ہے اوپر سے تو اسے اس کی دولت کے طعنے دے رہا ہے کچھ تو خیال کر یار میاں بیوی میں کچھ تیرا میرا نہیں ہوتا سب ایک دوسرے کا ہوتا ہے اسے منالے اور اس کے باپ کا بزنس سنبھال لے تو تو آسانی سے اتنی دولت کما سکتا ہے جس سے اپنی ذمے داریاں پوری کر سکتے تو نے حوریہ کے بزنس کو سنبھال کر مفت کی روٹی تو نہیں کھائی دن رات مغر ماری اور محنت کرے گا تو یہ کاروبار آگے بڑھے گا ترقی کرے گا اور تیری محنت کا پھل تجھے زیادہ نہ سہی ماہانہ چار پانچ لاکھ روپے کا مل ہی چاہیے“ باہر نے سنجیدگی سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو دل مسلتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

”کیا ہوا؟“

”یار میرا دل گھبرا رہا ہے۔“ وہ سینے پر ہاتھ ملتے ہوئے بولا اور باہر کی جانب بڑھ گیا۔

”اب کدھر جا رہا ہے؟“

”حوریہ سے ملنے۔“

”اچھا مجھے فون کر دینا اس کے پاس پہنچ کر اور گاڑی دھیان سے چلائیں۔“ بابر نے تاکید کی وہ سر ہلاتا باہر نکل گیا۔

وہ ”نثارولا“ پہنچنے ہی حوریہ کے بیڈروم میں داخل ہوا تھا اور وہاں حوریہ کو صوفے پر بے سدھ پڑی تھی وہ گھبرا کر اس کے پاس دوڑا چلا آیا۔

”حوریہ کیا ہوا ہے؟“ فرحان نے اس کا سراپے بازو پر رکھ کر پوچھا۔

”وہ چائے میں“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی اور ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی فرحان کے تو پیروں تلے سے جیسے زمین ہی نکل گئی تھی اس نے حوریہ کو فوراً اپنی بانہوں میں اٹھایا اور باہر بھاگا۔

”بی بی بابا ڈرائیور۔“ اس کی ایک پکار پر سب دوڑے چلے آئے۔

”ڈرائیور گاڑی نکالو حوریہ کو ہو سپتال پہنچانا ہے بی بی آپ آئیں ہمارے ساتھ اور بابا چائے کس کے لئے بنی تھی ابھی؟“ فرحان باہر بھاگتے وئے ان سے کہہ رہا تھا پوچھ رہا تھا۔

”بیٹا وہ زرقا بیگم آئیں تھیں حوریہ کے لئے ایک اور پیزالے لے کر اس کے ساتھ ہی بنائی تھی“ زینت بی بی نے ساتھ چلتے ہوئے بتایا۔

”رحمت بابا بچی ہوئی چائے کو کسی بوتل میں ڈال کر آپ بھی ہو سپتال پہنچیں فوراً۔“ فرحان نے انہیں دیکھ کر کہا اور حوریہ کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹانے کے بعد خود ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا زینت بی بی حوریہ کا سراپے گود میں رکھ کر پیچھے بیٹھی اس پر قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر پھونکنے لگیں فرحان نے باہر کو فون کر کے ساری صورتحال سے آگاہ کیا اور ہو سپتال پہنچنے کی تاکید کی۔

کیسی الجھن ہے میری جان پہ بن آئی ہے

میری چاہت پھر سے میرا چین چرا لائی ہے

فرحان کا پرواں رواں حوریہ کی صحت و سلامتی کے لئے دعا گو تھا پہلے تو سمجھا تھا کہ شاید

کے روے کے سبب وہ اس حال کو پہنچی ہے مگر اس نے چائے والی بات بتا کر اس کے احساس ندامت کو کم کر دیا تھا ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ چائے میں کوئی زہریلی چیز ملی ہوئی تھی ڈاکٹر نے حور یہ کا معدہ صاف کر دیا تھا اسے بروقت طبی امداد ملنے کی وجہ سے اس حالت مزید بگڑنے سے بچ گئی تھی اور اب خطرے والی کوئی بات نہیں تھی فرحان نے سجدہ شکر ادا کیا زینت بی بی اور رحمت بابا بھی ہنگامی آنکھوں سے رب کے حضور حور یہ کے لئے دعا گو تھے۔

”فرحان تو نے اس سے شادی کی ہے نا خواہ جیسے بھی حالات میں کی ہے اب وہ تیری بیوی ہے تیری ذمہ داری ہے جب تو جانتا ہے کہ اس کے رشتے دار اس معصوم کی جان کے درپے ہیں تو کیوں اسے بار بار اکیلا چھوڑ جاتا ہے اسے بھی ڈر خوف اور موت کی وادی میں تنہا چھوڑتا ہے اور پھر خود بھی اس کے لئے پریشان ہوتا ہے تڑپتا ہے اب وہ تیری بیوی ہے اس پر تیرا اب کوئی احسان نہیں ہے۔ تیرا فرض ہے کہ تو اس کا خیال رکھے اس کی حفاظت کرے اسے اس ڈر اور خوف سے نجات دلائے۔“ باہر نے اس کے شانوں کے گرد بازو جمائل کر کے سنجیدہ مگر نرم لہجے میں سمجھایا۔

”میں یہ سب باتیں جانتا ہوں لیکن اُسے بھی تو مجھ پر اعتبار ہو مجھ سے پیار ہو میں ایسے کیسے اسے زبردستی اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کر سکتا ہوں؟“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”اپنے پیار سے اور کیسے؟ اور وہ تجھ سے پیار کرتی ہے تجھے یقین کیوں نہیں آتا ابامیاں کے رویے کی وجہ سے تیرا اعتبار رشتوں پر سے اٹھ گیا ہے ہے نا۔“ باہر نے سنجیدگی سے کہا۔

”پتہ نہیں۔“ وہ بے بسی سے بولا۔

”اچھا پریشان نہ ہوا انشا اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ باہر نے اسے اپنے ساتھ لگا کر یقین سے کہا تو وہ بھی اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

حور یہ کو ہوش آ گیا تھا اور ساتھ ہی فرحان کے حواس بھی بحال ہو گئے تھے وہ اس کے قریب بیڈ کی پٹی پر بیٹھ گیا اور دھیرے سے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں میں پھیرا تو اس نے آنکھیں کھول دیں وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت بے قراری سے دیکھ رہے تھے دونوں کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں لب کپکپا رہے تھے۔

”آئی ایم سوری۔“ فرحان نے پر نرم آواز میں کہا۔

”جب ہر بار مجھے چھوڑ کر ہی چلے جاتا ہوتا ہے تو پھر کیوں آ جاتے ہیں میری زندگی بچانے

کیوں لائے مجھے یہاں؟ مر جانے دیا ہوتا مجھے میں بھی اپنے ماما پاپا کے پاس چلی جاتی پھر کسی کو مجھے آگ لگانا یا زہر پلانے کی میری دولت کا طعنہ دینے کی ضرورت نہ پڑتی کیوں؟ کیوں بچایا آپ نے مجھے؟“ وہ روتے ہوئے انک انک کر بولی تو وہ تڑپ کر رہ گیا۔

”کیونکہ میں تم سے پیار کرتا ہوں تمہاری زندگی صرف تمہاری نہیں ہے یہ میری زندگی ہے اور اپنی زندگی کو بچانے کی کوشش ہر انسان کرتا ہے۔“ وہ اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے بالے میں لے کر پریم لہجے میں بولا۔

”تو اپنی زندگی کو خطروں میں چھوڑ کر ہی کیوں جاتے ہیں؟ کیوں کرتے ہیں مجھے بچا کر مجھ پر یہ احسان میں ان لوگوں کے مارنے سے تو نہیں مری لیکن آپ کی بے رخی یہ احسان مندی مجھے ضرور مار دے گی“ حور یہ نہ روتے ہوئے کہا تو فرحان نے تڑپ کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اپنے اندر سولیا وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

”حور یہ میری جان میری زندگی تمہیں جینا ہے میرے لئے میری خاطر میں اپنی حور یہ کو اب کبھی تنہا نہیں ہونے دوں گا کچھ نہیں ہونے دوں گا اپنی حور یہ کو بس جلدی سے تندرست ہو جاؤ پھر ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔“ وہ بھیکتی آواز میں بولا تو وہ خوشی سے روتے ہوئے بولی۔

”فر.....حان۔“

”جی میری جان۔“

”آئی..... آئی لویو۔“ حور یہ نے اس کے چہرے کو بھیکتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا تو فرحان کے ہونٹوں پر مسروری مسکان بکھر گئی اس نے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی پر اپنی محبت کی مہر ثبت کر دی وہ شرمیلے پن سے مسکرا دی۔

”اب تو آپ میرے ساتھ رہیں گے ناں۔“

”ہاں ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے ہمیشہ۔“ فرحان نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے دل سے کہا۔

”میری دولت کو گھر کو اپنا سمجھیں گے ناں پاپا کا بزنس سنبھالیں گے ناں آپ۔“

”یہ کیا باتیں لے بیٹھیں تم چلو آرام کرو۔“ وہ بولا۔

”نہیں پلیز مجھ سے وعدہ کریں آپ کو میری قسم۔“

”حوریہ۔“ وہ اس کے چہرے کو دیکھ کر رہ گیا۔

”میں سچ بچ آپ سے پیار کرتی ہوں کسی ڈر خوف یا مجبوری کی وجہ سے نہیں بلکہ آپ کے اندر چھپے ایک اچھے انسان کے اچھے عمل کی وجہ سے میں آپ کے ساتھ اس گھر میں بھی رہ لوں گی جہاں آپ رہتے ہیں۔“

”مگر وہ گھر تمہارے شایان شان نہیں ہے۔“ فرحان نے اس کی محبت کے اظہار پر مسرور ہو کر غیبار سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو معصومیت سے بولی۔

”کیوں؟ جب آپ وہاں رہ سکتے ہیں تو میں بھی بخوشی آپ کے ساتھ وہاں رہ سکتی ہوں کیونکہ میری شان تو آپ ہیں ناں۔“

”حوریہ میری جان آج تو تم نے مجھے خوشی سے مالا مال کر دیا ہے آئی ریٹلی لویو جانی۔“ فرحان نے خوشی سے اسے چوم کر کہا تو وہ شرماتی مسکراتی اس کے سینے سے لگ کر پرسکون ہو گئی۔

صبح تک وہ بہت حد تک سنبھل گئی تھی ڈاکٹر نے دواؤں اور ہدایہ دے کے ساتھ اسے ڈسچارج کر دیا فرحان کے بازو کا زخم بھی بھر چکا تھا دھیرے دھیرے بدن اور روح نر لگے سارے زخم بھر رہے تھے۔ فرحان نے حوریہ کی پسند کے مطابق ایک شاندار بنگلہ خریدا تھا ”نارولا“ میں حوریہ کو ماما پاپا کی یادیں تڑپاتی تھیں اسے کرایے پر دے دیا گیا تھا اور وہ بنگلہ چونکہ حوریہ کی رقم سے خریدا گیا تھا اس لئے حوریہ ہی کے نام تھا فرحان نے اپنی ملازمت حوریہ کے قسم دینے پر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اب سیٹھ نثار کا لمبا چوڑا بزنس اس نے سنبھالنا تھا بابر بھی پہلے سے ہی جاب کر رہا تھا شیخ ریاض نے اکیس دسمبر کو نمودار بابر کی شادی طے کر دی تھی نمونے ایم اے اردو کیا تھا کھلی گندمی رنگت اور دلکش نین نقش والی نمود بابر سے محبت کرتی تھی اور بابر بھی اسے دل سے چاہتا تھا اب تقریب نکاح نہایت سادگی سے منعقد ہوئی تھی وہ دونوں بہت خوش تھے فرحان اور بابر دونوں نے اپنا اپنا ولیمہ ایک ساتھ شاندار انداز میں کرانے کا فیصلہ کیا تھا حوریہ نے زرقا اور غیاث الدین کو بھی ان کی اس سازش کے باوجود معاف کر دیا تھا ان دونوں میاں بیوی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا سوائے اپنی سازش کو تسلیم کر لینے کے۔

فرحان اور بابر کے گھر والے بھی لاہور پہنچ چکے تھے ان دونوں کی دعوت ولیمہ میں شرکت کے لئے وہ سبھی ان کی ترقی اور شادی پر خوش دکھائی دے رہے تھے حوریہ پہلی بار اب دلہن بنی تھی

اور بہت ہی حسین لگ رہی تھی گولڈن اور میرون عروسی جوڑے اور طلائی زیورات کلیوں گجروں سے بچی سنوری بیس سالہ حور یہ سچ کچ جنت کی حور لگ رہی تھی فرحان نے اسے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا وہ خود بھی بلیک تھری پیس سوٹ میں بہت ڈیشنگ لگ رہا تھا اس پر وقار اور شاندار تقریب کی مسودی بھی بن رہی تھی اور تصاویر بھی کھینچی جا رہی تھیں بہت خوش اسلوبی سے یہ تقریب اپنے اختتام کو پہنچی۔

☆☆☆

اکتیس دسمبر کی شب نے بارہ بجائے یکم جنوری نے آنکھ کھولی تو آتش بازی اور ڈھول باجوں کی آوازیں دور دور سے فضا میں گونجنے لگیں نئے سال کا آغاز ہو گیا تھا فرحان اپنی خواب گاہ کی کھڑکی سے باہر تاروں بھرے آسمان کو دیکھ رہا تھا۔

”پہلی برتھ ڈے ٹویو پپی برتھ ڈے ڈیئر فرحان۔“ حور یہ کی مدھر اور دلنشین آواز نے فرحان کو چونکا دیا وہ فوراً پلٹا تھا اس کی کم سن اور حسین دلہن اس کے لئے بکے اور کارڈ لئے کھڑی مسکراتے ہوئے اسے دس کر رہی تھی۔

”حور یہ تم مائی گاڈ پہلے کیا کم قیامت ڈھا رہی ہو جو اس انداز سے مجھے دس کر کے اور ستم کر ڈالا ہے ویسے تم سے کس نے کہا کہ یکم جنوری میرا جہنم دن ہے میری سالگرہ کا دن ہے۔“ وہ اس کے ہاتھوں سے بکے اور کارڈ لے کر پوچھ رہا تھا۔

”بابر بھائی نے بتایا تھا کل شام کو انشا اللہ خوب شاندار انداز میں آپ کی برتھ ڈے سیلبریٹ کریں گے۔“

”پہلے سہاگ رات تو سیلبریٹ کر لیں حور یہ جان۔“ فرحان نے بکے سائڈ ٹیبل پر رکھ کر کھڑکی بند کر کے اس کے چہرے کو شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے شریر لہجے میں کہا تو شرما کر نظریں جھکا گئی فرحان نے بہت چاہت سے اس کو دیکھا اور اس کو اپنے ساتھ لگا کر بیڈ پر آ بیٹھا اور اس کا دیا ہوا ڈشنگ کارڈ کھول کر پڑھنے لگا۔

پیارے فرحان

سیاہ راتوں کے چاند میرے

تیرے وجود کی ضیاء سے

مرے بدن کی تازگی ہے
بڑی ہی دلکش زندگی ہے
راحتیں ہیں سپردگی کی

”جنم دن مبارک ہو سالگرہ بہت بہت مبارک ہو صرف آپ کی حوریہ۔“

”میری حوریہ میری جان حوریہ تھینک یو سو مج یہ نیا سال ہماری نئی زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں لے کر طلوع ہوگا انشا اللہ۔“

”انشا اللہ۔“ حوریہ نے بھی دل سے کہا اور فرحان نے بہت محبت سے اس کے نرم ملائم کوئل سے وجود کو اپنی پناہوں میں سمولیا۔

سیاہ راتوں کے چاند میرے
ترے وجود کی ضیاء سے
میرے بدن کی تازگی ہے
بڑی ہی دلکش زندگی ہے
راحتیں ہیں سپردگی کی

حوریہ دل میں اس سے مخاطب تھی اور نئے برس کے نئے اور نوزائیدہ لمحوں میں اپنے اور فرحان کے اس نئے رشتے کے آغاز کو روح کی گہرائیوں تک سے محسوس کر رہی تھی اور فرحان کیلئے بھی راحت کا مسرت کا سامان بن رہی تھی دونوں کے دل روئیں خوشی کے رستے پر گامزن تھے۔

☆.....☆.....☆.....☆

”اماں جان! آپ اپنی نوا سی کو اپنے پاس رکھ لیں، اس کی سوتیلی ماں نے اس کا جینا دو بھر کر دیا تھا۔ مجھے اجالا کو آپ کے پاس چھوڑنے کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آیا تو میں اسے لے کر یہاں چلا آیا“ حمید فاروقی نے اجالا کو اپنے سینے سے لگائے اشک بہاتی صابرہ بیگم سے کہا جنہیں ”سب اماں جان“ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

”حمید بیٹا! ہم نے تو تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ اجالا کو ہمارے سپرد کر دو سوتیلی ماں نجانے کیا

سلوک کرے بچی کے ساتھ مگر تم نے منع کر دیا تھا۔ اب گیارہ بارہ برس کے بعد آ کے کہہ رہے ہو کہ سوتیلی ماں نے اس معصوم کا جینا دو بھر کر رکھا ہے۔ ارے ہمیں تو تم نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ اجالا سے رابطہ مت کیجئے گا۔ ورنہ اس کا ددھیال میں دل نہیں لگے گا۔ ہم غیروں سے اس کی خیر خبر پوچھتے رہے تم نے تو اسے اپنی شفقت کے زیر سایہ نہ رکھا اس کی ماں مری تھی۔ باپ تو زندہ تھا نہ پھر یہ یتیم بن کر دوسروں کے در پر کیوں پڑی رہی تمہیں اپنی معصوم بچی کے جذبات و احساسات کا ضروریات کا کوئی خیال نہیں آیا اور اب ڈیڑھ سال ہی تو ہوا تھا اجالا کو تمہارے بیوی بچوں کے ساتھ تمہارے گھر میں رہتے ہوئے اتنے دن بھی بیٹی کو سکھی نہ رکھ سکے ارے بیٹیاں تو ہوتی ہی پرایا دھن ہیں۔ یہ تو آنگن کی چڑیاں ہیں ایک دن اڑ ہی جانا ہوتا ہے انہوں نے اس دن تک کا بھی انتظار نہیں کر سکیں تمہاری صائمہ بیگم۔“ اماں جان نے غصیلے اور بھگیتے لہجے میں کہا۔

”میں کیا کرتا اماں جان اسے چھوڑ کر تماشا نہیں بن سکتا تھا اور اب وہ میرے بیٹوں کی ماں ہے میرے ساتھ تو وہ ٹھیک رہتی ہے بس اجالا سے اسے خدا واسطے کا بیر ہے۔“ حمید فاروقی نے شرمندگی اور بے بسی سے کہا۔

”تمہارے ساتھ ٹھیک کیوں نہیں رہے گی وہ آخر تمہارے دم سے ہی اس کا گھر آباد ہے اس کے بچوں کے باپ ہو تم وہ یہ نہیں سمجھتی کہ اجالا بھی تمہاری بیٹی ہے اس کی رگوں میں بھی تمہارا خون دوڑ رہا ہے وہی خون جو اس کے بیٹوں کی رگوں میں گردش کر رہا ہے حمید فاروقی کیسے شوہر ہو تم تمہارا اپنی بیوی پر کنٹرول نہیں ہے وہ دو بیٹے جن کو سمجھتی ہے کہ کل خدائی کی مالک بن بیٹھی ہے بن ماں کی بچی کیا کہتی تھی اس کو اس کی وجہ سے وہ تم سے دور رہی اور تمہاری وجہ سے ہم سے دور رہی پہلے کیوں نہ لے آئے اجالا کو یہاں؟“

”بی اماں بی مجھ سے بڑی بھول ہو گئی مجھے معاف کر دیں اور اجالا کو اپنے پاس رکھ لیں میں اس سے ملنے آتا رہوں گا۔ میں اب اپنی بیٹی کو مزید کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا۔ اس کی ساری زندگی محرومیوں میں طعنوں میں اپنوں سے دور گزری ہے اب نہیں میں حالات درست ہوتے ہی اسے یہاں سے لے جاؤں گا۔“ حمید فاروقی نے اجالا کے سر پر دست شفقت رکھ کر بھیکتی آواز میں کہا تو اماں جان نے فکر مند لہجے میں کہا۔

”تم نے تو ہمیں شش و پنج میں ڈال دیا ہے حمید میاں کیونکہ یہاں تو اب کوئی ہوگا نہیں تین

”مہینے تک۔“

کیا مطلب اماں جان! حمید فاروقی کے ساتھ ساتھ اجالا نے بھی انہیں حیرت سے دیکھا۔
 ”حمید میاں میں نفیس اور اس کی دلہن توج پر جا رہے ہیں نفیس کی بچیاں بھی اپنے گھروں کو چلی جائیں گی حمیرا اور سمیرا کو دو سال پہلے بیاہ دیا تھا ہم نے اب تو ماشا اللہ دونوں ایک ایک بچے کی ماں ہیں حمیرا تو ہمیں بہاول پور میں بیاہی ہے اور سمیرا کراچی میں اپنی خالہ کے گھر بیاہی ہے ایسے دونوں سے بڑا ہے وہ اب تک شادی کے لئے آمادہ نہیں ہوا تھا اس لئے اس کی شادی ہونا ہے اصل تو بیٹیوں کا فرض ہوتا ہے وہ نفیس نے ادا کر دیا ہے جہی تو بے فکری سے حج پر جا رہے ہیں ہم۔“ اماں جان نے تفصیل سے بتایا۔

”کتنے خوش قسمت ہیں نفیس بھائی اور آپ بھی کہ اپنی بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہو کر اللہ کے گھر جاضری کے لئے جا رہے ہیں۔ اللہ سفر کی مشکلات آسان فرمائے۔ اور آپ لوگوں کا حج قبول کرے ہمارے لئے بھی دعا کیجئے گا۔“ حمید فاروقی نے سنجیدہ اور مدہم لہجہ میں کہا۔

”کیوں نہیں حمید بھائی آپ کا اجالا کے ناطے اس خاندان سے جو رشتہ ہے وہ تو ہمیشہ قائم رہے گا ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس وقت اجالا کو یہاں نہیں رکھ سکتے کیونکہ ایس کی جاب لاہور میں ہے وہ بھی ہماری وجہ سے آیا تھا کل واپس چلا جائے گا اسے چھٹی بڑی مشکل سے ملی ہے ہم کراچی سمیرا کے گھر جائیں گے پھر وہاں سے جدہ کے لئے ہماری فلائٹ ہوگی کیوں نہ اجالا کو سمیرا کے پاس کراچی چھوڑ جائیں واپسی پر لیتے آئیں گے وہ گھر بھی تو اس کی خالہ ہی کا گھر ہے نا“ ارجمند نفیس نے کہا۔

”ہاں تو اور کیا سمیرا کی خالہ اجالا کی خالہ بھی تو ہوئی ناں اور وہ بہت اچھی خاتون ہیں بہت محبت کرنے والی ہیں انخم آپا، اجالا کو بہت محبت سے رکھیں گی۔“ نفیس احمد نے بھی اپنی بیوی کی بات کی تائید کی۔

”پتا نہیں محبت میری بچی کے نصیب میں لکھی بھی ہے کہ نہیں یہ کب تک یوں دوسروں کے در پر زندگی کے دن گزرتی رہے گی؟“ حمید فاروقی آزر دگی سے بولے۔

”مایوس نہیں ہوتے حمید میاں اللہ تعالیٰ اپنے معصوم بندوں کو ہی آزماتا ہے انشا اللہ ہماری

اجالا کو اب خوشیاں ہی خوشیاں ملیں گی۔“ اماں جان نے آزدگی سے بت بنی بیٹھی اجالا کے سر پر دست شفقت رکھ کر یقین سے کہا تو حمید فاروقی نے بے اختیار کہا۔

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے اماں جان!“

”پاپا! میں آپ کے ساتھ ہی واپس جاؤں گی مجھے ان سب کی پریشانی کا باعث نہیں بننا۔“ اجالا نے کھڑے ہو کر سنجیدگی سے کہا تو وہ چاروں حیرت سے اسے دیکھنے لگے اس کے چہرہ پر گہری سنجیدگی اور یاسیت کے سائے لہرا رہے تھے۔

”لیکن بیٹا وہاں تمہاری ماں۔“ حمید فاروقی نے پریشان ہو کر کہا۔

”خیر ہے پاپا میں ان کے رویے کی عادی ہو چکی ہوں۔“

”لیکن میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔“

”تو پھر آپ مجھے دامن ہوٹل میں داخل کرادیں ویسے بھی میرے فائل ایئر کے ایگزامز ہونے والے ہیں میں ایگزامز سے فارغ ہو کر کوئی جاب کر لوں گی۔“ اجالا نے آن کی آن میں اپنا فیصلہ سنایا۔

”نہیں میری بیٹی جاب نہیں کرے گی میں صائمہ کو اس کے میکے بھیج دوں گا۔ اگر اب اس نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی تو آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے پاپا۔ آپ میری وجہ سے اپنا گھر کیوں برباد کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا کرنے سے نوید اور ولید کی شخصیت پر بھی برا اثر پڑے گا۔ جو محرومیاں میں نے جھیلی ہیں میں نہیں چاہتی کہ میرے بھائی بھی ان کے ستم سہیں آپ پلیز صائمہ آئی کو کچھ مت کہیے گا۔“ اجالا نے سنجیدگی سے کہا تو ان سب کی آنکھیں اس کے احساس اور ظرف کی بلندی کو دیکھتے ہوئے چھلک پڑی۔

”ٹھیک ہے بیٹا! ہم اکٹھے واپس جائیں گے۔“ حمید فاروقی نے اسے اپنے ساتھ لگا کر پریم لہجے میں کہا تو نفیس احمد نے نرمی سے کہا۔

”نہیں حمید بھائی ہم اجالا کو واپس نہیں جانے دیں گے یہ بارہ برس بعد ہمارے گھر آئی ہے اور مشکل ہے تو ہم اپنی بھانجی کو واپس کیسے جانے دے سکتے ہیں یہ اب ہمارے پاس ہی رہے گی۔“

”مگر آپ لوگ تو حج پر جا رہے ہیں اور بیٹیوں کے گھر اجالا کا رہنا مناسب نہیں ہوگا۔“ حمید

فاروقی نے کہا۔

”تو کیا ہوا ہمیں اپنے بیٹے پر اعتبار ہے اور اجالا پر بھی اجالا کو ایس اپنے ساتھ لے جائے گا۔“ نفیس احمد نے سنجیدگی سے کہا۔

”ایسے کیسے لے جاسکتا ہے وہ اجالا کو۔“

”پاپا پلیز ختم کیجئے اس موضوع کو چلیں واپس۔“ اجالا نے بے بسی، دکھ اور شرمندگی کے احساس میں گھرتے ہوئے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”نہ اجالا بیٹا! اب واپس تو ہم تمہیں کہیں نہیں جانے دیں گے دھیال میں بہت رہ لیں تم اب دھیال میں رہو گی ساری عمر اور بہت محبت ملے گی یہاں تمہیں حمید میاں اجالا اب ہماری ہے تم بے فکر ہو جاؤ یہ ہماری ذمہ داری ہے۔“ اماں جان نے محبت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”لیکن اماں جان!“

”پہلے میری بات سن لو پھر اپنی سنانا۔“ اماں جان نے حمید فاروقی کی بات کاٹتے ہوئے کہا تو وہ لب بھینچ کر انہیں دیکھنے لگے۔

”اسبس سے تو تم مل ہی چکے ہو ماشا اللہ انجینئر ہے بہت بڑی کمپنی میں ملازم ہے اور کمپنی نے اسے گھر اور گاڑی بھی دے رکھی ہے اور باقی کے سارے خرچے مفت ہیں نہ کسی بل کا خرچہ ہے نہ میڈیکل اور سفر کا سب خرچہ کمپنی ادا کرتی ہے اور بچپس تیس ہزار ماہوار کما رہا ہے خیر سے اللہ اسے اور ترقی دے شادی اس نے اب تک کی نہیں ہے ہر بار ٹال جاتا ہے میرا خیال ہے کہ اسبس اور اجالا کی جوڑی بہتر ہی رہے گی کل جمعہ ہے مبارک دن ہے ہم ان دونوں کا نکاح کر دیتے ہیں اسبس اجالا کو اپنے ساتھ لیجائے گا جب ہم حج سے واپس آجائیں گے تو ولیمہ دھوم دھام سے کر لیں گے کیوں حمید میاں تمہیں یہ رشتہ منظور ہے۔“ اماں جان نے سنجیدگی سے نرمی سے کہا تو اجالا ہکا بکارہ گئی جبکہ حمید فاروقی کے چہرے پر سکون پھیل گیا نفیس احمد انجم بیگم بھی مسکرا دیں۔

”اماں جان! میرے لئے اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی کہ میں اپنی بیٹی کو محفوظ ہاتھوں میں پورے شرعی اور قانونی تقاضوں کے مطابق دے کر جاؤں گا اسبس ماشا اللہ بچپن سے ہی بہت مودب اور ذہین بچہ تھا اور جب میں بچی کو آپ کے حوالے کرنے ہی آیا ہوں تو اب یہ آپ کی بھی ذمہ داری ہے آپ کی بیٹی کی اولاد ہے آپ کی نواسی ہے آپ یقیناً اس کے لئے بہتر فیصلہ ہی

کریں گی۔“ حمید فاروقی نے خوش ہو کر کہا۔

”جیتے رہو اور نفیس اور دلہن تم دونوں کو تو کوئی اعتراض نہیں ہے نا اس رشتے پر میرے اس فیصلے پر۔“ اماں جان نے مسکراتے ہوئے ان دونوں سے پوچھا۔

”نہیں اماں جان! اجالا ہماری بھی تو بیٹی ہے ہمیں بھلا کیوں اعتراض ہوگا آپ نے بہت بروقت اور بہت مناسب فیصلہ کیا ہے ہمیں اجالا کی صورت میں اتنی حسین اتنی خوبصورت بہو اور بیٹی مل جائے گی، ہمیں اور کیا چاہیے ایس کے نصیب میں اجالا ہی لکھی تھی جیسی تو اب تک اس کی شادی نہیں ہوئی اسے یہ سر پر از یقیناً خوشی دے گا۔“ انجم نفیس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو اجالا گھبرا کر وہاں سے اٹھ کر باہر چلی گئی سب نے محبت سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

”پھر بھی آپ ایس سے اس کی مرضی ضرور معلوم کر لیں ہو سکتا ہے کہ اس کی پسند کچھ اور ہو۔“ حمید فاروقی نے احتیاط کے طور پر کہا۔

”ارے نہیں ایس بہت فرمانبردار ہے ہمارا کہا کبھی نہیں مالتا اور اس کی پسند اگر ہوتی تو ہمیں ضرور بتا دیتا، ہم تو خود پوچھ پوچھ کر تھک گئے خاندان بھری نظریں لگی ہیں ایس کے رشتے پر وہ بھی سب کو جانتا ہے مگر اس نے ہم سے تو کبھی کسی لڑکی کے لئے اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا پھر بھی تمہاری تسلی کے لئے ہم اس سے پوچھ لیں گے۔“ اماں جان نے مسکراتے ہوئے بتایا تو وہ ایس کی خوبیاں سن کر مطمئن ہو گئے۔

”شکر یہ اماں جان! آپ نے میری بڑی مشکل حل کر دی ہے۔“

”بیٹا اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں اور اجالا تو اس خاندان کا خون ہے۔“ اماں جان نے کہا۔

”اماں جان! یہ آپ کی محبت اور اعلیٰ ظرفی ہے کہ آپ نے اتنے برسوں بعد بھی مجھے غیریت کا احساس نہیں ہونے دیا میرے یہاں آنے کا مان رکھ کر آپ نے مجھے خرید لیا ہے میرے پاس آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔“ حمید فاروقی نے تشکر اور ممنونیت کے احساس سے لبریز لہجے میں کہا۔

”تو کیا خیال ہے پھر ڈکٹری لادوں۔“ نفیس احمد نے مذاق سے کہا تو وہ سب ہنس پڑے پھر اماں جان نے ان تینوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”چلو اب جلدی جلدی ضروری چیزیں خرید لو کل جمعہ ہے بازار جلدی بند ہو جائے گا بس گھر کے لوگ ہی شریک ہوں گے نکاح میں ویسے میں سب کو بلا لیں گے۔“

”یہ بھی اچھا ہے کہ بچیاں اور داماد بھی آئے ہوئے ہیں خاص اور قریبی رشتے دار تو یہی ہیں ناں۔“ نفیس احمد نے کہا تو اماں جان نے انجم نفیس سے کہا۔

”ہاں اور دہن تم نے ایس کی شادی کی تھوڑی بہت تیاری تو کر ہی رکھی ہے ناکپڑے اور زیور تو تیار ہیں اجالا کو بازار ساتھ لے جا کر مزید خریداری کر لو کپڑے جوتے اور ضرورت کی دوسری چیزیں خرید لینا۔“

”آپ فکر نہ کریں اماں جان! سب تیاری ہو جائے گی بس آپ دعا کریں کہ ایس اور اجالا ہمیشہ خوش اور آباد رہیں۔“ انجم نفیس بولیں۔

”آمین! اپنے بچوں کے لئے تو میں ہر پل دعا مانگتی ہوں۔“ اماں جان نے دل سے کہا تو سب نکاح کی تیاری کے لئے اٹھ گئے حمیرا میرا نے سنا تو وہ بھی بہت خوش ہوئیں ایس اپنے کسی دوست کی شادی کی مبارکباد دینے کے لئے اس کے گھر گیا ہوا تھا اور اس سارے معاملے سے بے خبر تھا۔ وہ سب اجالا کو شاپنگ کی غرض سے اس کے انکار کے باوجود اسے اپنے ساتھ بازار لے گئیں۔



رشید فاروقی اور حمیدہ بیگم کے تین بیٹے تھے سعید وحید اور حمید فاروقی سعید فاروقی کی شادی رشید فاروقی کی بھتیجی عشرت سے ہوئی تھی ان کے دو بیٹے تھے سہیل اور روحیل اور ایک بیٹی تھی عائشہ وحید فاروقی کی شادی حمیدہ بیگم نے اپنی بھتیجی کشور سے کی تھی ان کا ایک بیٹا سعد تھا اور تین بیٹیاں تھیں شاہانہ شبانہ اور عمرانہ حمید فاروقی، رشید فاروقی اور حمیدہ بیگم کے سب سے چھوٹے اور لاڈلے بیٹے تھے ان کی شادی رشید فاروقی نے اپنے دیرینہ دوست احمد علی کی بیٹی غزالہ احمد سے کر دی انہیں شادی کے ایک سال بعد اللہ تعالیٰ نے اجالا جیسی پیاری خوبصورت اور صحت مند بیٹی سے نوازا اس کی اجلی اجلی رنگت کے باعث غزالہ اور حمیدہ فاروقی نے اسے اجالا کہہ کر پکارا تو رشید فاروقی اور حمیدہ بیگم نے بچی کا نام ”اجالا“ رکھ دینے کا مشورہ دیا اور یوں وہ اجالا کہلائی جانے لگی مگر اجالا کی زندگی میں اجالا زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکا وہ گیارہ سال کی تھی تو غزالہ دوسری بار امید

سے ہوئیں سب ہی خوش تھے کہ اجالا کا ایک اور بہن یا بھائی آ جائے گا تو وہ اکیلی نہیں رہے گی مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا ڈیوری کے وقت غزالہ اور بچہ دونوں ہی انتقال کر گئے اجالا اور حمید فاروقی کی زندگی میں تو اندھیرا چھا گیا ”رشید محل“ میں صف ماتم بچھ گئی غزالہ کے میکے میں الگ سوگ کا عالم تھا سب نے خود کو سنبھال لیا تھا مگر ”اجالا“ ہر وقت ماں کو یاد کر کے رویا کرتی اس کی ثانی نانا نے ماموں مامی نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کی بات کی تو حمید فاروقی نے منع کر دیا یہ کہہ کر کہ اجالا کی ماں مری ہے اس کا باپ ابھی زندہ ہے اور باپ کے ہوتے ہوئے اجالا بے گھر ہو جائے ایسا نہیں ہو سکتا۔

وہ سب ان کی بات سمجھ کر اجالا سے مل کر واپس بہاول پور چلے گئے غزالہ کے ایک ہی بھائی تھے نفیس احمد ان کی بیوی انجم بہت اچھی اور ہمدرد ملنسار خاتون تھیں ان کے بھی تین بچے تھے بڑا بیٹا ایس اور پھر حمیر اور سمیرا دو بیٹیاں تھیں اجالا سے ان کا فون پر رابطہ ہوتا تو وہ پھر سے ماں کو یاد کر کے رونے لگتی اس کی تائیاں اسے کڑے تیوروں سے گھورنے لگیں تھیں جو ماں کے بغیر ان کی نظر میں بے وارث ہو کر رہ گئی تھی۔ چونکہ سب لوگ اکٹھے رہتے تھے۔ اس لئے ہر روز کا سامنا تھا ابھی بھی بہاول پور سے صابرہ بیگم اجالا کی نانی کا فون آیا تھا۔ تو وہ ان سے اپنی ماں کی باتیں کرتے ہوئے رو پڑی تھی عشرت بیگم کا وہاں سے گزر رہا تو اسے غصے سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

”یہ تم کیا ہر وقت ٹسوے بہاتی رہتی ہو بہت سے بچوں کی مائیں مرتی ہیں ایک تمہاری اکیلی کی ماں تو نہیں مری جو چار مہینے گزر جانے کے باوجود پہلے دن کا سا سوگ ڈال رکھا ہے بند کرو یہ رونا دھونا نحوست مت پھیلاؤ گھر میں۔“

”امی رونے دیں اجالا کو اس کی امی فوت ہوئی ہیں جب آپ فوت ہوں گی تب میں بھی تو روؤں گی نا۔“ سہیل نے فٹ بال اچھالتے ہوئے ان سے کہا۔

”کم بخت ماں کے مرنے کا انتظار کر رہا ہے تو۔“ عشرت بیگم نے اس کے سر پر تھپڑ جڑ دیا۔

”آپ ہی تو ابھی کہہ رہی تھیں کہ سب کی مائیں مرتی ہیں آپ بھی تو میری ماں ہیں ناں آپ کبھی نہیں مریں گی کیا؟“ سہیل نے معصومیت سے پوچھا۔

”چپ ہو جا کم بخت ماں کے مرنے کی باتیں کرتا ہے شرم نہیں آتی تجھے چل بھاگ یہاں سے۔“ عشرت بیگم نے اسے کان سے پکڑ کر دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے غصے سے کہا تو وہ

ہسنے لگا۔

”میں تو اجالا کے ساتھ بھاگوں گا۔“ سہیل نے ماں کو چڑانے کے لئے شرارت سے کہا۔

”اے لوہارے ابھی سے یہ رنگ ہیں تمہارے تو بڑے ہو کر تو تم خوب خاندان کا نام اونچا کرو گے اس بالشت بھر کی لڑکی سے بڑی ہمدردی ہو رہی ہے تمہیں۔“

”ظاہر ہے امی اجالا کی ماں کا انتقال ہوا ہے ہمدردی تو ہوگی ہی۔“ سہیل نے اجالا کو دیکھتے ہوئے کہا جو چچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

”سہیل، چل جا اپنے کمرے میں اور پڑھ تیرا داغ میں وہیں آ کر درست کرتی ہوں یہ لڑکی رورو کر سب کی ہمدردیاں سمیٹنے میں لگی ہے چل ری بند کر یہ رونا۔“ عشرت بیگم نے سہیل کے ساتھ ساتھ اجالا کی بھی خبر لے ڈالی۔

”عشرت یہ کیا طریقہ ہے ارے تمہیں کیا کہتی ہے یہ بن ماں کی بچی بجائے اس کے کہ تم اس سے ہمدردی کرو میٹھا بول بولوا اسے اپنے سینے سے لگاؤ التام اسے ڈانٹ پھٹکا رہی ہو“ حمیدہ بیگم جنہیں سب بی جان کہتے تھے اپنے کمرے سے باہر نکلیں تو انہیں اجالا پر برستے دیکھ کر تڑپ کر اجالا کی طرف بڑھیں اور اسے اپنے ساتھ لگا کر بولیں۔

”ہونہہ! آج ہم اسے اپنے سینے سے لگالیں کل کو یہی ہمارے سینے پہ مونگ دے گی ابھی سے میرے بیٹوں کی ہمدردیاں سمیٹ رہی ہے بڑی ہو کے نجانے کیا لکھن ہوں گے اس کے۔“

”بہو زبان کو لگا دو۔“ آغا جان رشید فاروقی بھی وہاں آن دھمکے اور عشرت بیگم کی بات سن کر گرجدار لہجے میں بولے تو وہ سہم کنیں اجالا دوڑ کر آغا جان کے سینے سے لگ گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔

”موصوم بچی کے ساتھ اس قسم کی گفتگو کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے تمہیں بچے ایک دوسرے سے ہمدردی اور محبت کرتے ہی ہیں تم ابھی سے غلط باتیں سوچنے لگیں آج تو تم نے اجالا کو برا کہا ہے مگر دوبارہ یہ غلطی مت کرنا کیونکہ یہ گھر جتنا تمہارا اور تمہارے بچوں کا ہے اتنا ہی اجالا کا بھی ہے ابھی اس کا باپ اور دادا زندہ ہے اس کی حق تلفی کرنے کا سوچنا بھی مت ہمارے جیتے جی یہ لاوارث اور یتیم نہیں ہو سکتی سنا تم نے۔“

”جی آغا جان!“ عشرت بیگم نے شرمندگی اور خوف سے کانپتی آواز میں کہا سب گھر

والے ان کی آوازیں سن کر وہاں جمع ہو گئے تھے اور سارا معاملہ دیکھ کر سن کر محتاط ہونے کا اشارہ کر رہے تھے ایک دوسرے کو۔

”تم سب بھی کان کھول کر سن لو اجالا سے اگر کسی نے خواہ مخواہ کی دشمنی کرنے کی کوشش کی تو سب سے پہلے اس کا بوریا بستر گول ہو گا یہ وہی اجالا ہے غزالہ کے مرنے سے اجالا نہیں بدل گئی تم لوگ بدل گئے اپنے تو غم بانٹتے ہیں اور تم لوگ اس کے غم بانٹنے کی بجائے اسے غم دینے اور ڈانٹنے دھتکارنے پر کم بستہ ہو بڑے افسوس کی بات ہے کیا لیتی ہے یہ معصوم تم سے اپنے باپ کا کھاتی ہے اپنے باپ دادا کے گھر میں رہتی ہے تم کیا بوجھ ہے اس کا جو چلانے لگتے ہو آئندہ میں اس قسم کی بات نہ سنوں۔“ آغا خان نے سب کو دیکھتے ہوئے بہت رعب اور حاکمانہ لہجے میں کہا تو سب نے سر جھکا لئے آغا جان (رشید فاروقی) سے ان کے غصے سے بھی ڈرتے تھے لہذا ان کے حکم کے سامنے کسی کو انکار کی جرأت نہیں ہوئی اور عشرت بیگم کو ناچا جتے ہوئے بھی اپنا رویہ مثبت ظاہر کرنا پڑا۔ ابھی غزالہ کی وفات کو ایک سال بھی نہیں گزرا تھا۔ کہ ”رشید محل“ میں حمید فاروقی کی دوسری شادی کا قصہ چھڑ گیا اور یہ قصہ عشرت بیگم اور کشور بیگم نے چھیڑا تھا وہ چاہتی تھیں کہ آغا جان اور بی بی جان نے اجالا کی ذمہ داری جو انہیں سوپ دی ہے اس سے چھٹکارا مل جائے اور اس کی سوتیلی ماں اسے خوب کس کر رکھے تاکہ اس کے بیٹوں کی طرف اس کا دھیان بھی نہ جائے اور وہ نالائق بدتمیز اور گستاخ بھی کہلائے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اجالا اپنی ماں کی زندگی میں بہت ناز و نعم سے رہی تھی اور اس کی وفات کے بعد اسے آغا جان اور بی بی جان نے اپنی آغوش محبت و شفقت میں سمیٹ لیا تھا اور اس کا ہر طرح سے خیال رکھ رہے تھے۔ حمید فاروقی اپنی ٹیکسٹائل مل لگانے میں مصروف تھے مگر گھر آ کر وہ کچھ دیر اجالا کے پاس ضرور بیٹھتے تھے بظاہر عشرت بیگم اور کشور بیگم نے حمید فاروقی اور اجالا کی بہتری کے لئے یہ تجویز پیش کی تھی مگر اندر ہی اندر ان کے مقاصد کچھ اور تھے عشرت بیگم نے اپنی کزن خالہ کی بیٹی صائمہ کو حمید فاروقی کے لئے مناسب قرار دیا تھا صائمہ بہت تیز طرار سن مانی کرنے والی اور فیشن ایبل لڑکی تھی بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد چار سال سے اچھے رشتے کے انتظار میں ابھی تک کنواری بیٹھی تھی ان کی منہ پھٹ طبیعت کی وجہ سے بھی اس کی شادی نہیں ہو پا رہی تھی اور وہ دولت مند شخص کی بیوی بننے کے خواب بھی دیکھ رہی تھی حمید فاروقی دولت مند بھی تھے اور مردانہ وجاہت کے مالک بھی لہذا ان کے رشتے سے

انہیں کیونکر انکار ہو سکتا تھا جو نبی آغا جان اور بی جان نے اس رشتے کے لئے حامی بھری اور حمید فاروقی سے رضا مندی حاصل کر کے ان کے گھر رشتہ لے کر گئے وہاں سے فوراً ”ہاں“ ہو گئی اجالا کے ساتھ کیسا سلوک کرنا ہے یہ صائمہ بیگم تو سوچ ہی چکی تھیں مگر عشرت بیگم نے بھی انہیں خوب پٹی پڑھائی تھی۔

☆☆☆

”بی جان! پاپا دوسری شادی کیوں کر رہے ہیں“ جس شام وہ صائمہ اور حمید فاروقی کو شادی کی تاریخ طے کر کے آئے اجالا نے فکرمندی سے بی جان کے پاس آ کر پوچھا تو بی جان نے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں بھر کر پیار سے جواب دیا۔

”تاکہ تمہیں ماں کا پیار مل سکے چندا۔“

”ماں کا پیار تو سگی ماں دیتی ہے سوتیلی ماں تو مارتی ہے بی جان۔“

”ارے نہیں یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟“ بی جان نے فوراً اس کی بات کی نفی کرتے ہوئے پوچھا تو اس نے معصومیت سے بتایا۔

”تائی اماں نے کہا تھا کہ سوتیلی ماں مارتی ہے بہت تنگ کرتی ہے۔“

”دماغ خراب ہے عشرت کا خود ہی حمید کی دوسری شادی کروانے پر زور دیتی رہی ہے خود ہی رشتہ بھی ڈھونڈا اور اب بچی کے ذہن میں غلط باتیں ڈال کر اسے آنے والی سے متنفر کر رہی ہے کہیں یہ بھی اس کی کوئی چال نہیں ہے؟“ بی جان نے غصے سے جھلا کر خود کلامی کی اسی وقت آغا جان نے کمرے میں قدم رکھا۔

”ہو سکتا ہے کہ تمہارا خیال درست ہو کیونکہ اس سارے معاملے میں عشرت ہی پیش پیش رہی ہے ایک طرف تو وہ اچھی بن کر دیور کا گھر آباد کروا رہی ہے اور دوسری طرف اس معصوم بچی کے ذہن میں دوسری ماں کے متعلق غلط باتیں ڈال رہی ہے اجالا سے تو خدا واسطے کا بیر ہے بڑی بہو کو۔“

”آپ ہی کی بھتیجی ہے۔“

”اسی بات کا تو دکھ ہے مجھے۔“ آغا جان نے بستر پر بیٹھے ہوئے تاسف سے کہا۔

”ماں باپ تو ایسے نہیں ہیں اس کے نجانے وہ کس پر گئی ہے؟“

”وہ تو شروع سے ہی غزالہ سے جلتی تھی۔ وہ اس سے زیادہ حسین و جمیل تھی۔ اللہ جنت نصیب کرے اسے اور ماشا اللہ اجالا تو اپنی ماں اور باپ دونوں کے حسن کا پر تو ہے۔ بڑی ہو کے تو یہ اور زیادہ نکھر جائے گی۔“ بی جان نے اجالا کو اپنے سینے سے لگا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”مجھے لگتا ہے کہ عشرت اور کشور صائمہ کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانا چاہتی ہیں جو کام وہ خود نہیں کر سکیں وہ صائمہ کے ذریعے کروانا چاہتی ہیں مجھے معید (چھوٹے بھائی) عشرت بیگم کے والد نے آج ہی کہا ہے کہ صائمہ سے کیوں رشتہ جوڑ رہے ہیں وہ مزاج کی تیز ہے اور خود مختار اور آزاد زندگی کے خواب دیکھتی ہے انہیں اس رشتے کی خبر ہی نہ ہونے دی عشرت نے اب تو کچھ ہو بھی نہیں سکتا بات پورے خاندان میں پھیل چکی ہے کہ ہم نے حمید کا رشتہ صائمہ سے طے کر دیا ہے اب اگر رشتہ توڑیں گے تو خاندان والوں کی ناراضگی الگ باتیں الگ لہذا ہمیں تو اب یہ رشتہ ہر صورت نبھانا ہی پڑے گا آگے حمید اور اجالا کی قسمت۔“ آغا جان نے سنجیدگی سے کہا۔

”عشرت اور کشور نے تو ایسے طریقے سے حمید کی شادی کی بات کی تھی کہ ہمیں قائل ہونا پڑا ورنہ حمید کب دوسری شادی کرنا چاہ رہا تھا وہ تو میں نے اور عشرت نے اسے سمجھایا عشرت نے اسے اولاد دینے کے لئے اپنے نام کو آگے چلانے کے لئے شادی کرنے پر آمادہ کر لیا وہ بھی اجالا کی بہتر تعلیم و تربیت کے لئے ماں کے پیار کی کمی دور کرنے کے لئے اس شادی پر راضی ہوا ہے ورنہ وہ تو آج بھی غزالہ کو دل میں بسائے بیٹھا ہے۔“ بی جان نے نرم مگر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”ہاں یہ تو سچ ہے غزالہ بیٹی تھی بہت خدمت گزار اور نیک بچی اللہ اسے جنت نصیب کرے۔“ آغا جان نے سرد آہ بھر کر کہا۔

”آمین!“ بی جان نے بھیکتی آواز میں کہا اور اجالا کی پیشانی چوم لی اور یوں غزالہ کی پہلی برسی کے ایک ماہ بعد حمید فاروقی اور صائمہ بیگم رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے شروع کے چند دن تو بہت خوشگوار گزرے اجالا بھی اپنی نئی ماں کو دیکھ دیکھ کر اس کی سچ دھج دیکھ کر خوش ہوتی رہی مگر اسے اپنی مرحومہ ماں بھی پل پل یاد آتی رہی۔

”اگر میری مئی اللہ میاں کے پاس نہ جاتیں تو صائمہ آنٹی بھی پاپا کے پاس نہ آتیں تاہی اماں کہتی ہیں صائمہ آنٹی تمہاری سوتیلی ماں ہے اور تم سے پیار نہیں کریں گی تم بھی انہیں اپنی ماں

کی جگہ مت دینا پھر پاپا نے انہیں میری ماں کی جگہ کیوں دی ہے؟“ اجالا کے ننھے ذہن میں اس قسم کی باتیں سوچیں گھر کر چکی تھیں وہ دیکھ رہی تھی ان دنوں پاپا اسے بھی کم توجہ دینے لگے ہیں اور صائمہ آنٹی کے ساتھ روز کبھی لاٹنگ ڈرائیو پر جا رہے ہیں تو کبھی دعوتوں میں اور اسے ساتھ چلنے کے لئے بھی نہیں کہہ رہے تو اس کا دل دکھ سے اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں اور وہ اپنی ماں کی تصویر کو سینے سے لگا کر رونے لگتی۔

حمید فاروقی، صائمہ کو لے کر ہنی مون منانے مری اور ایبٹ آباد جا رہے تھے اجالا نے سنا تو فوراً ان کے پاس چلی اور خوشی خوشی پوچھنے لگی۔

”پاپا، میں بھی آپ کے ساتھ سیر کے لئے جاؤں گی ناں۔“
 ”ہاں ہاں کیوں نہیں ہماری بیٹی بھی ہمارے ساتھ جائے گی۔“ حمید فاروقی نے محبت سے مسکراتے ہوئے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

”بیٹی کو ساتھ لے جانا ہے تو بیوی کو ساتھ لے جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ صائمہ نے غصے سے کہا تو اجالا کے چہرے پر سایہ سالہرا گیا۔

”صائمہ، ارے بھئی بچی ہے اس کا بھی دل بہل جائے گا۔“

”اس کا دل بہلانے کا خیال ہے آپ کو میرے دل کا کوئی خیال نہیں ہے ایک تو ہر وقت گھر میں سب کی آنکھیں ہم پر جمی رہتی ہیں اب ہنی مون بھی ہم اکیلے نہیں مناسکتے۔“ صائمہ نے غصے سے کہا۔

”افوہ، صائمہ تم کیوں بات کا بٹنگلڑ بنا رہی ہو اجالا بچی ہے یہ ہمیں تنگ تھوڑی کر کے گی وہاں۔“ حمید فاروقی نے انہیں نرمی سے سمجھانا چاہا۔

”تنگ نہیں کرے گی مگر سر پہ تو سوار رہے گی نا ہم کیا خاک انجوائے کر سکیں گے آپ کو اسی کی فکر لگی رہے گی آپ اسے ہی لے جائیں میں نہیں جا رہی آپ کے ساتھ شادی میری ہوئی ہے اور ہنی مون“ پر بیٹی کو ساتھ لے جایا جا رہا ہے۔“ صائمہ نے غصے سے اپنی چوڑیاں اتارتے ہوئے کہا تو انہوں نے سوچا کہ صائمہ سے شادی کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے وہ اجالا کے لئے نرم گوشہ نہیں رکھتی تھیں کجا کہ وہ اسے ماں کا پیار دیتیں۔ وہ بے بسی سے اجالا کو دیکھنے لگے تو وہ معصومیت سے بولی۔

”پاپا! آپ آنٹی کو اپنے ساتھ لے جائیں میں نے تو مری آپ کے اور مری کے ساتھ دیکھ رکھا ہے نا آنٹی کو بھی مری دکھالائیں میں پھر کبھی چلی جاؤں گی۔“

”بیٹا! آئی ایم سوری۔“ انہوں نے اسے اپنے سینے سے لگا کر پیار کیا اور دوسرے دن وہ صائمہ کے ساتھ مری اور ایبٹ آباد کی سیر کے لئے چلے گئے۔

”اجالا بیٹا تم اکیلی بیٹھی ہو کیا ہوا پاپا یاد آ رہے ہیں؟“ عشرت بیگم نے اسے لان میں گم صم اور اکیلے بیٹھے دیکھ کر بڑی نرمی سے پوچھا۔

”جی تائی اماں، پاپا نے وہاں جا کر مجھے فون بھی نہیں کیا۔“ وہ افسردگی سے بولی۔

”فون کریں گے بھی کیوں تمہاری سوتیلی ماں نے انہیں منع کر دیا ہو گا وہ تمہارے پاپا کو تم سے چھین رہی ہیں تم سے نفرت کرتی ہیں صائمہ بیگم ورنہ تمہیں اپنے ساتھ جانے سے منع تھوڑی کرتیں وہ تمہارا خیال نہیں کرتیں تم بھی ان کا خیال مت کرنا اچھا۔“ عشرت بیگم نے اس کے کم سن ذہن میں اپنی سازش کا زہرا نڈیلے ہوئے مٹھاس بھرے لہجے میں کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا عشرت بیگم مسکراتی ہوئی اندر چلی گئیں۔

پندرہ دن بعد حمید فاروقی اور صائمہ واپس لوٹے تو دونوں کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے بی جان اور آغا جان تو دونوں کو خوش دیکھ کر خوش ہو گئے مگر اجالا کے دل پر کاری ضرب لگی تھی حمید فاروقی نے نہ تو اسے پہلے کی طرح والہانہ انداز میں پیار کیا تھا نہ ہی اسے اپنے پاس بٹھا کر اس کا حال پوچھا تھا بس ذرا سی دیر سب کے پاس بیٹھ کر دونوں اپنے کمرے میں چلے گئے تھے صائمہ نے تھکن کا بہانہ بنایا تھا اور حمید فاروقی نے بھی ان کی پیروی کی تھی مری سے وہ اجالا کے لئے کچھ شاپنگ کر کے لائے تھے وہ بیگ وہ جاتے ہوئے اس کے پاس رکھ گئے مگر اجالا نے بیگ کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

”بی جان! میرے پاپا کتنے بدل گئے ہیں وہ صائمہ آنٹی کی وجہ سے مجھے پیار نہیں کر کے گئے۔“ اجالا نے بھیگتے لہجے میں کہا تو عشرت بیگم اور کشور بیگم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیں جبکہ بی جان کا دل ڈوب سا گیا۔

”ارے نہیں چندا! تمہارے پاپا تم سے بہت پیار کرتے ہیں وہ تھکے ہوئے تھے نا اس لئے سونے چلے گئے دیکھو اگر وہ تم سے پیار نہ کرتے تو تمہارے لئے یہ چیزیں کیوں خرید کر لاتے۔“ بی

جان نے اسے محبت سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”چیزیں تو چیزیں ہوتی ہیں پاپا کا پیار تو نہیں ہوتیں بی جان اور مجھے چیزیں نہیں چاہئیں مجھے پاپا کا پیار چاہیے جو انہوں نے صائمہ آنٹی کو دے دیا ہے صائمہ آنٹی نے میرے پاپا کو مجھ سے چھین لیا ہے۔“ وہ بھکتی آواز میں بولی۔

”یہ کس نے کہہ دیا تم سے“ بی جان نے اسے لپک کر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے پوچھا۔
 ”تائی اماں نے کہا ہے۔“ اس نے روتے ہوئے جواب دیا تو عشرت بیگم کے چہرے کا رنگ اڑ گیا بی جان نے شعلہ باز نظروں سے انہیں دیکھا۔

”کیوں عشرت یہ تم بچی کو کیا الٹی سیدھی پٹیاں پڑھاتی رہتی ہو کیوں اس کے دل و دماغ میں باپ اور ماں کے متعلق غلط خیال پیدا کر رہی ہو اسی لیے دیور کا گھر بسایا تھا تاکہ یہ تماشا کر سکو۔“ بی جان نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”بی جان! مجھے الزام نہ دیں میں تو نیکی کر کے پھنس گئی ہوں یہ خود نہیں دیکھ رہی کہ صائمہ اور حمید اس کے ساتھ کس طرح بے اعتنائی برت کر گئے ہیں یہ تو باپ کا پیار دیکھنے کی عادی تھی اسے تو باپ کی ذرا سی عدم توجہ بھی زیادہ محسوس ہوگی آپ صائمہ اور حمید کو سمجھائیں مجھے کیوں ان کے معاملے میں گھسیٹ رہی ہیں؟“ عشرت بیگم نے تپ کر کہا۔

”اس لئے کہ یہ معاملہ تم نے اٹھایا تھا وہ اگر غفلت برت رہے ہیں تو کم از کم تو اس گھر کی بڑی بہو ہونے کے ناطے پیار محبت کے ساتھ ایک کر کے رہنے کی تلقین کرو ورنہ تاں تو غلط فہمیاں پیدا کرنے چلی ہو۔“ بی جان نے نرم مگر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”ہاں ہاں میں ہی فساد کی جڑ ہوں مجھے ہی کاٹ ڈالیں آپ تب سب کچھ ہرا بھرا ہو جائے گا میں تو اچھا بھی کروں گی تو بری ہی بنوں گی۔“ عشرت بیگم نے فافٹ مگر چمچے کے آنسو بہاتے ہوئے کہا اور اٹھ کر چلی گئیں۔

”بی جان! آپ میری وجہ سے کسی کو کچھ مت کہا کریں میں اب کسی سے کوئی شکایت نہیں کروں گی پاپا مجھ سے پیار کریں یا نہ کریں میں کچھ نہیں کہوں گی بس گھر میں کوئی لڑے جھگڑے نہ“
 اجالا نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا اور بی جان کو حیرت میں ڈال دیا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا اس نے حمید فاروقی سے پہلے کی طرح توجہ اور پیار کی طلب کو اپنے دل

میں دبا لیا باپ کی محبت میں کمی کی شکایت زبان پر نہ لائی آغا جان اور بی جان تو اس کا ہر طرح سے خیال رکھ رہے تھے اجالا بھی دوسرے بچوں کے ساتھ سکول جاتی وہ بہت ذہین تھی اس نے اپنی تمام تر توجہ اپنی تعلیم پر مرکوز کر لی تھی حمید فاروقی سے نہ وہ اب کوئی فرمائش کرتی تھی نہ شکایت حمید فاروقی فیکٹری سے واپسی پر خود ہی اس کے لئے کھانے پینے کی چیزیں لے آتے یا کبھی شاپنگ کر لاتے بہت ہوا تو اسے ہفتے میں ایک بار صائمہ کے ساتھ ہی باہر سیر کرانے لے جاتے اس پر صائمہ بیگم کو برا لگتا کہ وہ ان کے ساتھ کیوں آئی ہے گھر میں صائمہ کو اجالا سے کوئی سروکار نہیں تھا اس نے کیا کھایا کیا پہنا کب سوئی کب جاگی؟ سکول کتنے بجے گئی واپس کب آئی ہوم ورک کیا یا نہیں کیا صائمہ بیگم کو ان سارے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ خود جب دل چاہتا میسکے چلی جاتیں شاپنگ پر جاتیں یا اپنی سہیلیوں کے گھر چلی جاتیں بی جان سے پوچھنا تو درکنار انہیں بتانا بھی پسند نہیں کرتیں تھیں کہ وہ کہاں جا رہی ہیں کیوں جا رہی ہیں اور کتنی دیر میں واپس آئیں گی؟ حالانکہ ”رشید محل“ میں ان معاملات میں بی جان کی اجازت ضروری سمجھی جاتی تھی اب تو عشرت بیگم بھی بی جان سے نظریں چراتی پھرتی تھیں آخر یہ رشتہ تو انہوں نے ہی کرایا تھا برا ان کا میکہ بھی بنا تھا صائمہ کے طور پر لیتے تو پہلے سے زیادہ بے باک ہو گئے تھے فیشن کرنا اور گھر سے باہر گھومنا پھر نا ان کا محبوب مشغلہ تھا اجالا کے دل میں صائمہ بیگم کے لئے عزت اور احترام کا جو جذبہ شروع دنوں میں موجود تھا وہ ان کے سرد اور سخت رویے کے باعث ختم ہو گیا تھا ان کے ہوتے ہوئے اسے اپنے پاپا بہت دور دکھائی دیتے تھے وقت تیزی سے گزر رہا تھا شادی کے پہلے سال اللہ تعالیٰ نے صائمہ بیگم کو ایک خوبصورت اور صحت مند بیٹے سے نوازا تو وہ اور بھی مغرور ہو گئیں سب ہی خوش تھے حمید فاروقی اور اجالا بھی خوش تھی ننھے بھائی کے آنے سے بچے کا نام آغا جان نے ولید فاروقی رکھا گھر میں خوب جشن منایا گیا صائمہ بیگم تو شوہر کو وارث دے کر بہت اترائی اترائی پھر رہی تھیں حمید فاروقی نے بھی انہیں اس خوشی میں سونے کے کنگن بنوا کر دیئے اجالا کو سونے کا لاکٹ بنوا کر دیا جس پر اس کے نام کا پہلا حرف ”L“ کندہ تھا وہ یہ لاکٹ پہن کر بہت خوش ہوئی دو ماہ بعد صائمہ بیگم کی پرانی سرگرمیاں پھر سے شروع ہو گئیں ولید کو وہ اجالا کے پاس صرف اس لئے چھوڑ جاتیں کہ وہ اس کا خیال رکھے گی ورنہ تو وہ اس کو ولید کے قریب آنے سے بھی منع کرتی تھیں آیا اور اجالا ولید کو سنبھالتے اور وہ گھر سے باہر گھوما کرتیں ایک دن ولید کو بخار ہو گیا تو

صائمہ بیگم کے گھر آتے ہی بی جان نے انہیں جالیا۔

”چھوٹی بہو تمہیں کچھ ہوش نہیں ہے کہ ولید بخار میں پھنک رہا ہے۔“

”تو آپ سب لوگ کس لئے ہیں صرف دور سے نظارہ کرنے اور محبت جتانے کے لئے۔“

صائمہ بیگم نے لا پرواہی سے کہا۔

”تم کیسی ماں ہو کہ تم سے اپنا بچہ نہیں سنبھالا جاتا اور یہ تم کس کی اجازت سے گھر سے باہر جاتی ہو کبھی ہم سے یا شوہر سے اجازت لی ہے تم نے شریف زادیوں کے یہ طور طریقے نہیں ہوتے یہاں ویسے ہی رہو جیسے سب رہتے ہیں۔“ بی جان نے غصیلے اور رعب دار لہجے میں کہا۔

”معاف کیجئے گا بی جان میں اس گھر میں بیاہ کر لائی گئی ہوں بھگا کر نہیں لائی گئی جو آپ کے ان فرسودہ اصولوں اور احکامات کی پابندی کروں میری اپنی زندگی ہے اور میں اپنی زندگی اپنے طریقے سے گزارنے کی عادی ہوں مجھے آپ کے مشوروں اور نصیحتوں کی ضرورت نہیں ہے۔“ صائمہ بیگم نے بہت بداخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں تم جو چاہو دوسروں کو کہو تم بیاہ کر آئی ہو تو ہم کیا بھگا کر لائی گئی ہیں سوچ سمجھ کر بات کیا کرو صائمہ بی بی جانتے ہیں ہم کہ تم کتنی پاک دامن ہو سارا سارا دن گھر سے باہر کھڑے اڑتی پھرتی ہو نہ شوہر کی فکر ہے نہ بچوں کی پرواہ نہ گھر کی کوئی ذمہ داری قبول کی ہے ایسے لکھن تو کنواری دوشیزاؤں کے بھی نہیں ہوتے جیسے تمہارے ہیں۔“ عشرت بیگم کو ان کی بات نے سگا کر رکھ دیا تھا وہ شعلہ بار نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے غصیلے اور تیز لہجے میں بولیں۔

”آپ تو سدا کی حاسد ہیں پہلے اجالا کی ماں کے حسن سے جلتی تھیں وہ بے چاری تو ملک عدم سدھا رہ گئی اب آپ کو میں بری لگتی ہوں میرا حسن آپ سے برداشت نہیں ہو رہا اسی حسد میں جل جل کر راکھ ہو جائیں گی ایک دن۔“ صائمہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”جلیں اور راکھ ہوں ہمارے دشمن۔“ عشرت بیگم نے غصے سے کہا۔

”وہ تو پہلے ہی جلے جا رہے ہیں۔“ صائمہ معنی خیز انداز میں ہنسیں۔

”جاؤ جا کر اپنا بچہ سنبھالو۔“ بی جان نے تاسف سے صائمہ کو دیکھا۔

”اور ہاں آئندہ سے اپنے شوہر اور بچے کے کام خود کرنا ہمیں کوئی شوق نہیں ہے نیکیاں

کمانے کا۔“ کشور بیگم نے بھی زبان کو حرکت دی۔

”ہونہہ، کون سے کام کرتی ہیں آپ چار چار تو ملازمائیں موجود ہیں گھر میں وہ کیا مفت کی روٹیاں توڑتی ہیں کام ملازمائیں کرتی ہیں نمبر آپ اپنے بنانا چاہتی ہیں۔“ صائمہ نے بدتمیزی سے کہا۔

”سن رہی ہیں بی جان آپ یہ کس قدر بد لحاظ اور منہ پھٹ عورت ہے۔“ کشور بیگم نے بی جان کی طرف شکایتی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”دیکھ رہی ہوں ابھی تو نجانے اور کیا کچھ دیکھنا پڑے گا۔“ بی بی جان نے دکھ سے کہا۔
 ”تو مت دیکھیے گا ویسے میں بھی اس قید خانے میں مزید نہیں رہ سکتی میں آج ہی حمید سے بات کروں گی کہ وہ علیحدہ گھر خرید لیں۔“

”گھر خریدے نہیں جاتے صائمہ بی بی گھر تو بنائے جاتے ہیں تمہاری اس حرکت سے اس گھر کی بنیادیں ضرور اہل جائیں گی۔“ بی جان نے دکھ سے کہا۔

”یہ میرا درد سہ نہیں ہے۔ میں اپنی مرضی سے جینا چاہتی ہوں۔ ہر عورت ایک علیحدہ گھر کا خواب دیکھتی ہے۔ میں ان کی طرح کنوئیں کا مینڈک بن کر نہیں رہنا چاہتی۔ یہ جی حضوری ادب آداب آپ کی بڑی بہوؤں کو ہی مبارک ہوں میں تو اب علیحدہ گھر ہی لوں گی اور اپنی مرضی سے رہوں گی۔“ صائمہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”تم سنبھالو گی علیحدہ گھر، گھر بنانے کے لئے گھر میں رہنا اور اسے سنوارنا بنانا پڑتا ہے جبکہ تمہیں تو اپنے بناؤ سنگھار سے ہی فرصت نہیں ہے یہاں تو ہم سنبھال لیتے ہیں ولید کو حمید کے کام ہو جاتے ہیں آرام سے وہاں گھر میں جائیں گی تو نانی یاد آ جائے گی بہو بیگم۔“ کشور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”نانی یاد آئے گی یاد دی مگر یہ طے ہے کہ آپ کی یاد مجھے ہرگز نہیں آئے گی میں علیحدہ بنگلہ خرید کر رہوں گی اور جلد یہاں سے چلی جاؤں گی۔“ صائمہ نے طنزیہ مسکراتے ہوئے کہا۔

”ارے جاؤ جاؤ ہماری طرف سے کل کی جاتی آج چلی جاؤ۔“ کشور بیگم نے کہا۔

”ہونہہ خس کم جہاں پاک۔“ عشرت بیگم نے بھی زہر اگلا۔

”آئی ولید رو رہا ہے آپ کو مس کر رہا ہے۔“ اسی وقت اجالا ولید کو گود میں لئے وہاں چلی آئی اور صائمہ بیگم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایک ذرا سا بچہ نہیں سنبھلتا تم سے اور ہاں بی جان!“ صائمہ اجالا سے بات کرتے کرتے بی جان کی طرف مڑیں۔

”اجالا میرے ساتھ نئے گھر میں نہیں جائے گی یہ یہیں رہے گی ”رشید محل“ میں۔“

”اس کی ماں تو تقدیر نے اس سے چھین لی اب اس کے باپ کو بھی تم اس سے جدا کر دینا چاہتی ہو کتنی سنگدل عورت ہو تم۔“ بی جان نے گہرے دکھ اور تاسف بھرے لہجے میں جواب دیا۔

”آپ کچھ بھی کہہ لیں میرے گھر میں اجالا کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی ہاں حمید کبھی کبھار آ کر اسے مل جایا کریں گے۔“ صائمہ نے ولید کو تھپکتے ہوئے کہا تو اجالا کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

”تو اب پاپا سے تھوڑی سی بھی ملاقات نہیں ہوا کرے گی وہ مجھ سے دور چلے جائیں گے۔“

اجالا نے دکھ سے سوچا۔

”بہت احسان کریں گے اپنی بیٹی پر حمید میاں! ارے جاؤ بہو جاؤ چھوٹی بہو ہونا باتیں بھی چھوٹی ہی کرو گی بڑی باتوں کے لئے دل بھی بڑا چاہیے ابھی ہم زندہ ہیں اجالا لاوارث نہیں ہے بہت جگہ ہے رشید محل میں اس کے لئے اور ہمارے دل میں بھی اس کے لئے بہت جگہ ہے تمہارا جو جی چاہے کرو مگر آج کے بعد اجالا کو اپنے شہر سے دور ہی رکھنا۔“ آغا جان نجائے تب سے ان کی باتیں سن رہے تھے اچانک پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گئے اور صائمہ کو دیکھتے ہوئے درشتی سے کہا۔

”ہونہہ۔“ صائمہ نے حقارت سے سر جھٹکا اور ولید کو لے کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

اور پھر حمید فاروقی کو صائمہ کے سامنے ہار ماننا پڑی ”رشید محل“ کے سکون کے لئے روز روز کے جھگڑے سے نجات پانے کے لئے انہیں علیحدہ بنگلہ خریدنا پڑا۔ اور اجالا کو دل پر پتھر رکھ کر خود سے الگ کرنا پڑا وہ جاتے وقت اجالا سے ملے تو وہ ان کے سینے سے لگ کر رو دی۔ اجالا کو ولید کے جانے کا دکھ بھی رلا رہا تھا۔ حمید فاروقی نے اس سے ہر ہفتے ملنے آنے اور روز فون کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

ان کے جانے پر اجالا بی جان کے گلے سے لگ کر بہت روئی لیکن جلد ہی اس نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ اسے اب اپنے پاپا کے بغیر ہی رہنا ہوگا اپنے ننھے منے بھائی سے دور رہنا ہوگا۔ صائمہ بیگم کو ذمہ داری اور گھر گرہستی کا بوجھ اٹھانے کا کوئی شوق نہ تھا مگر انہیں ”رشید محل“ والوں کی نظروں میں یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ علیحدہ گھر چلا سکتی ہیں اس لئے انہیں گھر سے باہر کی

سرگرمیوں کو کم کرنا پڑا حمید فاروقی نے پہلے روز ہی ان سے کہہ دیا تھا کہ!

”تمہاری خواہش اور ضد چرمیں نے الگ گھر خرید لیا ہے لیکن اگر تم نے ایک ذمہ دار گھر والی ماں اور بیوی ہونے کا ثبوت نہ دیا تو میں اپنے بیٹے کو لے کر واپس ”رشید محل“ چلا جاؤں گا تم بہت سنگدل عورت ہو تم نے میری بیٹی کو مجھ سے دور کر دیا ہے اور میں نے یہ کڑوا گھونٹ صرف اس لئے پیا ہے کہ میرے گھر والوں کا سکون برباد نہ ہو اور خاندان بھر میں ہمارا تماشا نہ بن جائے اگر تم نے یہاں بھی اپنی حرکتیں نہ چھوڑیں تو میں انتہائی قدم اٹھائے پر مجبور ہو جاؤں گا جس طرح اجالا ماں کے بغیر جی رہی ہے اسی طرح ولید بھی اپنی ماں کے بغیر جی سکتا ہے۔“

”آپ بے فکر رہیں آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“ صائمہ بیگم نے منہ بنا کر کہا۔

”شکایت ہونی بھی نہیں چاہیے یہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا“ حمید فاروقی نے سنجیدگی سے کہا تو وہ اندر سے سہم ہی گئی محض اپنی لا پرواہی اور غیر ذمہ دارانہ روش کے باعث خاندان میں تماشا تو وہ بھی نہیں بننا چاہتی تھیں حمید فاروقی کی وجہ سے وہ امیر شخص کی بیوی کہلاتی تھیں کھلا خرچ کرتی تھیں اپنی مرضی سے کھاتی پہنتی اور خریدتی تھیں انہیں اپنی تمام خواہشیں حمید فاروقی کی دولت کے ذریعے پوری کرنے کے مواقع میسر تھے سب سے بڑھ کر ان کے گھر والے اور سہیلیاں ان کی قسمت پر رشک کرتے تھے پھر بھلا وہ عزت و شوکت کیونکر گنوا دیتیں انہیں اپنی چند عادات اور خواہشات پر بند باندھنا پڑا اور اتنی ڈھیروں آسائشوں اور راحتوں کے عوض یہ سودا براہر گز نہیں تھا۔

حمید فاروقی ہر ویک اینڈ پر ”رشید محل“ اجالا سمیت سب سے ملنے کے لئے جاتے اور شام کو گھر لوٹتے دو چار بار تو صائمہ بیگم نے ان کا چھٹی کے دن ”رشید محل“ جانا برداشت کیا لیکن پھر بول ہی پڑیں۔

”ہفتے میں ایک دن چھٹی کا آتا ہے اور وہ بھی آپ ”رشید محل“ میں سلامیاں پیش کرنے چلے جاتے ہیں وہاں حاضری دینا ضروری ہے کیا؟“

”ہاں بہت ضروری ہے وہاں میرے ماں باپ بھائی بھابھیاں اور ان کے بچے رہتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں میری بیٹی رہتی ہے اب تم کیا چاہتی ہو کہ میں اپنی اکلوتی بیٹی سے بھی ملنا چھوڑ دوں۔“ حمید فاروقی نے سخت لہجے میں کہا۔

”میں نے یہ کب کہا ہے آخر میرا اور ولید کا بھی آپ پر کچھ حق ہے۔“

”پورا ہفتہ میں تم دونوں کے حق ہی ادا کرتا ہوں اگر چند گھنٹے میں اپنی بیٹی کے لئے نکال لیتا ہوں تو تمہیں اس پر اعتراض ہے یا در کھو صائمہ بیگم اجالا میری بیٹی ہے میں نے بڑوں کے کہنے پر تم سے صرف اس لئے شادی کی تھی تاکہ میری بیٹی کو ماں کا پیار مل سکے ورنہ مجھے شادی کی خواہش تھی نہ ہی ضرورت تم نے اجالا کو ماں کا پیار تو کیا دینا تھا تم نے تو اس سے اس کے باپ کا پیار بھی چھین لیا ہے ماں ہو کر اولاد کے درد سے اس کی ضرورت سے ناواقف ہو تم میں چاہوں تو اجالا کو آج ہی اس گھر میں لاسکتا ہوں۔ وہ بیٹی ہے میری اس گھر پر اس کا بھی اتنا ہی حق ہے۔ جتنا ولید کا ہے مگر تمہارے رویے کی بد صورتی سے بھی میں واقف ہوں اس لئے اپنی بچی کو یہاں نہیں لایا میں تو رشید محل جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا چاہو تو تم بھی میرے ساتھ چلی جایا کرو۔“ حمید فاروقی نے دو ٹوک اور غصیلے لہجے میں کہا وہ شپٹا گئیں۔

”مجھے کوئی شوق نہیں ہے وہاں جانے کا۔“

”تو ٹھیک ہے مجھے وہاں جانے سے روکنے کا شوق بھی ختم کر دو۔“ حمید فاروقی نے بے نیازی سے کہا اور رشید محل روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

”کیا بات ہے پاپا آپ کچھ پریشان اور چپ چپ سے ہیں؟“ اجالا نے انہیں دیکھتے ہوئے فکر مندی سے پوچھا تو وہ اسے اپنے ساتھ لگا کر محبت سے دریافت کرنے لگے۔

”کچھ نہیں بیٹا! تم بتاؤ یہاں خوش تو ہونا۔“

”آپ آ جاتے ہیں تو خوش ہو جاتی ہوں پاپا۔“

”اجالا بیٹا مجھے معاف کر دینا میں تمہارے ساتھ انصاف نہیں کر پار ہا مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہے لیکن میں کیا کروں بیٹا وہ عورت تمہیں اذیت تو دے سکتی ہے محبت نہیں دے سکتی اور میں اس کی اذیت سے بچانے کے لئے تمہیں وہاں نہیں لے جاسکتا۔“

”پاپا! آج کیا ہوا تھا؟“

”آج..... کچھ نہیں۔“

”بتائیں ناں پاپا! مجھے پتا ہے آئی نے آپ کو یہاں آنے سے روکا ہوگا پاپا آپ میری وجہ

سے اپنی زندگی میں خرابی مت پیدا کریں ہر ہفتے آنے کی بجائے مہینے میں ایک بار مجھ سے ملنے آ جایا کریں اس طرح صائمہ آنٹی آپ پر خفا نہیں ہوں گی۔“ اجالا نے نرم اور دھیسے لہجے میں کہا تو حمید فاروقی نے اپنی اس کشادہ دل با حوصلہ اور سمجھدار بیٹی کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر چوم لیا۔

”میری بیٹی! کاش صائمہ کا ظرف بھی اتنا بڑا ہوتا میں تو بڑوں کی بات مان کر پھنس گیا ہوں“ وہ اسے اپنے سینے سے لپٹا کر پریم اور بے چارگی سے پر لہجے میں بولے۔

”ایسا نہ کہیں پاپا آپ صائمہ آنٹی کے شوہر ان کے بیٹے کے باپ ہیں آپ کو انہوں نے پیارا سا بیٹا بھی تو دیا ہے نا آپ اپنے بیٹے کے لئے ان سے محبت اور عزت سے پیش آئیں مجھے ایشومت بنایا کریں جیسے وہ رہنا چاہتی ہیں ویسے ہی رہیں ان کے ساتھ۔“

”مگر بیٹا۔“

”پلیز پاپا! اس طرح کچھ حاصل نہیں ہو گا نہ میں آپ کے ساتھ رہ سکوں گی نہ آپ ان کے ساتھ خوش رہ سکیں گے جب ہمیں ایک دوسرے سے الگ ہی رہنا ہے تو یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم اپنی اپنی جگہ خوش رہیں اور اپنے ساتھ رہنے والوں کو بھی خوش رکھیں اور صائمہ آنٹی تو آپ کی شریک زندگی ہیں زندگی کے ساتھ تو خوشی خوشی اپنے ساتھ رکھنا چاہیے نا۔“ اجالا نے بہت سمجھداری سے سنجیدگی سے کہا تو وہ اسے دیکھ کر رہ گئے۔

”اجالا میری جان! میری بیٹی! اتنی سمجھداری کی باتیں تم نے کہاں سے سیکھی ہیں تم ایک دم اتنی بڑی کیسے ہو گئیں؟ وہ بھیکتی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے حیرت سے بھیکتے لہجے میں پوچھ رہے تھے۔“

”جن بیٹیوں کی مائیں مرجاتی ہیں ناں پاپا ان کو ایک دم سے بڑا ہونا ہی پڑتا ہے سمجھداری کا ثبوت دینا ہی پڑتا ہے ورنہ نا سچھی میں اپنا نقصان کر بیٹھتی ہیں میرے جیسی بیٹیاں۔“ اس نے پر نرم لہجے میں کہا۔

”اللہ تمہیں ہر نقصان سے ہر مصیبت سے محفوظ رکھے میری جان۔“ حمید فاروقی نے تڑپ کر اسے اپنے ساتھ لپٹا کر روتے ہوئے دل سے کہا۔

”آمین۔“ آغا جان کی آواز پر دونوں چونک گئے۔

”آغا جان آپ!“

”ہاں تمہیں تو فخر کرنا چاہیے حمید میاں کہ تمہاری بیٹی اتنی سمجھدار اور معاملہ فہم ہے یہ ہماری بھی بیٹی ہے۔ تم اس کی فکر مت کرو جب تک ہم زندہ ہیں۔ یہ اس گھر میں عزت اور محبت بھرے ماحول میں رہے گی صائمہ کو بھی کبھی نہ کبھی تو اوپر والا ہدایت دے ہی دے گا۔“ آغا جان نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا تو وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اٹھ گئے۔

شادی کا دوسرا سال تھا اور صائمہ بیگم کو اللہ تعالیٰ نے ایک اور بیٹے سے نوازا اب تو ان کا سر اور بھی تن گیا تھا حمید فاروقی نے بیٹا کا نام آغا جان کے مشورے سے نوید فاروقی رکھا اور نوید کی رسم عقیقہ کی تقریب میں رشید محل سے سب کو مدعو کیا گیا اجالا بھی نوید کو دیکھنے اور ولید سے ملنے کے لئے بہت بے تاب تھی وہ ان دونوں کے لئے تحائف لے کر ”حمید ولا“ آئی تھی آج صائمہ بیگم کو اجالا کا نوید اور ولید کے ساتھ کھیلنا بھی اچھا لگ رہا تھا پھر یوں ہوا کہ اجالا مہینے میں ایک یا دو بار حمید ولا نوید اور ولید سے ملنے جانے لگی وہ ان کے لئے ہمیشہ کھلونے لے کر جاتی وہ چاہتی تھی کہ اس کے بھائی اسے اپنی بہن کی حیثیت سے یاد رکھیں حمید فاروقی بھی یہی چاہتے تھے مہینے میں ایک بار وہ صائمہ اور بچوں کو رشید محل لے جاتے اب صائمہ بیگم کو اجالا سے کوئی خطرہ نہیں تھا ان کا خیال تھا کہ انہوں نے حمید فاروقی کو دو بیٹے پیدا کر دیئے ہیں جو ان کی ساری جائیداد کے وارث ہوں گے اور اجالا کون سا انہیں کچھ کہتی تھی سلام دعا کے بعد بھائیوں کے ساتھ کھیلنے لگتی۔

وقت گزرتا چلا گیا اجالا نے بی ایس سی کا امتحان فسط کلاس فسط پوزیشن میں پاس کیا تو آغا جان نے ”رشید محل“ کے کاغذات تیار کروائے اور اسے اپنے وکیل کے پاس لے گئے وہ ”رشید محل“ اجالا کے نام کر رہے تھے اجالا نے سنا تو حیران ہو کر پوچھا۔

”یہ کس لئے آغا جان؟“

”بھی تم نے اتنی شاندار کامیابی حاصل کی ہے تو اس کا تحفہ بھی شاندار ہونا چاہیے نا۔“

”مگر آغا جان! باقی لوگوں کو اعتراض ہوا تو۔“

”باقی لوگوں نے تمہاری فکر کی ہے جو تم ان کی فکر کر رہی ہو میں نے تو اپنی وصیت میں ”رشید محل“ اسی دن تمہارے نام لکھوا دیا تھا جس دن صائمہ حمید کو لے کر الگ ہو گئی تھی اب باقاعدہ کاغذی اور قانونی کارروائی کے ذریعے یہ گھر تمہارے نام کر رہا ہوں تاکہ کل جب میں نہ رہوں تو یہ لوگ تمہیں اس گھر سے بے گھر و بے دخل نہ کر سکیں لو شاہاش دستخط کر دو اور اب کوئی سوال نہیں

پوچھو گی تم شاباش کرو دستخط۔“ آغا جان نے نرمی سے کہا تو اس نے فوراً ان کے حکم کی تعمیل کی۔
 ”آپ بہت اچھے ہیں آغا جان۔“ خوشی اور تشکر سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”اچھے کیسے نہیں ہوں گے آخر اجالا کے آغا جان ہیں۔“ انہوں نے شوخی سے کہا۔ تو وہ ہنس دی۔

آغا جان نے ہی یونیورسٹی میں اس کا داخلہ کر دیا وہ اکنامکس میں ماسٹر کرنا چاہتی تھی اسے داخلہ بھی فوراً مل گیا تھا عشرت بیگم اور سعید فاروقی کے بیٹے سہیل اور روحیل دونوں انجینئرنگ کر رہے تھے عائشہ نے بی اے کے بعد پڑھائی چھوڑنے کی ٹھان لی کشور بیگم اور وحید فاروقی کے بیٹے سعد نے میڈیکل پروفیشن جوائن کرنا تھا لہذا وہ میڈیکل کے آخری سال میں تھا شاہانہ نے ایم اے کیا تھا شاہانہ اور عمرانہ دونوں بی اے کے آخری سال میں تھیں ان دونوں سے اجالا کی بہت دوستی تھی عائشہ کا مزاج البتہ بہت مختلف تھا وہ آزاد خیال تھی اکھوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے ماں کی سر چڑھی بھی تھی وہ اجالا ہی کے کالج میں پڑھتی تھی دونوں اکٹھے کالج جاتی تھیں آغا جان نے اجالا کو اپنی گاڑی دے دی تھی اور اسے ڈرائیونگ بھی سیکھا دی تھی اجالا شاہانہ اور عمرانہ کو ان کے کالج ڈراپ کر کے خود عائشہ کے ساتھ اپنے کالج جاتی تھی عائشہ کی سرگرمیاں اجالا کو مشکوک لگتی تھیں وہ اکثر کالج کے گیٹ پر ہی اتر جاتی اور چپکے سے باہر نکل جاتی ایک دن تو اجالا نے اس کا تعاقب کیا تو وہ حیران رہ گئی کہ عائشہ ایک اجنبی لڑکے کے ساتھ اس کی بائیک پر بیٹھ کر جا رہی تھی اسے اس کی اس حرکت پر بہت غصہ بھی آیا اور افسوس بھی ہوا اور دوسرے دن اس نے عائشہ سے خود ہی پوچھ لیا۔

”تم کہاں اترو گی کالج کے گیٹ پر یا اپنے بوائے فرینڈ کے قریب۔“

”کیا مطلب ہے..... تمہارا؟“ عائشہ بری طرح بوکھلا گئی۔

”تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو میرا مطلب ماں باپ کے اعتماد کو بھیس پہنچاتے ہوئے تمہیں ذرا

بھی خیال نہیں آتا کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو سب کی عزت خاک میں مل جائے گی۔“ اجالا نے سختی سے کہا۔

اب اگر تمہیں پتا چل ہی گیا ہے تو اپنی زبان بند رکھنا ورنہ سارا الزام تمہارے سر دھروں گی تم ہی مجھے اپنے ساتھ لاتی لے جاتی ہو میں تو صاف کہہ دوں گی کہ یہ لڑکا اجالا کا بوائے فرینڈ ہے

میں تو مجبوراً اجالا کے ساتھ جاتی رہی اس لڑکے کو سمجھانے کہ اجالا کا پیچھا چھوڑ دے۔ عائشہ نے سازش انداز میں مکار لہجے میں کہا تو وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم اس لڑکے کے ساتھ ٹائم پاس کر رہی ہو اور یقیناً وہ بھی تمہارے ساتھ فلٹ کر رہا ہے، اگر تم اس کے ساتھ سیر لیں ہو تیں تو یہ غلط راستہ اختیار نہ کرتیں اور نہ ہی اس لڑکے کو میرا بوائے فرینڈ ثابت کرتی تم سے تو اس کا تعلق واسطہ نہ نکلتا نہ ہی کوئی اور رشتہ جڑ سکتا ہے کیوں ٹھیک کہانا میں نے تم محض وقتی تسکین اور انجوائے منٹ کی خاطر اپنی اور اپنے خاندان کی عزت داؤ پر لگا رہی ہو ہے نا عائشہ۔“

”شٹ اپ۔“ اس نے غصے سے کہا اور اجالا تاسف سے اسے دیکھتے ہوئے مسکرا دی۔

اس کے بعد اجالا نے اس کے معاملے میں دخل نہیں دیا اور آغا جان کو اعتماد میں لے کر ساری حقیقت ان پر واضح کر دی اس دن کے بعد آغا جان انہیں خود کالج چھوڑنے اور لینے جاتے رہے پھر امتحان ہو کر ختم ہو گئے اجالا نے عائشہ سے کبھی نہیں پوچھا کہ اس لڑکے سے اب اس کا رابطہ ہے یا نہیں مگر اس نے عائشہ کو چوری چھپے فون پر کسی سے باتیں کرتے کئی بار دیکھا تھا اور رزلٹ آؤٹ ہونے کے بعد جب عائشہ نے آگے نہ پڑھنے کی بات کہی تو کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا کیونکہ آغا جان نے عشرت بیگم کو اپنے ساتھ لے جا کر عائشہ کو خالد نامی لڑکے کے ساتھ ہونٹنگ کرتے خود بھی دیکھا اور انہیں بھی دکھایا تھا عشرت بیگم کو آغا جان نے صاف کہہ دیا تھا کہ اب عائشہ نے اگر پڑھنا ہے تو گھر بیٹھ کر پڑھے ورنہ کوئی ضرورت نہیں ہے آگے پڑھنے کی اور یہی بات عشرت بیگم نے عائشہ کے دماغ میں بٹھادی تھی اور ایک دن عائشہ عشرت بیگم کے ساتھ بازار گئی تو اس نے خالد کو کسی اور لڑکی کے ساتھ ہونٹنگ کرتے دیکھا اور اپنی ہی نظروں میں گر گئی وہ کیا کرتی رہی تھی۔ اب تک ٹائم پاس فلٹ یا دل لگی یا محبت ہر زاویے سے وہ خسارے کا سودا ہی کر رہی تھی اگر وہ خالد کے ساتھ سیر لیں ہو جاتی تو کتنا بڑا نقصان اٹھاتی یہ سوچ کر ہی عائشہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔



بی جان کافی بیمار تھیں حمید فاروقی بھی روزانہ ان کی عیادت کے لئے آتے اجالا کے لئے تو بی جان ہی ”ماں“ تھیں، ان کی بیماری نے اسے ڈرا کر رکھ دیا تھا بخار تھا کہ اترنے کا نام ہی نہیں

لیتا تھا آغا جان تو خود دل کے مریض ہو گئے تھے وہ الگ بی جان کی بیماری سے پریشان تھے بی بی جان اجالا کو دیکھتیں تو حمید فاروقی اور آغا جان سے کہنے لگتیں۔

”حمید بیٹا، اپنی بیٹی کا گھر بسا دو، اس کے ہاتھ پیلے کر دو ورنہ میں مر کے بھی بے چین رہوں گی اس کے لئے کوئی اچھا رشتہ ڈھونڈنا سے میرے سامنے بیاہ دو تا کہ میں سکون سے مر سکوں۔“

”کیسی باتیں کرتی ہو حمیدہ بیگم اتنی جلدی یہ کام کیسے ہو سکتا ہے اور تمہیں کچھ نہیں ہونے والا تم خود اپنی پوتی کو دلہن بنا کر رخصت کرو گی اور میں ابھی زندہ ہوں۔“ آغا جان نے تڑپ کر کہا۔

”جب تک میں ہوں تب تک آپ ہیں میں اچھی طرح جانتی ہیں آپ تو فوراً ہی میرے پیچھے چلے آئیں گے میرے بغیر تو ویسے ہی آپ کا دم نکلتا ہے۔“ بی بی جان نے انہیں دیکھتے ہوئے نقاہت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے اب میں اتنا بھی کمزور نہیں ہوں۔“ آغا جان نے سب سے نظریں چراتے ہوئے کہا اور اپنی آنکھوں میں امنڈتے آنسو چھپانے کی غرض سے کمرے سے باہر نکل گئے اجالا بھی غمزہ اور پریشان سی ان کے پیچھے چلی آئی۔ آغا جان اور بی جان میں مثالی محبت تھی۔

”آغا جان اگر بی جان کو کچھ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے؟“

”ہم شکر ادا کریں گے کہ جان چھوٹ گئی“ آغا جان نے اسے اور خود کو بہلانے کی کوشش کرتے ہوئے مذاق سے کہا۔

”آغا جان!“ وہ ان کے سینے سے لگ کر رو دی۔

”اجالا جان! بیٹا اب ہمیں تمہاری فکر ہے تمہاری شادی کر ہی دینی چاہیے تم یہ بتاؤ کہ تمہیں سہیل، روحیل اور سعد میں سے سب سے زیادہ کوئی اچھا لگتا ہے؟“ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

”تینوں ہی بہت اچھے ہیں۔“

”مگر بیٹا جان! تمہاری شادی ان تینوں سے تو نہیں ہو سکتی صرف ایک سے ہو سکتی ہے۔“

”مگر وہ تو میرے بھائی ہیں۔“ وہ ایک دم سے ان سے الگ ہو کر حیرت سے بولی۔

”سگے بھائی تو نہیں ہیں نا اس شادی سے یہ گھرانہ آپس میں جڑا رہے گا اور میں جانتا

ہوں کہ سہیل تمہیں پسند کرتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے تو یہ غلط نہ ہوگا۔“
آغا جان نے سنجیدگی سے کہا۔

”پلیز آغا جان! آپ ایسی باتیں مت کریں، میں نے ان کے بارے میں کبھی ایسا نہیں سوچا۔“ وہ بے چینی سے بولی۔

”تو بیٹا اب سوچ لو وہ بہت خیال رکھتا ہے تمہارا۔“

”جانتی ہوں آغا جان مگر میں ان سے شادی کر کے تائی اماں کے زیرِ عتاب نہیں آنا چاہتی تائی اماں سہیل بھائی کی شادی اپنی بھتیجی کوثر سے کرنا چاہتی ہیں اور تائی امی اپنی شاہانہ اور شاہانہ کی شادی سہیل بھائی اور روحیل بھائی سے کرنے کا سوچ رہی ہیں ایسے میں میرا درمیان میں آ جانا انہیں کب اچھا لگے گا وہ تو پہلے ہی مجھ سے نالاں رہتی ہیں حالانکہ میں نے ان سے کبھی کچھ نہیں مانگا نہ کچھ جتایا نہ بدتمیزی کی پھر وہ بس لئے دیئے ہی رہتی ہیں۔“

”ہاں بیٹا یہ تو تم نے درست کہا ہے لیکن سہیل کی محبت اور تمہاری سیرت اور جائیداد ان کا رویہ بدل سکتی ہے۔“ آغا جان نے پرسوج لہجے میں کہا۔

”سہیل بھائی نے آج تک اپنی اماں کے ڈر سے مجھے تو اپنی محبت کا اعتبار دلایا نہیں پھر بھلا وہ اپنی ماں کے سامنے یہ اقرار کیسے کر سکتے ہیں۔“

”نہیں آغا جان میں عشرت بیگم کی نظروں میں اپنے لئے نفرت اور شک نہیں دیکھنا چاہتی آپ میری فکر مت کریں میرا اللہ مالک ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہمارے بعد یہ لوگ تمہیں دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیں گے۔“

”پھر بھی آپ ان لوگوں سے میرا عمر بھر کا رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں۔“

”اس لئے کہ سہیل بہت اچھا لڑکا ہے تمہیں چاہتا بھی تو ہے۔“ آغا جان نے نرمی سے کہا۔

”آغا جان! میں ایک شخص کی چاہت کے لئے بہت سارے لوگوں کی نفرت اور بدگمانی

نہیں جھیل سکتی۔“ اجالا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”اجالا چندا! عشرت اور کشور سے تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے اور نہ ہی تمہاری مرحومہ ماں

نے یا تم نے ان کا کوئی نقصان کیا ہے وہ تو اپنی عادت سے مجبور ہو کر فساد کرتی رہی ہیں اب تو وہ

ٹھیک ہی رہتی ہیں۔“ آغا جان اسے کافی دیر تک سہیل کے لئے قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

”وہ اس لئے کہ میں نے کبھی ان کے کسی کام میں مداخلت نہیں کی ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھا ہے وہ دونوں مجھ پر شروع میں طنز کرتیں بولتیں مگر میں خاموش رہتی اس لئے تھک ہار کر وہ بھی مجھ پر طنز کرنے اور میرے کاموں میں کیڑے نکالنے سے باز آ گئیں آپ بے شک ان سے بات کر کے دیکھ لیں وہ نہیں مانیں گی اور اپنی پرانی روش پر لوٹ آئیں گی۔“

”میں سعید اور وحید سے بات کروں گا۔“

”وہ تو اپنی بیویوں کے کہنے میں ہیں جو وہ کہیں گی وہ وہی کریں گے۔“

”پتا نہیں میری اولاد بیویوں کے سامنے بزدل کیوں بنی رہتی ہے؟“

”آغا جان کیا آپ کبھی بی جان کے سامنے بزدل بنے ہیں؟“ اس نے شوخی سے پوچھا۔

”ایک بار بنا تھا اور انہیں بیاہ کر لے آیا تھا اور پھر انہیں اپنا دل بنا کر رکھا ہے ساری زندگی اور لگتا ہے جیسے اس دل کی دھڑکنیں تھمتی جا رہی ہیں۔“ آغا جان نے افسردگی سے بے بسی سے جواب دیا اور تھکے تھکے قدموں سے چلتے ہوئے بی جان کے کمرے میں داخل ہو گئے۔

آغا جان نے وحید فاروقی اور سعید فاروقی سے اجالا کے رشتے کی بات کی تو وہ دونوں بے بسی سے اپنی بیویوں کی طرف دیکھنے لگے۔

”میں تو اپنے سعد کی شادی اپنی بھانجی تمکین سے کروں گی میں نے تو بہن کو زبان بھی دے رکھی ہے۔“ کشور بیگم نے لٹھ مار لہجے میں کہا۔

”تو کیا بولنے کے لئے زبان کسی سے ادھار مانگی ہے بہو؟“ آغا جان نے مسکراتے ہوئے طنز کیا تو وہ منہ پھیر کر بیٹھ گئیں۔

”خیر اور بڑی بہو تم نے کسے دے رکھی ہے اپنی زبان بہن کو یا بھائی؟“ آغا جان نے عشرت بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”دونوں کو۔“

”چلو گویا تم تو مکمل گونگی ہو اس معاملے میں۔“

”آغا جان اجالا لاوارث ہے کیا جو ہمارے سی سرمنڈھنے کا خیال آتا ہے آپ کو حمید پہلے

اجالا کو اپنے ساتھ لے گیا اور نہ اب اس کے بیاہ کی فکر کر رہا ہے باپ پوچھتا نہیں ہے دادا پوتی کی فکر میں گھلتا جا رہا ہے واہ بھی یہ بھی خوب رہی۔ ”عشرت بیگم نے طنزیہ سے بے بس کہا۔

”عشرت تمیز سے بات کرو آغا جان نے ایسی کون سی غلط بات کہہ دی ہے جو تم اتنا بھڑک رہی ہو اجالا میرے سکے بھائی کی بیٹی ہے اگر تم اپنے بھائی بہن کے گھر رشتہ جوڑ سکتی ہو تو میں اپنے بھائی کے گھر رشتہ کیوں نہیں دے سکتا کیا کمی ہے اجالا میں ماشا اللہ خوبصورت ہے خوب سیرت ہے تعلیم یافتہ اور سلیقہ مند ہے اور کیا چاہیے تمہیں؟“

”مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہیے۔“ عشرت بیگم نے شوہر کی بات سن کر کہا۔

”اگر سہیل کی مرضی اجالا سے شادی کرنے میں ہو تو بہو؟“

”تو میں یہ قیامت تک نہیں ہونے دوں گی میرے میکے والوں کا حق پہلا ہے۔“

”ٹھیک ہے میں نے تو یونہی بات کر لی تھی کہ کہیں بعد میں افسوس نہ ہو میں دیکھنا چاہتا تھا کہ میری اولاد میری کتنی فرمانبردار رہ گئی ہے اجالا نے مجھے منع بھی کیا تھا کہ میں اس سلسلے میں تم لوگوں سے کوئی بات نہ کروں کیونکہ اسے تم سب سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی میں نے اولاد پر اپنا حق سمجھتے ہوئے تم سے یہ بات کی تھی مجھے بھی اپنی پھولوں جیسی بچی کو کانٹوں کے حوالے کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے اللہ نے چاہا تو اجالا کو سب سے اچھا ہم سفر ملے گا جو اسے محبت بھی دے گا اور عزت بھی اس کی قدر بھی کرے گا اور اس کا خیال بھی رکھے گا انشا اللہ۔“ آغا جان نے دل سے پر یقین لہجے میں کہا سعید فاروقی اور وحید فاروقی نے بھی انشا اللہ کہا اور دروازے کے قریب کھڑی اجالا ان کی باتیں سننے کے بعد افسردگی سے اپنے کمرے کی جانب چلی گئی۔

دوسرے دن بی جان کے دل کی دھڑکنیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئیں۔ آغا جان نے انہیں ان کے اصرار پر رشتے والی بات بتادی تھی جس کا صدمہ ان کے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔

اجالا کا تو جیسے دل ہی خالی ہو گیا تھا سب سے زیادہ اجالا رو رہی تھی آغا جان بھی چپکے چپکے آنسو بہا رہے تھے ان کا غم سب سے زیادہ گہرا تھا سینٹا لیس سال کی طویل رفاقت تھی ان کی اور بی جان کی ان کی موت نے انہیں بھی مار ڈالا تھا ان کے دل میں ضبط کی شدت سے شدید درد اٹھا اور بی جان کے چہلم سے پہلے ہی وہ بھی ان سے جا ملے رشید محل پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی تھی رشید محل کے درو نوں اور تک ان کی موت پر اٹکبار تھے ملازم دل فگار تھے رورو کر سب کا برا حال تھا اجالا

تو بی جان اور آغا جان کو چیخ چیخ کر پکارتی رہی اور روتے روتے کئی بار بے ہوش ہوئی سب لوگ آغا جان اور بی جان کی مثالی محبت پر رشک کر رہے تھے آغا جان نے بی جان کا کہا پورا کر دکھایا تھا ان کی جدائی کا صدمہ نہ سہہ سکے اور ان کے پیچھے چلے گئے اجالا کو بی جان کی بات یاد آ رہی تھی اور وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

سعید فاروقی اور وحید فاروقی شرمندگی اور پچھتاوے کی آگ میں جل رہے تھے۔ اور سوچ رہے تھے کہ کاش آغا جان کی بات مان لیتے اجالا کو اپنی بہو بنا لیتے۔

بی جان اور آغا جان کا چہلم بھی ہو گیا اجالا کو تو جیسے چپ ہی لگ گئی تھی نہ کھانے پینے کا ہوش رہا تھا۔ اور نہ ہی پہننے اوڑھنے کا وہ سارا سارا دن اپنے یابی جان اور آغا جان کے کمرے میں بند رہتی اور قرآن پڑھ کر ان کی روح کو بخشتی رہتی یا روتی رہتی۔

☆☆☆

”اجالا تم اکیلی کیوں بیٹھی ہو؟“ وہ لان کی سیڑھیوں میں بیٹھی تھی کہ سہیل اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں چلا آیا۔

”اکیلی رہ گئی ہوں تو اکیلی ہی بیٹھوں گی ناں۔“ اس نے دکھ سے کہا۔

”تم اکیلی نہیں ہو اجالا میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ سہیل نے اس کے سامنے بچوں کے بل بیٹھ کر نرمی سے کہا اور ایک نظر اس کے دلکش چہرے پر ڈال کر بولا۔

”یہ ساتھ صرف چند ساعتوں کا ہے سہیل بھائی اس سے زیادہ تو آپ میرا ساتھ نہیں دے سکیں گے۔“

”میں تمام عمر تمہارا ساتھ دوں گا تمہارے ساتھ رہوں گا۔“

”نہ آپ ایسا کر سکیں گے اور نہ ہی آپ کو کوئی ایسا کرنے دے گا۔“

”تم میرے بارے میں ہم سب کے بارے میں اتنی ناامید کیوں ہو؟“

”میں نے آپ سمیت سب سے کوئی امید رکھی ہی نہیں جو ناامید ہوں گی“ اجالا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”اجالا! میں تمہیں اداس اور دکھی نہیں دیکھ سکتا۔“

”مجھے آپ کے احساسات کی قدر ہے اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔“

”اچھا اٹھو چلو باہر گھوم کر آتے ہیں تم نے خود کو کمرے میں قید کر کے رکھ لیا ہے چلو میں تمہیں آؤں کریم کھلا کر لاؤں۔“

”نہیں مجھے نہیں جانا سہیل بھائی۔“

”تم مجھے بھائی مت کہا کرو۔“

”آپ مجھ سے بھائی کے علاوہ کوئی توقع مت رکھیے گا۔“

”اجالا میں دل سے تمہیں چاہتا ہوں آج سے نہیں برسوں سے تمہاری چاہت میرے دل میں موجزن ہے میں تو اپنی تعلیم مکمل ہونے اور ملازمت ملنے کا انتظار کر رہا تھا اب جبکہ یہ دونوں کام بھی ہو گئے ہیں تو میں تمہیں اپنا سکتا ہوں۔“ سہیل نے بے قرار ہو کر کہا۔

”پلیز سہیل بھائی مجھ سے یہ باتیں مت کریں تائی اماں نے سن لیا تو آپ کا تو کچھ نہیں جائے گا مگر میرا جینا دو بھر ہو جائے گا تائی امی اپنی بچی سے آپ کی شادی کرنا چاہتی ہیں اور جب تایا جان ہی کوئی اسٹینڈ لینے کا حوصلہ نہیں رکھتے تو بھلا آپ اپنی والدہ کی حکم عدولی کیسے کر سکتے ہیں بہتر ہوگا کہ آپ اپنے ذہن سے یہ خیال نکال دیں۔“ اجالا نے اپنی بات مکمل کی اور اٹھ کر تیزی سے اپنے کمرے میں طرف بڑھ گئی سہیل اسے آوازیں دیتا رہ گیا۔

شہانہ، سعد، سہیل اور عائشہ کی شادی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا، سہیل نے اجالا سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کر دیا اور سعد نے بھی تمکین سے شادی کرنے سے انکار کر کے ایک طوفان کو دعوت دے ڈالی عشرت بیگم اور کشور بیگم نے اجالا کو کوسنا شروع کر دیا اجالا نے حمید ولا جانے کا ارادہ کر لیا تھا اس نے اپنا سازا ضروری سامان پیک کر لیا حمید فاروقی سے بات کرنا باقی تھی وہ بھی اب اجالا کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن یہ بات ابھی تک ان کے دل میں ہی تھی زبان سے انہوں نے نہ تو صاف بیگم سے کچھ کہا تھا اور نہ ہی اجالا سے اس سلسلے میں کوئی بات کی تھی۔

وہ یونیورسٹی سے گھر پہنچی تو ایک ہنگامہ اس کا منتظر تھا، عشرت بیگم اور کشور بیگم سمیت ان کی تمام آل اولاد ڈرائنگ روم میں موجود تھی۔

”السلام وعلیکم۔“ اجالا نے سب کو دیکھتے ہوئے سلام کیا۔

”لو آگئیں فساد کی جڑ سیر سپاٹے کر کے۔“ عشرت بیگم نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

”میں یونیورسٹی سے آرہی ہوں تائی اماں۔“

”ایک ہی بات ہے وہاں لڑکے لڑکیوں کو عشق لڑانے اور تم جیسی لڑکیوں کو لڑکے پھنسانے کا سبق ہی تو پڑھایا جاتا ہے۔“ عشرت بیگم نے تلخ اور غصیلے لہجے میں کہا۔

”آپ غلط کہہ رہی ہیں تائی اماں۔“ اجالا نے احتجاج کیا۔

”ہاں آں..... درست تو صرف تم کہتی کرتی ہو بی بی جی تو ہمارے لڑکوں کو اپنے دام میں پھنسا رکھا ہے۔“ عشرت بیگم نے اس لہجے میں کہا۔

”تائی اماں بس کیجئے بہت برداشت کیا ہے میں نے آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا میرے کردار پر کچڑا اچھالنے کا مجھے کیا ضرورت ہے آپ کے بیٹوں کو پھنسانے کی۔“ اجالا کا ضبط جواب دے گیا تو غصے سے بولی۔

”ضرورت تو تم ہی جانو بی بی آخر کو ہمارے بیٹے پڑھے لکھے اور خوب رو ہیں۔“ کشور بیگم نے طنز یہ لہجے میں کہا۔

”آپ کے بیٹے دنیا سے نرا لے نہیں ہیں ان سے لاکھ درجے بہتر پڑے لکھے اور خوب رو لڑکے اس دنیا میں موجود ہیں آپ کے بیٹوں میں کوئی سرخاب کے پر نہیں لگے اور نہ ہی کسی سلطنت کے شہنشاہ ہیں جو میں انہیں اپنے دام میں پھانسیوں کی میں نے انہیں ہمیشہ اپنے بھائی سمجھا ہے یہ مجھے کیا سمجھتے ہیں یہ ان کی سمجھ اور سوچ ہے جس میں میرا کوئی دخل نہیں ہے۔“ اجالا نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”سہیل نے تو صاف کہا ہے کہ میں اجالا سے شادی کروں گا۔“

”اور سعد نے بھی تمہیں سے شادی کرنے سے انکار کر رہا ہے اسی حرافہ نے ورغلا یا ہو گا سعد کو بھی ایک گھر میں دو دو لڑکوں کو چکر دے رہی ہے ارے یہ تو قتل و خون کرانے کے چکر میں ہے۔“ کشور بیگم کی زبان نے زہرا گلا۔

”کیا کہہ رہی ہیں امی آپ؟“ سعد غصے سے پھٹ پڑا۔

”کیوں غلط کہہ رہی ہوں کیا تم نے اجالا کی وجہ سے انکار نہیں کیا؟“

”نہیں، اجالا کو میں نے ہمیشہ عمرانہ کی طرح اپنی چھوٹی بہن کا درجہ دیا ہے یہ مجھے پیار سے احترام سے بھائی بھائی پکارتی ہے تو بھلا میں اس کے اس مان بھرے رشتے کی توہین کیسے کر سکتا ہوں؟“ سعد نے غصے سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تو اجالا نے سکون کا سانس لیا۔

”تم اجالا کو بچانے کی کوشش تو نہیں کر رہے۔“ عشرت بیگم نے کہا۔

”اے تو اللہ آپ لوگوں سے بچائے گا میں کون ہوتا ہوں اسے بچانے والا“ سعد نے اجالا کے سر پر دست شفقت رکھ کر کہا تو دونوں کا منہ بن گیا۔

”تو سعد تم نے تمکین کے رشتے سے انکار کیوں کیا ہے؟“ شاہانہ نے پوچھا۔
”میری مرضی۔“

”اجالا تم سچ بتا دو ورنہ۔“ عشرت بیگم نے اسے گھورا۔

”ورنہ کیا؟“ اجالا نے بھی تمام احترام بالائے طاق رکھ کر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا مگر وہ چپ سی ہو گئیں تو وہ خود ہی بول پڑی۔

”میں اپنے ہی گھر میں نقب لگانے والوں میں سے نہیں ہوں تائی اماں! میں نے آپ سب کو اپنا سمجھا احترام دیا مگر آپ بڑوں نے میرے ساتھ جس چھوٹے پن کا مظاہرہ کیا ہے وہ خون کے ان سکے رشتوں کو زیب نہیں دیتا سہیل بھائی کی خواہش میں میرا کوئی دخل نہیں ہے اور نہ ہی مجھے آپ جیسی کم ظرف اور احساس سے عاری ماؤں کے بیٹوں کو بھائی کے علاوہ کوئی مقام دینا پسند ہے، اللہ جانے آپ کس کمپلیکس کا شکار ہیں آج تک آپ کے بیٹے آپ کو مبارک ہوں میں نے اس گھر کی بہو بننے کے خواب کبھی نہیں دیکھے۔“

”اچھا تو اور کس گھر کی بہو بننے کے خواب دیکھے ہیں۔“ عائشہ نے طنز سے پوچھا۔

”عائشہ تم زبان بند رکھو۔“ سہیل نے اسے ڈانٹ دیا اس کا منہ بن گیا۔

سعد بھائی مہرین کو پسند کرتے ہیں اسی سے شادی کرنا چاہتے ہیں اور مہرین بہت اچھی لڑکی ہے۔ اجالا نے نیا انکشاف کیا تھا سب حیرت زدہ رہ گئے سعد نے اسے اپنا راز داں بنا رکھا تھا۔

”سعد یہ اجالا کیا کہہ رہی ہے۔“ کشور بیگم نے پوچھا۔

اجالا سچ کہہ رہی ہے میں مہرین سے ہی شادی کروں گا سعد نے اٹل لہجے میں جواب دیا۔

”اجالا مہرین کو کیسے جانتی ہے؟“ شاہانہ نے پوچھا۔

”ہوگی اس کی کوئی سہیلی پھنسا دیا میرے بیٹے کو مکاروں نے۔“ کشور بیگم نے دہائی دی۔

”اجالا کی سہیلی نہیں ہے مہرین۔“ سعد نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

”تو یہ اسے کیسے جانتی ہے ہمیں تو تم نے کبھی نہیں بتایا۔“ شاہانہ جل کر بولی۔

”تم بہن ہی رہیں کبھی میری دوست بنتیں تو میں تم سے اپنی باتیں اپنی پسند ناپسند شیئر کرتا نا اجالا میری بہن ہی نہیں بنی اچھی دوست بھی بنی ہے۔ یہ میری راز داں ہے یہ مہرین سے مل چکی ہے۔“ سعد نے سچ سچ بتا دیا۔

”اے لو ہماری ناک کے نیچے اتنا کچھ ہوتا رہا اور ہمیں خبر بھی نہ ہو سکی اجالا نے تو جیسے سحر پھونک دیا ہے ہمارے بیٹوں پر دیکھو تو سہی کیسے اس کے گن گار ہے ہیں۔“ عشرت بیگم نے ہاتھ ملتے ہوئے غصے اور بے بسی سے کہا۔

”یہ ہے ہی بہت گنوں والی“ روحیل نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

”اب تمہاری نظر بھی اس پر جمی ہے۔“ عشرت بیگم چلائیں۔

”خدا کے لئے امی آپ سوچ سمجھ کر بولا کریں، اتنی شک بھری نظر ہے آپ کی میں سہیل بھائی کے جذبات سے واقف تھا پھر بھلا میں اسے اس نظر سے کیوں دیکھتا۔“ روحیل غصے سے بلند آواز میں بولا۔

”بہت زبان لگ گئی ہے تمہیں اس حرافہ کے سامنے ماؤں کو جھٹلانے اور بے عزت کرانے پر تلے ہو۔“ عشرت بیگم نے غصے سے کہا۔

”آپ اپنی عزت خود داؤ پر لگا رہی ہیں کسی اور کو دوش مت دیں۔“ روحیل نے سپاٹ اور تیز لہجے میں کہا۔

”سن رہی ہو کشور اس کل کی لڑکی کی خاطر آج ہماری ہی اولاد ہمارے منہ کو آ رہی ہے۔“ عشرت بیگم نے صدمے سے چیختے ہوئے کہا۔

”ارے میں تو کہتی ہوں نکال باہر کرو اسے جن کے سر پہ یہاں پڑی تھی اب تک وہ تو قبر میں جا سوائے ہیں اب یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟“ کشور بیگم نے سفاکی سے بے حسی سے کہا۔

”ہاں تو اور کیا کیوں اجالا بی بی باپ کے گھر کیوں نہیں جاتیں دادی دادا تو اللہ میاں کے پاس چلے گئے ہیں۔ اب تم بھی اپنے ابا میاں کے پاس چلی جاؤ۔“ عشرت بیگم نے اجالا کو دیکھتے ہوئے بے حسی سے کہا۔

”چلی تو میں جاؤں گی ہی لیکن اس گھر پر میرا بھی حق ہے۔“

”تمہارا اس گھر پہ کوئی حق نہیں ہے جب سگے باپ نے تمہیں لا وارث چھوڑ رکھا ہے تو ہم

کیوں تمہیں یہاں رکھیں۔“ عشرت بیگم نے تیز لہجے میں کہا۔

”میں یہاں آپ کے رکھنے سے نہیں رہ رہی یہ گھر پہلے آغا جان کا تھا اور اب میرا ہے۔“
اجالا نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

اوہ باتیں تو سنو خورانی کی میرا ہے کیوں تمہارے باپ نے خرید کر دیا تھا تمہیں عشرت بیگم نے طنز یہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

”تو کیا آپ کے باپ نے خرید کر دیا ہے آپ کو یا آپ کے بچوں کو جو آپ یہاں رہ رہی ہیں۔“ اجالا نے غصے سے کہا۔

”اے لڑکی! زبان کو لگام دو۔“

”پہلے آپ تو اس بات پر عمل کر لیں، میں آپ کا دیا نہیں کھاتی اور نہ ہی آپ کے گھر میں رہ رہی ہوں یہ گھر آغا جان نے پہلے میرے نام کر دیا تھا اور ایک سال پہلے یہ گھر باقاعدہ قانونی تقاضوں کے مطابق میرے نام منتقل ہو چکا ہے چاہیں تو وکیل سے پوچھ لیں۔“
”کیا؟“ عشرت بیگم اور کشور بیگم پر تو جیسے آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”یہ کیوں نہیں ہو سکتا تائی امی آخر میں آغا جان کی لاڈلی پوتی ہوں انہوں نے تو اپنا فارم ہاؤس اور گاڑی بھی میرے نام کر دی تھی میرا بھی ان کی پر اپرٹی پر اتنا ہی حق تھا جتنا آپ کا حق ہے آپ نے جو رویہ میرے ساتھ اپنائے رکھا ہے میں اگر چاہتی تو آپ سب کو اس گھر سے بے دخل کر سکتی تھی کیونکہ قانونی طور پر میں اس گھر کی مالک تھی اور ہوں مگر میرے خیال میں ایسا کرنا کم ظرفی کہلاتا آپ بڑوں کے ظرف تو کم تھے ہی پھر میں کیوں آپ کے نقش قدم پر چلتی کسی کو تو اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دینا چاہیے تھا نا“ اجالا نے سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں کہا تو وہ جل کر راہو گئیں۔

واہ آغا جان کیسے چھپے رستم نکلے کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہونے دی اور اتنی بڑی جائیداد پوتی کے نام کر دی عشرت بیگم نے غصے اور حسد کی آگ میں جلتے ہوئے کہا۔

”آغا جان جانتے جو تھے کہ آپ لوگ ان کے بعد میرے ساتھ کیسا سلوک کریں گے جی تو انہوں نے یہ گھر میرے نام کر دیا تھا اب بتائیے کیسے نکال سکتی ہیں آپ مجھے میرے ہی گھر سے اور میں نے کب آپ سے اپنے اخراجات کے لئے رقم طلب کی ہے کیا لے کر کھالیا ہے آپ کا جو

آپ آج تک مجھ سے خار کھاتی رہی ہیں بتائیے مجھے تائی اماں اور تائی امی کیا نقصان کیا تھا میری مرحومہ ماں نے آپ کا جو آپ آج تک مجھے نفرت بھری نظروں سے دیکھتی رہی ہیں کون سا قرض ادا کرنا ہے میں نے یا میرے ماں باپ نے آپ کا جو آپ نے یہ منفی رویہ اپنائے رکھا ہے بتائیے مجھے؟“ اجالا کے دل میں برسوں سے جولاوا پک رہا تھا اس نے آج اسے پہنے سے نہیں روکا وہ سب نظریں چرا رہے تھے اس کے سوالوں کا کشور بیگم، عشرت بیگم کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

”اجالا تم کہیں نہیں جاؤ گی تم یہیں رہو گی۔“ سہیل نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم چپ کرو سہیل تم جو چاہتے ہو وہ میں کبھی نہیں ہونے دوں گی۔“ عشرت بیگم نے غصے سے چیخ کر کہا۔

”اور آپ جو چاہتی ہیں وہ میں کبھی نہیں ہونے دوں گا“ سہیل نے بھی ضدی پن سے کہا۔

”سہیل بھائی پلیز آپ میری وجہ سے اپنی ماں سے مت الجھیں کیونکہ میں آپ کو بھائی کے علاوہ کوئی مقام نہیں دے سکتی اور مجھے نفرتوں کے بیچ اپنی نئی زندگی شروع نہیں کرنی خواہ مخواہ میری وجہ سے آپ بھی زیر عتاب آ جائیں گے۔“ اجالا نے سہیل کو دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

”مجھے پرواہ نہیں ہے۔“ سہیل نے بے قراری سے بے قوفی سے کہا۔

”مگر مجھے پرواہ ہے سہیل بھائی تائی اماں کا رویہ ایک دن آپ کو مجھ سے بھی بدگمان کر سکتا

ہے۔“

”تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے اجالا۔“ اس نے تڑپ کر پوچھا۔

”پلیز سہیل بھائی مجھے تماشامت بتائیے آپ بہت اچھے ہیں مگر میں نے آپ کے بارے میں اس انداز میں کبھی نہیں سوچا۔“ اجالا نے سنجیدگی سے جواب دیا تو اس کا دل ہی نہیں چہرہ بھی بجھ گیا۔

”لو لڑکی سب کے سامنے انکار کر رہی ہے تو لڑکے تم کیوں اس کے پیچھے پاگل ہوئے جا رہے ہو دفعہ کروا سے تمہارے لئے لڑکیوں کی کمی ہے کیا ایک سے ایک اچھی اور خوبصورت لڑکی مل سکتی ہے تمہیں۔“ کشور بیگم نے جل کر کہا انہیں اپنی بیٹیوں کی فکر تھی وہ شاہانہ کو یا شاہانہ کو سہیل سے بیاہنا چاہتی تھیں اسی لئے زبان کو حرکت میں لائے بغیر نہ رہ سکیں۔

”اجالا تم کہیں نہیں جاؤ گی ہمارے ساتھ ہی رہو گی بس۔“ عمران نے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔
 ”ہاں تو اور کیا تم ہماری کزن ہو یہ گھر ہم سب کا ہے تمہیں یہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا۔“

شبانہ بھی نرمی سے بولی۔

”تم کب سے اتنی بڑی ہو گئیں کہ بڑوں کے بچ بو لنے لگیں یہ کوئی یتیم ہے جو یہاں باپ کے بغیر رہے گی۔“ کشور بیگم نے غصے سے اپنی بیٹیوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

”امی اجالا اپنی پیدائش کے دن سے اس گھر میں رہ رہی ہے حمید چاچو تو دس گیارہ سال سے اس کے بغیر علیحدہ گھر میں رہ رہے ہیں آج کوئی نئی بات تو نہیں ہو گئی۔“ شبانہ نے انہیں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”شبانہ تم بڑوں کی باتوں میں دخل مت دو، اس کی وجہ سے اس گھر کے لڑکے بگڑے ہیں باقی ہوئے ہیں ہمارے بتائے ہوئے رشتوں سے انکار کر رہے ہیں اس لئے یہ اس گھر میں نہیں رہے گی سنا تم نے۔“ کشور بیگم غصے سے بولیں۔

”سن لیا سہیل بھائی آپ نے میں اسی الزام اور تہمت سے بچنا چاہتی تھی مگر نہیں بچ سکی جہاں زباں کی جگہ زہر آلود تلواریں چلتی ہوں وہاں زخم لگ کر ہی رہتے ہیں۔“ اجالا نے سہیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا وہ لب بھینچ کر رہ گیا اپنی ماں اور چچی کی زبائیں بند کرنے پر تو اس کا اختیار نہیں تھا۔

سعید فاروقی اور وحید فاروقی بھی فیکٹری سے اس وقت گھر پہنچے تھے یہ تماشا دیکھ کر دروازے پر ہی رک گئے تھے۔

”اور تائی اماں اب اگر میں اس گھر میں نہیں رہوں گی تو آپ بھی اس گھر میں نہیں رہیں گی یہ گھر میرے نام ہے آپ لوگ اپنا الگ گھر خرید لیں جب تک نیا گھر نہیں مل جاتا تب تک آپ یہاں رہ سکتے ہیں اور میں ایسا کبھی نہ کہتی۔ لیکن آپ کی باتوں نے لہجے اور رویے نے مجھے ایسا کہنے پر مجبور کیا ہے۔ مجھے افسوس ہے آپ دونوں خواتین کے رویوں نے سب کو پریشانی اور مشکل میں ڈال دیا ہے میں یہاں سے جا رہی ہوں۔“

”مجھے پہلے سے آپ کے حسن سلوک کا اندازہ اور تجربہ تھا۔“ اجالا نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا تو انہوں نے ”ہونہہ“ کہہ کر سر جھٹک دیا۔

”اجالا! آؤ میں تمہیں چھوڑ آؤں۔“ سہیل اور سعد ایک ساتھ اس کا سوٹ کیس اٹھانے کے لئے آگے بڑھے۔

”شکریہ بھائی! مجھے ”حمیدولا“ کا راستہ معلوم ہے میں خود ہی چلی جاؤں گی۔“
 ”گھر کے بہانے کہیں اور جانا ہوگا کسی اور سے ملنا ہوگا جیسی تو اکیلی جانا چاہ رہی ہے اور سامان بھی سارا سمیٹ کر پہلے سے رکھا ہوا تھا بہانہ ہمارا۔“ عشرت بیگم نے طنزیہ لہجے میں کہا تو غصے سے احساس تو بہن سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”بعض لوگوں کو اپنے کردار و اطوار کی خامیاں اور خرابیاں دوسری میں ڈھونڈنے کی عادت ہوتی ہے آپ بھی انہیں لوگوں میں سے ہیں تا ئی اماں! لیکن ایک بات میری بھی سن لیجئے کہ میں غزالہ حمید کی بیٹی ہوں عشرت سعید کی بیٹی نہیں ہوں جو اس قسم کے بہانے کروں اور کسی اور سے ملنے اور ہونٹنگ کرنے چلی جاؤں اور باپ دادا کی خاندان کی عزت مٹی میں ملا دوں۔“

اجالا نے بھی انہیں حقیقت کا آئینہ دکھا دیا تو وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی عائنہ نظریں چراتی وہاں سے اٹھ کر چلی گئی اور سہیل نے شرمندگی سے سر پکڑ لیا۔ سعید فاروقی کے لئے اور ان کے خاندان کے لئے یہ انکشاف حیرت کا باعث تھا اجالا ان سب کو حیرت اور پریشانی میں ڈبو کر باہر نکل آئی۔

”رشید محل“ کو چھوڑتے ہوئے اس کا دل رور ہا تھا روح تڑپ رہی تھی اور آنکھیں بھیگ رہی تھیں وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر ”رشید محل“ کی روش سے گاڑی باہر نکال کر لے جا رہی تھی اس لمحے سہیل نے تڑپنے دل اور بھیکتی آنکھوں سے اسے دور تک دیکھا تھا دیکھا تو اجالا نے بھی تھا مگر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔

”سوری سہیل بھائی! میں آپ کا دل نہیں دکھانا چاہتی تھی مگر حالات کا تقاضا یہی تھا آپ کے اور میرے راستے جدا جدا ہیں ہم اچھے دوست ہمیشہ رہیں گے اور میں آپ کو بھائی کی حیثیت سے پہلے جیسا مقام اور عزت ہمیشہ دیتی رہوں گی۔“ اجالا نے سہیل کو اپنے دل میں مخاطب کر کے کہا اور ”حمیدولا“ کی جانب گاڑی کا رخ موڑ دیا۔

”السلام وعلیکم!“ اجالا نے ”حمیدولا“ کے ڈاننگ روم میں قدم رکھا جہاں حمید فاروقی صائمہ بیگم نوید اور ولید کھانا کھا رہے تھے۔

”وعلیکم السلام! اجالا بیٹی آؤ آؤ کیسی ہو چندا؟“ حمید فاروقی نے اسے دیکھتے ہی حیرت اور مسرت کا اظہار کیا اور کھانے سے ہاتھ روک کر اٹھتے ہوئے بولے۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں پایا آپ سب کیسے ہیں؟“

”ہم بھی ٹھیک ہیں آؤ بیٹا کھانا کھاؤ۔“

”السلام وعلیکم آپ!“ نوید اور ولید نے اسے خوشی سے دیکھتے ہوئے ایک ساتھ سلام کیا۔

”وعلیکم السلام کیا حال ہے میرے بھائیوں کا ٹھیک ہو؟ وہ ان کے برابر کرسی پر بیٹھتے ہوئے دونوں کو پیار سے چھوتے ہوئے پوچھ رہی تھی اور صائمہ بیگم کی تیوریوں پر بل پڑتے جا رہے تھے۔

”جی! آپ! آپ اتنے دن بعد آئی ہیں ہم سے ملنے آج ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے۔“

ولید نے محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ خوش ہو کر مسکراتے ہوئے بولی۔

”آج میں ہمیشہ کے لئے آپ کے گھر آگئی ہوں اب میں کہیں نہیں جاؤں گی یہیں رہوں گی اپنے بھائیوں کے پاس۔“

”خیریت یہ تم اچانک کیسے یہاں چلی آئیں اور وہ بھی ہمیشہ کے لئے؟“ حمید فاروقی اور صائمہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا تھا صائمہ بیگم پوچھے بتا رہی نہ سکیں۔

”تائی اماں اور تائی امی مجھے شروع ہی سے ناپسند کرتی تھیں اب انہوں نے مجھے گھر سے نکل جانے کا کہہ دیا میں تو پہلے ہی آنا چاہ رہی تھی سو آگئی۔“ اس نے انہیں دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

”بیٹا تم نے مجھے یہ سب کبھی بتایا میں تو سمجھتا رہا کہ تم وہاں خوش ہو آرام سے سکون سے ہو۔“ حمید فاروقی نے صدمے سے دوچار ہو کر کہا۔

”پاپا! باقی سب تو ٹھیک ہی تھے میرے ساتھ بس تائی اماں اور تائی امی کا رویہ بہت تلخ اور ہنک آمیز نفرت بھرا رہا ہے میرے ساتھ آپ کو بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی ان کا کہنا ہے کہ میں کوئی یتیم یا لاوارث نہیں ہوں جو ان کے گھر میں پڑی ہوں حالانکہ آغا جان نے ”رشدِ محل“ میرے نام کر دیا تھا فارم ہاؤس اور گاڑی بھی میرے نام ہے اور کچھ (کیش) رقم بھی بینک اکاؤنٹ میں موجود ہے، پاپا! میں آپ سے پوچھنے آئی ہوں کہ کیا آپ کے گھر میں اپنی بیٹی کے لئے جگہ ہے پاپا؟“

”اجالا بیٹا! کیسی باتیں کر رہی ہو یہ پورا گھر تمہارا ہے تم اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھو تمہارا کمرہ

سیٹ ہے سجا ہوا ہے تم وہاں ایسے رہو جیسے اپنے گھر میں رہتے ہیں میں سعید بھائی اور وحید بھائی سے بات کروں گا انہوں نے بھی تمہارا خیال نہ کیا۔“ حمید فاروقی نے اس کے سر پر دست شفقت رکھ کر پدرانہ محبت سے لبریز لہجے میں کہا۔

”کچھ تو کام اس نے بھی دکھایا ہوگا اب سعید بھائی اور وحید بھائی ایک دم سے تو اسے وہاں سے نہیں نکال سکتے نا۔“ صائمہ بیگم نے پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے کہا اجالا نے دکھ سے انہیں دیکھا اسے لگا کہ اس کا یہاں رہنا آسان ہرگز نہیں ہوگا۔

”مجھے تائی اماں اور تائی امی نے گھر سے نکالا ہے میرے ہی گھر سے نکالا ہے مجھے محض اس لئے کہ ان کے بیٹے ان کی پسند کی لڑکی سے شادی کرنے سے انکار کر رہے ہیں اور وہ دونوں مجھے تصور وار سمجھتی ہیں حالانکہ میں نے ان تینوں کو ہمیشہ اپنا بھائی سمجھا ہے وہ کسی اور کو پسند کرتے ہیں ویسے بھی ان خواتین کو تو مجھ سے شروع سے ہی خدا واسطے بیر ہے لیکن اب میں مزید برداشت نہیں کر سکتی اس لئے یہاں چلی آئی کیونکہ یہ گھر میرے پاپا کا ہے اور باپ کے گھر پر بیٹی کا حق ہمیشہ قائم رہتا ہے۔“ اجالا نے صائمہ بیگم کو دیکھتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

”ہونہہ..... حق۔“ صائمہ بیگم نے سلگ کر سر جھٹکا۔

”اجالا بیٹا! تم آرام سے یہاں رہو اور صائمہ میری بیٹی گیارہ برس تک مجھ سے دور رہی ہے صرف تمہاری وجہ سے لیکن اب اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی برداشت نہیں کروں گا میں۔“ حمید فاروقی نے صائمہ بیگم کو دیکھتے ہوئے رعب سے کہا۔

”مجھے بھی بلا وجہ کی بک بک پسند نہیں ہے سمجھا دیجئے گا اپنی لاڈلی کو۔“ صائمہ بیگم نے غصے سے تپ کر کہا اور کھانے کی میز سے اٹھ کر چلی گئیں۔

”پتا نہیں اسے تم سے کیا خطرہ ہے بیوقوف عورت۔“ حمید فاروقی نے صائمہ بیگم کے جاتے ہی تاسف سے سر ہلا کر کہا۔

”چھوڑیں پاپا آپ کھانا کھائیں مجھے بھی بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ اجالا کو واقعی بہت بھوک لگ رہی تھی اس نے سنجیدگی سے کہا اور خود بھی اپنے لئے پلیٹ میں سالن نکالنے لگی۔

☆☆☆

”دیکھ لیا بڑے میاں کیسے چالاک نکلے کروڑوں کی جائیداد اجالا کے نام لکھ گئے جیسے صرف

وہی ان کی پوتی ہو باقی سب تو پرائے تھے جائیداد والی بات ہضم نہیں ہو رہی تھی سعید فاروقی سے بہت غصے سے مخاطب ہو کر کہا تو وہ پہلی بار اتنے غصے سے ان سے گویا ہوئے۔

”اپنے پن کا ثبوت بھی تو نہیں دیا کسی نے دیا ہوتا تو آج وہ بچی بھی اس گھر میں ہوتی اور جائیداد بھی میرے چھوٹے بھائی کی بن ماں کی بچی تھی وہ تم نے اسے آج تک کیا دیا ہے۔ سوائے طعنوں تشوؤں کے نجانے کون سے خار پال رکھے ہیں۔ تم نے اپنے من میں جن سے اجالا کو زخمی کرنے کا کام لیتی رہی ہو۔ اب تک اور یہ عائشہ کا کیا معاملہ ہے کس لڑکے کے ساتھ پھرتی رہی ہے وہ؟“

”ارے الزام لگایا ہے اس منحوس نے۔“

”الزام تو تم نے لگایا ہے اس معصوم پر اس نے تو صرف تمہیں آئینہ دکھایا ہے کان کھول کر سن لو اب اگر اجالا کے بارے میں تم نے یا کسی اور نے زہرا گلا تو میں اس کی زبان کھینچ لوں گا اور کہاں ہے عائشہ بلاؤ ذرا اسے۔“ سعید فاروقی غصے سے آگ بگولہ ہو رہے تھے بلند اور تیز لہجے میں بولے تو عشرت بیگم کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور باہر سے گزرتی عائشہ کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔

”میں نے سمجھا دیا ہے اسے اب آپ کیا جوان بیٹی سے ایسی باتیں پوچھیں گے۔“ عشرت بیگم نے سٹپا کر کہا تو وہ درشتی سے بولے۔

”اگر جوان بیٹی ماں باپ کی عزت کا جنازہ نکالنے کے اقدام کر سکتی ہے تو اس سے ایسی باتیں پوچھی جاسکتی ہیں تم لوگوں نے میری نرمی اور ڈھیل سے بہت ناجائز فائدہ اٹھایا ہے میں بڑا بیٹا تھا اس گھر کا مگر میں نے بڑا ہونے کا حق ادا نہیں کیا مگر اب ایسا نہیں ہوگا اب وہی ہوگا جو میں کہوں گا۔ اور جو میں بہتر سمجھوں گا بہت من مانی کر لی تم نے دوسروں کی بن ماں کی بچی پر الزام دھرتے ہوئے تمہیں اپنی بیٹی کے کروت یا تو نہیں آئے وہ تو بن ماں کے اور باپ کے بغیر یہاں رہ کر بھی تمہارا اخلاق میں پروان چڑھی ہے۔ اور تمہاری بیٹی تم جیسی ماں کے زندہ ہوتے ہوئے اخلاق اور کردار کے دائرے سے باہر نکل گئی شرم آنی چاہیے تمہیں ایک بیٹی کی تربیت تو تم سے ہو نہ سکی اور میری معصوم بچی پر تہمت دھر رہی تھیں شکر کرو کہ ابھی عزت کی نیلامی کے ڈنکے پورے شہر میں نہیں بجے ورنہ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔“

”آہستہ بولیں اگر کسی نے سن لیا تو سارے خاندان میں ڈنڈورا پیٹ دے گا ارے ہمیں عائشہ کی شادی بھی تو کرنی ہے آپ کیوں بات کو اچھال رہے ہیں ابھی کچھ نہیں بگڑا تھا اور وہ پلٹ آئی تھی آپ اب اس کی شادی کی فکر کریں میں نے تو سوچا تھا کہ سعد سے بیاہ دوں گی مگر وہ تو کسی اور لڑکی کو پسند کرتا ہے۔“ عشرت بیگم نے ندامت اور خجالت کو بھلا کر آہستگی سے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

”یہ تو ہونا ہی تھا تمہاری لڑکی میں اتنے گن ہوتے تو سعد باہر کی لڑکی کو کیوں پسند کرتا اور کرو اجالا کی برائی جی بھر کے حسد کرو اس سے دیکھ لیا خدا نے کیسا آئینہ دکھایا ہے تمہیں مگر تم سمجھو تو تب تا جب تمہیں اپنی زیادتیوں اور غلطیوں کا احساس و ادراک ہو تم تو حسد میں جل جل کر ہی بے عقل ہو گئی ہو۔“ سعید فاروقی نے طنزیہ اور تیز لہجے میں ان سے کہا تو وہ شرمندگی سے بستر میں منہ چھپا کر لیٹ گئیں اور اپنی اس عزت افزائی پر ٹسوے بہانے لگیں۔

☆☆☆

دوسرے دن اجالا یونیورسٹی سے گھر آئی تو صائمہ بیگم کسی سے فون پر باتیں کر رہی تھیں اور اسی کا ذکر ہو رہا تھا لہذا وہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر ہی رک کر ان کی باتیں سننے لگی۔

”آپ بھی کمال کرتی ہیں بھابھی بیگم! سونے کی چڑیا کو اپنے ہی آنگن سے اپنے ہی ہاتھوں سے اڑا دیا۔“ صائمہ بیگم نے ان کی کم عقلی پر طنز کرتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“ عشرت بیگم نے پوچھا۔

”ویسے تو آپ بہت چالاک بنتی ہیں اب کس رقابت میں کروڑوں کی لڑکی کو جانے دیا اجالا کے نام آغا جان نے اپنا فارم ہاؤس لاکھوں کیش روپیہ گاڑی اور ڈیڑھ دو کروڑ کی لاگت کا ”رشید محل“ کر دیا ہے اجالا اب اس پر اپرٹی کی تنہا وارث ہے آپ اور ہم تو اتنی پر اپرٹی کے خواب ہی دیکھ سکتے تھے مگر اجالا کو حقیقت میں یہ سب کچھ مل گیا ہے آپ کا بیٹا سہیل اگر اجالا کو پسند کرتا ہے تو آپ نے کیوں انکار کر دیا ذرا بیٹھے پن سے پیار دلار سے اجالا کو شیشے میں اتار کر سہیل کی دلہن بننے پر راضی کر لیتیں بیٹا بھی آپ کا احسان مند ہوتا کہ ماں نے اس کی پسند کو اہمیت دی ہے آپ کا فرمانبردار بن کر رہتا اور خاندان میں آپ کی واہ واہ بھی ہوتی کہ بن ماں کی لڑکی کو اپنے گھر میں پالا پوسا اور اپنی بہو بنالیا اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ اجالا سے سہیل کی شادی کر کے آپ اجالا

کی کروڑوں کی پراپرٹی حاصل کر سکتی تھیں اجالا کی جائیداد آپ کے بیٹے کو ہی ملتی نا اس کے شوہر کی حیثیت سے آپ نجائے کن دشمنوں کو گلے سے لگائے بیٹھی ہیں اب ذرا ایمان سے بتائیے کیا میں غلط کہہ رہی ہوں“ صائمہ بیگم نے بہت پتے کی بات کہی تھی اور آخر میں سوال بھی پوچھا تھا۔

”نہیں صائمہ تم سو فیصد درست کہہ رہی ہو آئے ہائے میں ہی کوڑھ مغز تھی مجھے حسد کی آگ نے جلا جلا کر راکھ کر دیا تھا اتنی عقل کی بات کیسے میرے دماغ میں آتی پتا نہیں میں کیوں آج تک غزالہ اور اس کی بیٹی سے خار کھاتی رہی غزالہ تو بہت اچھی بہت نیک عورت تھی اجالا بھی ماں کی ہمشکل اور ہم عمل ہے میری تو مت ہی ماری گئی تھی واقعی اگر میں سہیل اور اجالا کی شادی کروادوں تو اجالا کی جائیداد ہماری ہو جائے گی ہائے کاش! مجھے بروقت عقل آ جاتی میں اول نول بکنے میں مگن تھی غصے اور حسد نے ساری سدھ بدھ ہی سلب کر کے رکھ دی تھی چہ، چہ، چہ۔“ عشرت بیگم کو اپنی حماقت اور کم عقلی کا احساس ہوا تو بہت تاسف، افسوس اور بے چارگی سے بولیں۔

”اصل میں بھابھی بیگم آپ کو غزالہ کے حسن نے حسد پر مجبور کر دیا تھا وہی حسد آپ نے اجالا سے کرنا شروع کر دیا اور اجالا تو سچ بچ اپنے نام کی طرح اجالا ہے جس گھر میں بھی جائے گی اجالا بکھیر دے گی ابھی بھی کچھ نہیں گزرا اجالا کو یہاں سے منا کر یا سہیل کے سنگ بیاہ کر لے جائیں خوب رو بہو بھی آپ کی ہو جائے گی اور اس کی جائیداد بھی بیٹے کی احسان مندی الگ“ صائمہ بیگم کو معلوم تھا کہ حید فاروقی اب اجالا کو اس گھر میں نہیں جانے دیں گے اور نہ ہی اجالائیوں جائے گی وہ اجالا کا اپنے گھر میں وجود برداشت نہیں کر سکتی تھیں اسی لئے عشرت بیگم کو عقل دے رہی تھیں مشورے دے رہی تھیں اور اجالا کی جائیداد تو اسے وہ خود بھی حاصل کرنے کے طریقے پر غور کر رہی تھیں عشرت بیگم کے سامنے خود کو ان کا ہمدرد ظاہر کرنا مقصود تھا اس مشورے کے ذریعے سوال کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔

”صائمہ! تم نے تو میری آنکھوں پر بندھی حسد کی پٹی اتار چھین لی ہے۔“ عشرت بیگم نے کہا وہ دل میں بولیں۔

”اور لالچ اور حسد ہوس کی پٹی باندھ دی ہے۔“ صائمہ نے دل میں کہا۔

”تو پھر کب آ رہی ہیں اجالا کو منانے؟“

”جلد ہی آؤں گی دل تو نہیں مانتا مگر اس سے معافی مانگ لوں گی اور حید سے بھی معاف

مانگ لوں گی۔“ عشرت بیگم نے جلدی سے کہا۔

”ٹھیک ہے پھر آپ آنے کی تیاری کریں ویسے حمید بہت غصے میں ہیں اور بہت ناراض ہیں آپ لوگوں سے اس لئے سوچ سمجھ کر آئیے گا۔“

”تم فکر نہ کرو ہم منالیں گے دونوں کو اچھا تمہارا بہت بہت شکریہ آج تو تم نے کزن ہونے کا حق ادا کر دیا اتنے اچھے مشورے دے کر۔“ عشرت بیگم نے خوشی سے کہا۔

”حق کیسا یہ تو قرض تھا آپ کا مجھ پر آپ نے حمید جیسے امیر آدمی سے میری شادی کرائی ہے۔ تو میں نے بھی آپ کو مالدار بھولانے کی راہ دکھلا دی ہے اور اپنے ہی آپنوں کے کام آتے ہیں۔“ صائمہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک کہا تم نے۔“

”اچھا بھابھی بیگم خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔“ عشرت بیگم نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا تو ان کی نگاہ کمرے میں داخل ہوتے سہیل پر پڑی اور وہ اسے دیکھتے ہی خوشی سے بولیں۔

”سہیل تمہارے لئے بہت بڑی خوشخبری ہے میں تمہاری شادی اجالا سے کر رہی ہوں۔“

”لیکن امی، اب میں اجالا سے شادی نہیں کروں گا۔“

”کیا؟..... مگر کیوں؟“ عشرت بیگم پر جیسے بم پھٹ پڑا تھا۔

”امی! اجالا نے مجھے بھائی کہا اور سمجھا ہے اب میں بھی اسے اس رشتے کے احترام اور حوالے سے ہی ملوں گا ہمیشہ۔“ سہیل اپنی بات مکمل کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا عشرت بیگم اسے جاتا دیکھ کر بڑبڑانے لگیں۔

”لودماغ خراب ہو گیا ہے اس لڑکے کا کل تک تو اجالا کے عشق میں پاگل ہوا جا رہا تھا اب ایک دن میں بھائی بن بیٹھا ارے کزن تو بھائی بہن ہوتے ہی ہیں شادی سے پہلے بعد میں بھائی بہن تھوڑی رہتے ہیں میں تو ضرور جاؤں گی حمید سے اجالا کا ہاتھ مانگنے ارے کروڑوں کی جائیداد اتنی آسانی سے تو میں ہاتھ سے نہیں جانے دوں گی۔“

”السلام وعلیکم!“ اجالا نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا۔

”وعلیکم السلام! تم کب آئیں؟“ صائمہ بیگم اسے دیکھ کر ذرا سانس روں ہوئیں پھر فوراً ہی

سنجھل کر پوچھا۔

”بس ابھی آئی ہوں۔“

”تمہاری تائی اماں کا فون آیا تھا آج وہ تمہیں گھر سے نکال کر بہت پچھتا رہی ہیں تمہیں منانے کے لئے آنا چاہتی ہیں۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”ان سے کہہ دیجئے کہ انہیں زحمت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اب اگر وہ یہاں آ کر ناک بھی رگڑیں گی۔ تب بھی میں ان کے ساتھ نہیں جاؤں گی انہیں میری نہیں میری پر اپرٹی کی چاہ یہاں آنے پر اکسائے گی اور ان کے بیٹے میرے بھائیوں جیسے ہیں بھول جائیں وہ کہ میں ان کی بہو بنوں گی یہ سونے کی چڑیا اور کروڑوں کی لڑکی ان کی بہو ہرگز نہیں بنے گی۔“ اجالا نے صائمہ بیگم کے الفاظ دہرائے تو وہ شیشا گئیں۔

”تو یہاں تم کب تک رہو گی؟“

”جب تک ایک بیٹی اپنے باپ کے گھر میں رہتی ہے۔“

”یہ گھر تمہاری ماں کا نہیں ہے میرا ہے سمجھیں۔“ صائمہ بیگم نے اپنا حق جتایا۔

”یہ گھر میرے باپ کی کمائی سے خریدا اور سجایا بنایا گیا ہے اور باپ کے گھر پر بیٹی کا حق ہمیشہ قائم رہتا ہے آپ کے شو پر پہلے میرے پاپا ہیں بعد میں آپ کے شو ہر اور آپ کے بچوں کے ”پاپا“ ہیں پہلی اولاد تو یوں بھی زیادہ پیاری اور لاڈلی ہوتی ہے۔“ اجالا نے نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں جی پیاری اور لاڈلی بیٹی پاپا سے دور رہی اتنے برس۔“

”صرف آپ کی وجہ سے۔“ اجالا نے انہیں دیکھتے ہوئے یاد دلایا۔

”اگر میں پاپا کو علیحدہ گھر لے کر رہنے پر آمادہ نہ کرتی تو کبھی نہ مانتے اور میں نے ہی ”رشید

محل“ میں ہمیشہ رہنا قبول کر لیا تھا تا کہ پاپا کی زندگی سکون سے گزر سکے ورنہ آپ تو اسی وقت پاپا کی زندگی سے چلی گئی ہوتیں وہ اگر اپنی نیک سیرت اور محبوب بیوی کے بغیر رہ سکتے تھے تو آپ جیسی خود غرض اور بے حس عورت کے بغیر تو بخوشی جی سکتے تھے۔“ اجالا نے سنجیدگی سے کہا تو وہ تلملا کر رہ گئیں انہیں یاد آ رہا تھا ایک بار حمید فاروقی نے بھی انہیں اسی قسم کی بات کہی تھی اور انہیں دل ہی دل میں ناچاہتے ہوئے بھی یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اس وقت اگر اجالا نے سمجھداری اور اعلیٰ ظرفی

کا ثبوت نہ دیا ہوتا تو حالات یکسر مختلف ہوتے وہ میکے بیٹھی ہوتیں یا پھر رشید محل کی بھول بھیلوں میں گم ہو جانے پر مجبور ہو جاتیں۔

”تب کی بات اور تھی حمید اب مجھے بہت چاہتے ہیں اور میں ان کے دو بیٹوں کی ماں ہوں مجھے کوئی ڈر نہیں ہے ان کے وارث میں نے پیدا کیے ہیں وہ مجھے نکال کر تو دیکھیں اس گھر سے وہ تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔“ صائمہ بیگم نے فوراً اپنی پرانی روش اپناتے ہوئے بڑے زعم سے کہا۔

اللہ کرے کہ وہ ایسا سوچیں بھی نہیں کیونکہ بچے ماں کے بغیر ادھورے رہ جاتے ہیں دوسروں کے رحم و کرم پر آ جاتے ہیں لیکن بیٹوں کی ماں ہونا کوئی کمال نہیں ہے آنٹی جی اور ویسے بھی اس خاندان کی عورتوں کو آپ جیسی خواتین کو اپنے شوہروں کی نرمی اور کشادہ دلی سے ناجائزہ فائدہ اٹھانے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ اجالا نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی صائمہ بیگم غصے سے کھڑی پیچ و تاب کھاتی رہ گئیں۔

سہیل نے فون کر کے اجالا کو بھی بتا دیا تھا کہ وہ اس کے بھائی کہنے کا مان رکھے گا اور اسے بھائی بن کر ہی ملے گا اجالا اس کے جواب سے مطمئن ہو گئی تھی پھر ایک شام عشرت بیگم سعید فاروقی کشور بیگم اور وحید فاروقی ”حمیدولا“ چلے آئے وہ سب خاص کر عشرت بیگم حمید فاروقی اور اجالا سے اپنے رویے پر معافی مانگ رہی تھیں اجالا چونکہ ساری حقیقت سے واقف تھی اس لئے ان کی منافقانہ روش پر اس اداکاری پر دل ہی دل میں ہنس رہی تھی۔

”حمید، ہم تم سے معافی مانگتے اور سہیل کے لئے اجالا کا ہاتھ مانگنے آئے ہیں ہم اپنی ساری غلطیوں اور زیادتیوں کی تلافی کر دیں گے بس تم ایک بار ہاں کر دو ہمیں ایک موقع دے دو۔“ عشرت بیگم نے حمید فاروقی کو دیکھتے ہوئے بہت اصرار سے لجاجت اور منت سے کہا۔

”بھابھی! اجالا آپ کے سامنے بیٹھی ہے اس سے پوچھ لیجئے یہ کیا چاہتی ہے ویسے میں اب اسے وہاں بھیجنے کے حق میں نہیں ہوں میں اپنی بیٹی کو اب اپنے پاس ہی رکھنا چاہتا ہوں بہت سزا کاٹ لی ہے ہم دونوں نے ایک دوسرے سے دوری کی۔“ حمید فاروقی نے اجالا کو دیکھ کر عشرت بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”حمید یار! بیٹیاں تو ہوتی ہی پر ایادھن ہیں انہیں ایک نہ ایک دن باپ کا گھر چھوڑ کر سسرال جانا ہی پڑتا ہے اور وہ گھر تو ہے ہی اس کا پھر کیا اعتراض ہے سہیل تمہارے سامنے کا بچہ ہے تمہاری

گود میں کھیلا ہے اس رشتے سے ہمارا تعلق اور مضبوط ہو جائے گا۔“ سعید فاروقی نے سنجیدگی سے نرمی سے کہا۔

”بھائی جی! خواہش تو میری بھی یہی تھی کہ گھر کی بچی گھر ہی میں بیاہی جائے گی تو میری نظروں کے سامنے رہے گی مگر اس سارے عرصے میں ان تمام سالوں میں آپ کی آنکھوں کے سامنے میری بچی پر جو ظلم ہوتا رہا اس کی جو حق تلفی ہوتی رہی اور پھر جس طرح بھائیوں نے اس کو اس کے ہی گھر سے نکل جانے کا حکم صادر کر دیا اور آپ خاموش تماشا بنے رہے اس نے مجھے بہت دکھ دیا ہے میں جانتا ہوں کہ سہیل اچھا لڑکا ہے اور اجالا کے ساتھ مخلص بھی ہے مگر اب تو وہ بھی اجالا سے ایسا کوئی رشتہ استوار نہیں کرنا چاہتا اس نے مجھے فون کر کے بتا دیا ہے کہ وہ اجالا کا بھائی بن کر دکھائے گا باقی آپ اجالا کی مرضی پوچھ لیں یہ جو کہے گی وہی ہوگا مجھے اس کی خوشی اپنی مرضی سے بڑھ کر عزیز ہے۔“ سعید فاروقی نے سنجیدگی سے کہا تو عشرت بیگم نے جلدی سے کہا۔

”سہیل دودن میں تھوڑی بدل سکتا ہے اسے اجالا کے انکار اور ہماری حماقتوں نے ایسا کہنے پر مجبور کر دیا ہے ہم اسے سمجھالیں گے منالیں گے اور اجالا بیٹا تم بھی ہمیں معاف کر دو۔“

”تائی اماں! معافی تک تو بات ٹھیک ہے میں نے آپ کو معاف کر دیا ہے لیکن نہ تو میں سہیل بھائی سے شادی کروں گی اور نہ واپس ”رشدِ محل“ جاؤں گی یہاں کبھی کبھار آپ لوگوں سے ملنے اور اپنے گھر کو دیکھنے آتی رہوں گی فی الحال آپ لوگ وہاں رہ سکتے ہیں۔“ اجالا نے سنجیدگی سے کہا تو عشرت بیگم دل ہی دل میں اسے گالیاں دینے لگیں۔

”بیٹا! ہم گھر چھوڑ دیں گے تم سہیل کے ساتھ اکیلی وہاں رہنا بس تم اس رشتے کے لئے ہاں کر دو۔“ عشرت بیگم کو اس کی دولت جاتی دکھائی دی تو ملامت سے بولیں۔

”ایک بہن اپنے بھائی کی بیوی بننے کے لئے کیسے ہاں کر سکتی ہے تائی اماں سہیل بھائی میرے بھائی ہیں چلیں مانا کہ سگے بھائی نہیں ہیں اور میں ان سے شادی کے لئے راضی بھی ہو جاتی ہوں تو کیا آپ مجھے حمیز کے بغیر کسی قسم کی پراپرٹی کے بغیر ان تین کپڑوں میں قبول کرنا پسند کریں گی؟“ اجالا نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”تین کپڑوں میں مگر تم تو کروڑ پتی ہو۔“ عشرت بیگم کی زبان پھسل گئی۔

”اگر میں کروڑ پتی نہ رہوں اپنی ساری پراپرٹی کسی فلاحی ادارے کو ڈونٹ کر دوں تو کیا

میں آپ کو تین کپڑوں میں قبول ہوں گی۔“ اجالا نے سنجیدگی سے پوچھا۔
 ”ارے کیوں مذاق کرتی ہو بیٹا تم تو ہمارا خون ہو ہم تمہیں قبول کرنے سے کیسے انکار کر سکتے ہیں اور بیٹا پہلا حق تو اپنے خون کا ہوتا ہے اپنوں کا ہوتا ہے بعد میں دوسرے بھی فائدہ اٹھا لیں تو کوئی حرج نہیں۔“

”گویا اہمیت پیسے کی ہوئی نا اس کے بغیر تو آپ مجھے بہو تو کیا اس خاندان کا خون بھی نہیں مانیں گی۔“ اجالا نے مسکرا کر کہا تو وہ جھل ہو کر نظریں چرا گئیں۔
 ”اجالا یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا یہ تم سے بڑی ہو کر معافی مانگ رہی ہیں اور تم طنز کر رہی ہو۔“ صائمہ بیگم نے اسے گھورتے ہوئے ٹوکا۔

”میں طنز نہیں کر رہی صائمہ آنٹی وہی کہہ رہی ہوں جو سچ ہے آپ مجھے اس گھر میں رکھنا نہیں چاہتیں اور تائی اماں مجھے اس گھر میں جائیداد کی وجہ سے رکھنا چاہتی ہیں ورنہ انہوں نے تو مجھے اس گھر سے نکل جانے کا حکم جاری کر دیا تھا میں سونے کی چڑیا اور کروڑوں کی لڑکی ہوں یہ آپ ہی نے تو انہیں یاد دلایا تھا جیسی تو یہ یہاں آئی ہیں مگر پھر بھی میں انہیں معاف کرتی ہوں غلطی اگر بڑوں کی ہو قصور وار اگر بزرگ ہوں تو ان کے معافی مانگنے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ ان کا قد ہی اونچا ہوتا ہے بڑوں کو صحیح معنوں میں بڑا بن کر ہی دکھانا چاہیے اسی میں ان کی بڑائی ہے“ اجالا نے صائمہ بیگم اور عسرت بیگم کو کشور بیگم کو دیکھتے ہوئے کہا وہ تینوں شرمندہ سی نظریں جھکا گئیں۔

”میری بیٹی کھلونا نہیں ہے جسے آپ اپنے سہیل کا حصہ بنا رہے ہیں اجالا کی پرورش بھی آپ میں سے کسی نے نہیں کی آغا جان اور بی جان کی آغوش میں پلی بڑھی ہے یہ آپ میں سے کسی کا کوئی احسان نہیں یہ مجھ پر یا میری بیٹی پر جب لڑکا لڑکی ہی راضی نہیں ہیں تو یہ رشتہ بھی نہیں ہو سکتا بہتر یہ ہے کہ ہم اپنا رشتہ ہی دل سے نبھانے کی کوشش کریں میری بیٹی کا جہاں نصیب لکھا ہو گا یہ وہاں بیاہی جائے گی۔“ حمید فاروقی نے کہا تو سب کو گہری چپ لگ گئی اور ایک ایک کر کے سب اٹھ کر چلے گئے۔

”ہمیں تو تم بڑی عقل دے رہی تھیں کہ جائیداد گھر آجائے گی۔ سہیل سے اجالا کی شادی کرنے سے مگر صائمہ بی بی تمہارے گھر میں یہ جائیداد موجود ہے تم کیوں نہیں اسے کیش کروا تیں عسرت بیگم نے صائمہ کو اگلے دن فون کر کے کہا۔“

”جائید ادا جالا کے نام ہے شادی کے بعد بھی اس کی رہے گی میرے کس کام کی اس کی جائیداد میرا کوئی ہوتا کنوارہ تو میں سوچتی بھی اب کون سا طریقہ ہے جو کروڑوں کی پراپرٹی میں اپنے نام لکھوا سکوں؟“ صائمہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا تو عشرت بیگم نے مشورہ دیا۔

”بہانے سے اپنے بیٹوں کے نام کروا ہی سکتی ہو یا حمید کے نام کروالو۔“

”نہ بھی حمید آج کل بیٹی کی محبت میں مرے جا رہے ہیں آپ لوگوں کا حسن سلوک انہیں چین نہیں لینے دے رہا اس لئے ان سے اجالا یا اس کی پراپرٹی کے متعلق کوئی بات نہیں ہو سکتی۔“

”ٹھیک ہے تمہاری مرضی سونے کی کان تو اب تمہارے ہی گھر میں ہے۔“ عشرت بیگم نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

”اور یہ سونے کی کان اب میرے ہی گھر میں رہے گی میں اجالا کو بدنام کر دوں گی کوئی اس سے شادی نہیں کرے گا اور پھر وہ یہیں رہے گی اس کی جائیداد کا فائدہ ہم اٹھائیں گے۔“ صائمہ بیگم نے سازشی انداز میں سوچتے ہوئے کہا ان کے لبوں پر دمکارانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

وہ ولید اور نوید کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے لگی ان کے ساتھ کھیلتی انہیں پڑھاتی ہوم ورک کرواتی۔ اس کے اپنے امتحان کا پہلے سال کارزلٹ آیا تو اس کی کامیابی شاندار تھی ادھر صائمہ بیگم اور عشرت بیگم نے خاندان میں سب لڑکوں کی ماؤں سے یہ کہہ دیا کہ اجالا نے سہیل اور سعد وغیرہ کو چکر دیا تھا اس لئے ”رشید محل“ سے اسے نکال دیا گیا سب حیران تھے کہ اجالا ایسا کیسے کر سکتی ہے۔ وقت گزرتا رہا صائمہ بیگم آتے جاتے اس پر جملے کسا کرتیں اسے طنز کا نشانہ بناتیں اور وہ سہہ جاتی۔

ایک دن سرگودھا سے صائمہ بیگم کا بھانجا عارف ان سے ملنے اور جاب کے سلسلے میں انٹرویو دینے کے لئے ”حمید ولا“ آیا اسے انٹرویو تک انہیں کے گھر ٹھہرنا تھا اجالا نے اسے سلام کرنے کے بعد لفٹ نہیں کرائی اور اپنے کمرے میں چلی گئی دو دن بعد جب وہ انٹرویو دے کر گھر لوٹا تو وہ لان میں بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی عارف اسے دیکھ کر وہیں چلا آیا۔

”السلام علیکم!“ عارف نے بہت مودب لہجے میں سلام کیا۔

وعلیکم السلام اجالا نے ایک نظر اس پر ڈال کر جواب دیا اور نظریں دوبارہ کتاب پر جمالیں۔

”کیسی ہیں آپ؟“ عارف نے اس کے سامنے رکھی لان چیئر پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”الحمد للہ بہت اچھی ہوں۔“

”مگر خاندان میں تو کچھ اور ہی مشہور ہے آپ کے بارے میں۔“

”کیا مشہور ہے میرے بارے میں؟“ اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”یہی کہ آپ کو رشید محل سے آپ کی نازیبا حرکتوں کے باعث نکال دیا گیا تھا اور آپ کی

دوستی لڑائی سے ہے“ وہ جھکتے ہوئے بولا تو اس کا خون کھول اٹھا غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”کن لڑکوں سے، سہیل بھائی، روحیل اور سعد بھائی وہ تینوں میرے بھائیوں جیسے ہیں اور

میں نے انہیں ہمیشہ اپنا بھائی سمجھا اور کہا ہے اسی لئے عشرت تائی کی بہو بننے سے انکار کر دیا تھا سعد

بھائی کسی اور لڑکی کو پسند کرتے ہیں اور بدنام مجھے کیا جا رہا ہے ہونہ اور وہ لوگ مجھے کیا نکالیں گے

”رشید محل“ سے میں تو خود ان کم ظرف اور سطحی سوچ رکھنے والی خواتین کو چھوڑ کر آئی تھی عشرت تائی

اپنی بیٹی کے کرتوت میرے سر منڈھ کر سمجھتی ہیں۔ کہ خود شان سے کھڑی رہے گی عارف صاحب!

”رشید محل“ میری ملکیت ہے میں چاہوں تو ایک دن میں ان سے کو وہاں سے نکل جانے کا نوٹس

بھجوا سکتی ہوں میری نرمی اور خاموشی کا ناجائزہ فائدہ اٹھا رہے ہیں جوہ لوگ اور یہ سازشی واہیات

باتیں آپ کو آپ کی خالہ صائمہ بیگم اور عشرت بیگم کے ذریعے ہی ملی ہوں گی ناں۔“ اجالا نے

غصیلے لہجے میں کہا۔

”ہاں مگر.....“

”آپ پلیز اندر جائیے آپ کی خالہ جان نے آپ کو مجھ سے باتیں کرتے دیکھ لیا تو ایک

نیا اسکینڈل گھڑیں گی خاصی ماہر ہیں وہ اس کام میں۔“ اجالا نے سپاٹ اور تیز لہجے میں کہا۔

”لیکن خالہ ایسی تو نہیں ہیں۔“ عارف نے حیران ہو کر کہا۔

”وہ ایسی ہی ہیں میں صائمہ آنٹی کو بارہ سال سے دیکھ رہی ہوں شروع دن سے ان کی

نفرت کا نشانہ بنتی رہی ہوں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہوں ان کی آنکھوں میں حالانکہ اب آنٹی ہوں

میں پاپا کے پاس پتا نہیں آنٹی کس کمپلیکس میں مبتلا ہوں جائیے آپ ورنہ میرے ساتھ آپ کو بھی

بدنام کر دیں گی کہ میں نے آپ کو ورغلا دیا ہے پھنسا دیا ہے۔“ اجالا نے غصے سے تیز لہجے میں کہا وہ

حیرانگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”آپ سے تو میری بات ہی اب ہو رہی ہے میں نے تو ایسا کچھ نہیں دیکھا آپ میں اور نہ

ہی سنا ہے پھر وہ سب باتیں۔“

”آپ کی خالاؤں نے پھیلائی ہیں۔“

”آپ صائمہ خالہ کو آنٹی کیوں کہتی ہیں امی کیوں نہیں کہتیں؟“

”جس دن وہ مجھے بیٹی کہنے اور سمجھنے لگیں گی اس روز میں بھی انہیں امی کہنے لگوں گی۔“ اجالا نے متشعش دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”اوا آئی سی۔“

”آ رہی ہیں آپ کی شکی مزاج اور فتنہ پرداز خالہ جان۔“ اجالا نے دروازے سے باہر آتی

صائمہ بیگم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ ڈرتی ہیں ان سے۔“ عارف نے اس کے صبح چہرے کو بغور دیکھا۔

”کیوں میں ان سے کس لئے ڈروں گی؟“ اجالا نے الٹا اسی سے سوال کر دیا۔

”یونہی۔“

”مجھے اللہ کے سوا کسی سے ڈرنے کا شوق ہے اور نہ ہی عادت۔“

”دیری گڈ۔“ عارف مسکرایا۔

”عارف تم کب آئے؟“ صائمہ بیگم سر پر پہنچ چکی تھیں اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بس ابھی آیا ہوں۔“

”اور یہیں جم کر بیٹھ گئے کیا باتیں ہو رہی تھیں اس سے؟“

”کچھ خاص نہیں میں ان سے ان کی پڑھائی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔“ عارف کو ان کی

شکی نظروں لمحے اور لفظوں نے چونکا دیا اس نے فوراً بات بتالی۔

”پڑھائی کیا ہونی ہے سیر سپاٹے کرنے اور لڑکوں سے ملنے کے بہانے ہیں سب“ صائمہ

بیگم نے طنز سے مسکراتے ہوئے کہا اور کرسی پر بیٹھ گئیں۔

اجالا نے عارف کی طرف دیکھا اس نے بھی اسی لمحے اسے دیکھا تو گویا وہ اپنی باتوں کی

تصدیق چاہ رہی تھی اور عارف شرمندہ سا ہو گیا تھا اپنی خالہ کی سوچ پر بات پر۔

”ارے نہیں خالہ جان! یہ تو ہمیشہ ٹاپ کرتی ہیں اور پڑھائی کیے بغیر تو ٹاپ پوزیشن حاصل

نہیں کی جاسکتی نا۔“ عارف نے مسکرا کر کہا۔

”اچھا تم اندر جاؤ اور فریش ہو جاؤ میں آ کر کھانا لگواتی ہوں۔“ صائمہ بیگم نے لا جواب ہو کر اسے وہاں سے اندر بھیجنے کے لئے کہا۔

”جی بہتر۔“ وہ ایک مسکراتی نگاہ اجالا کی طرف ڈالتا اندر کی جانب بڑھ گیا اس کا صائمہ خالہ کا برسوں پرانا منیج لمبے بھر میں خراب ہو گیا تھا ان کی سوچ پر اسے بہت افسوس ہو رہا تھا وہ اپنے رشتے داروں سے تو بہت خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے مہذب طریقے سے ملتی تھیں اس لئے عارف کو تو ان کے اس لب و لہجے اور انداز گفتگو نے کافی مایوس کیا تھا۔

”تو اب تم نے میرے بھانجے پر ڈورے ڈالنا شروع کر دیے کسی آئے گئے کو بخشو گی بھی تم۔“ صائمہ بیگم نے اجالا کو شعلہ بار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”بخشنے والی ذات تو اللہ تعالیٰ کی ہے آنٹی جی اور رہ گیا آپ کا بھانجا تو وہ کوئی لحاف ہے جو میں اس میں ڈورے ڈالوں گی سنبھال کر رکھیں اپنے بھانجے کو اپنے پاس میں نے اسے یہاں بیٹھنے کی دعوت نہیں دی تھی موصوف خود ہی چلے آئے تھے۔“ اجالا نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

”ہاں آں بھی تمہارے حسن کی کشش کھینچ لاتی ہے سب کو بہت شوق ہے۔ اپنا حسن کیش کرانے کا تو۔“

بس آنٹی آگے کچھ مت کہیئے گا اجالا ان کی بات کاٹ کر بولی اور اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔
 ”میں تو کم عمر ہوں نادان ہوں ایسی نادانیاں کر سکتی ہوں مگر آپ کیوں بچی کی طرح بی ہیو کرتی ہیں چالیس پینتالیس کی ہو کر اتنی بالغ اور بڑی ہونے کے باوجود بھی آپ کی سوچ اتنی پست اور نا پختہ ہے اپنی اور میری عمر کا فرق دیکھیں اور مجھ سے اپنا رویہ دیکھیں کسی اپنی ہم عمر عورت سے یہ گل افشانی کر کے دیکھیں تب آپ کو لگ پتا جائے گا آپ کی باتیں سن کر تو اچھی بھلی نیک اور شریف لڑکی بھی برے اور غلط راستے پر چل نکلے شکر کریں کہ آپ کی کوئی بیٹی نہیں ہے ورنہ آپ کی تربیت اور اعمال آپ کے لئے عبرت پچھتاوے اور افسوس کا باعث بنا دیتی کیا ملا ہے آپ کو مجھ سے یہ ناروا سلوک کر کے بتائیے کیا کمایا ہے آج تک آپ نے؟“

”بکو اس بند کرو۔“ صائمہ بیگم نے غصے میں آ کر اس کے رخسار پر تھپڑ جڑ دیا۔

”صائمہ۔“ حمید فاروقی ابھی ابھی گھر آئے تھے ان کی اس حرکت پر غصے سے گاڑی سے

اترتے ہی چلائے لمحے بھر کو تو صائمہ شپٹا گئیں اجالا حیرت اور صدمے سے گنگ کھڑی تھی اس پر اس کی سگی ماں نے کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا تھا اور آج صائمہ بیگم کا ہاتھ اس پر اٹھ گیا تھا۔

”تم نے اجالا پر ہاتھ کیوں اٹھایا ہے بولو؟ حمید فاروقی صائمہ بیگم کے سر پر کھڑے غصے سے انہیں گھورتے ہوئے وضاحت طلب کر رہے تھے۔“

”یہ عارف کو درغلز ہی تھی۔“ صائمہ بیگم نے دھڑلے سے جھوٹ بولا۔

”شٹ اپ تمہارا بھانجا آسمان سے اتر کر آیا ہے جو اجالا اسے ورغلانے کی میں نے کہا تھا تاکہ میری بیٹی پر آئندہ کوئی الزام مت لگانا۔“ حمید فاروقی غصے سے گرجے۔

”چھوڑیں پاپا ان کی تو عادت ہے آپ غصہ مت کریں۔“ اجالا نے خود کو نارمل کرتے ہوئے کہا۔

”تم میرا سکون برباد کر کے باپ کی ہمدردیاں حاصل کر کے خوش ہوتی ہو میرے گھر میں آ کر مجھے ہی آنکھیں دکھاتی ہو۔“ صائمہ بیگم غصے سے بولیں۔

”میں عارف سے پوچھتا ہوں ابھی دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔“

”انکل خالہ جان غلط بیانی سے کام لے رہی ہیں۔“ حمید فاروقی نے اندر آ کر عارف سے پوچھا تو اس نے سچ سچ ساری بات بتادی۔

”سن لیا تم نے اب کیا الزام دھرو گی میری بیٹی پر اسے تم نے خاندان بھر میں بدنام کر دیا ہے یہ معصوم اور با کردار با حیا لڑکی تمہاری بدسلوکی کی وجہ سے سب کی نظروں میں مشکوک ہو کے رہ گئی ہے اب بتاؤ صائمہ بیگم کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں میں۔“ حمید فاروقی نے انہیں غصے سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ رونے لگیں اجالا نے گہرا سانس لیوں سے خارج کیا اور کچھ سوچ کر حمید فاروقی سے کہنے لگی۔

”پاپا آپ مجھے ”دویمین ہوٹل“ میں کمرہ دلوا دیں میں اب یہاں نہیں رہوں گی میری وجہ سے آپ اور نوید ولید بھی پریشان ہوں گے بس آپ کہیں اور میرا بندوبست کر دیں صائمہ آنٹی اگر میرے وجود سے نالاں ہیں بے سکون اور بے چین ہیں تو مجھے ان کی بے سکونی اور بے چینی کو ختم کرنے کے لئے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔“

”نہیں اجالا بیٹی یہ تمہارے پاپا کا گھر ہے تمہارا گھر ہے تم کہیں نہیں جاؤ گی اگر جائے گی تو

یہ عورت اس گھر سے جائے گی۔“

”نہیں پایا مجھے آپ کی رسوائی اور جگ ہنسائی نہیں چاہیے پلیز آپ کو میری قسم مجھے کہیں بھیج دیں ہوٹل میں میرا داخلہ کرا دیں۔“ وہ ان کا بازو تھام کر بولی۔

”اجالا بیٹا لوگ تو تب بھی مجھ پر ہنسیں گے کہ میں باپ ہو کر اپنی بیٹی کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکا نہیں بیٹا تم کہیں نہیں جاؤں گی تم یہیں رہو گی۔“

”پاپا لوگ صائمہ آنٹی کے مزاج سے واقف ہیں اس لئے میرا ہوٹل جانا ان کے لئے اچھے کا باعث نہیں ہوگا مگر آپ کا صائمہ آنٹی سے جھگڑایا علیحدگی سب کو بولنے کے مواقع فراہم کرے گی اور پاپا نوید اور ولید کا کیا تصور ہے وہ کیوں اس جھگڑے سے اپنی ماں کے خود ساختہ عناد اور خار سے متاثر ہوں؟“ اجالا نے سنجیدگی سے کہا۔

”بیٹا! تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن.....“

”پلیز پاپا اب کوئی لیکن اگر مگر نہیں چلے گی آپ مجھے یہاں سے کہیں اور بھیج دیں آپ کو میری قسم۔“ وہ ان کی بات کاٹ کر نرمی سے بولی۔

”اپنی قسم دے کر تم نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔“

”سوچنے پر نہیں پاپا عمل کرنے پر مجھے کہاں جانا ہے یہ آپ طے کر لیں میں اپنا سامان پیک کر لیتی ہوں۔“ اجالا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے بیٹا یہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں ہم باپ بیٹی کے نصیب میں اگر ایک چھت تلے رہنا نہیں لکھا تو کیا کہا جاسکتا ہے۔“ حمید فاروقی نے پر نرم لہجے میں کہا تو اجالا نے دیکھا صائمہ بیگم کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

وہ اس عورت کی سوچ پر تاسف سے مسکرا دی عارف پر آج اجالا کے کردار کی حقیقت بھی کھل گئی تھی اور اپنی خالہ کے اطوار بھی ظاہر ہو گئے تھے اجالا کے لئے اس کے دل میں عزت اور احترام کے جذبات پیدا ہو گئے تھے اور صائمہ بیگم کے لئے یہ عزت و احترام خود بخود ختم ہو گیا تھا۔ پھر حمید فاروقی کسی کو بتائے بغیر ہی اجالا کو اس کے نانا نانی اور ماموں نفیس کے گھر بہاول پور لے گئے۔

”خیر تو ہے یہ زرق برق لباس یہ زیورات کس خوشی میں پھیلا رکھے ہیں؟“ ایس گھر آیا تو انجم آراء کے کمرے میں بہنوں کو شاپنگ کی چیزیں کپڑے زیور بیڈ پر پھیلائے دیکھ کر پوچھا۔

”آپ کی شادی کی خوشی میں۔“ سمیرا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”واٹ میری شادی۔“ ایس کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔

”جی ہاں بھائی جان پتا ہے امی ابو اور اماں جان نے اجالا سے آپ کی شادی طے کر دی ہے کل شام نکاح ہے اور سادگی سے رخصتی بھی۔“ سمیرا نے مزید معلومات فراہم کیں۔

”امی یہ کیا مذاق ہے؟“ ایس نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”یہ مذاق نہیں ہے ہم نے اجالا بیٹی کو اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے تم اسے اپنے ساتھ لا ہو رلے جانا نکاح سادگی سے ہی ہوگا ہماری واپسی پر تمہارا ولیمہ شاندار طریقے سے کریں گے“ انجم آراء نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”مگر مجھے یہ شادی نہیں کرنی اور وہ بھی اس اجالا سے۔“ ایس نے غصے سے جواب دیا۔

”مگر کیوں کیا کمی ہے اجالا میں؟“ انجم آراء نے پوچھا ان تینوں کے چہرے مر جھا گئے تھے ایس کا صاف جواب سن کر۔

”کوئی کمی نہیں ہے اجالا میں تو جس گھر میں وہ بیس اکیس برس گزار کر آئی ہے وہاں بھی تین لڑکے موجود تھے ان میں سے کسی نے کیوں نہیں قبول کر لیا اسے یہ زمانہ بھر کی ٹھکراتی ہوئی خاندان بھر میں بدنام کی ہوئی لڑکی میرے سر ہی کیوں مسلط کی جا رہی ہے؟“ ایس نے سخت اور تلخ لہجے میں پوچھا۔

”ایس بھائی! اجالا ایک معصوم اور پاکیزہ کردار کی لڑکی ہے اس کی تائیوں اور سوتیلی ماں نے اسے بدنام کیا ہے اور اس کے کزنز تو اس کے لئے بھائیوں جیسے ہیں ایک نے شادی کی خواہش ظاہر کی تھی مگر اجالا نے خود یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ انہیں صرف بھائی سمجھتی ہے حمید انکل نے سب کچھ بتایا ہے۔“ سمیرا نے سنجیدگی سے کہا۔

”ایس! ہم تمہاری اکلوتی اور مرحومہ پھپھو کی اکلوتی بیٹی کو گنونا نہیں چاہتے اس خاندان سے اس کا رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں تمہارے ابو کی بھی یہی خواہش ہے اور وہ تو اجالا کے یہاں آنے سے پہلے کئی بار اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے رہے ہیں اب اگر تقدیر ان کی ہم سب کی یہ خواہش

پوری کر رہی ہے تو تم کیوں سنی سنائی باتوں کو ایٹھ بنارہے ہو وہ تمہاری غزالہ پھپھو کی بیٹی ہے کیا وہ بری ہو سکتی ہے اس نے تو اتنے برس اپنے دھیال میں دکھ سہہ الزام اور تہمتیں سبیں باپ سے دور رہی ہم سے جدا رہ کر اس نے اتنے برس کس کرب میں گزارے ہوں گے تم اندازہ لگا سکتے ہو اس کے کرب کا دکھ اور اذیت کا بیٹا حمید بھائی اس کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔“ انجم آراء نے ایسے کو سنجیدہ مگر نرم لہجے میں سمجھایا۔

”تو مجھے کیوں پریشان کرنا چاہتے ہیں؟“

”بھائی جان! اجالا آپ کو بہت خوش رکھے گی۔“ سمیرا نے کہا۔

”میں اس کے بغیر بھی خوش ہی رہ رہا ہوں سسر۔“

”اجالا تو ہمارے حج پہ جانے کا سن کر واپس جا رہی تھی وہ تو اماں جان نے بروقت اس کا اور تمہارا نکاح کر دینے کا خیال ظاہر کر دیا اور اجالا کے رہنے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا ورنہ اجالا کے لئے رشتوں کی کمی نہیں ہے اور ماشا اللہ تم سے زیادہ صاحب حیثیت و ثروت ہے وہ یہ تو اجالا کا بڑا پین ہے کہ اس نے اپنی تائی وغیرہ کو اپنے گھر سے نہیں نکالا حالانکہ ”رشید محل“ کی تنہا مالک ہے وہ۔“ انجم آراء نے سنجیدگی سے کہا۔

”مجھے اس کی دولت سے مرعوب کرنے کی کوشش مت کریں امی مجھے کچھ نہیں چاہیے اس کی دولت اس کو مبارک ہو۔“ ایس نے جھلا کر کہا۔

”بیوقوف میں تمہیں اس کی دولت سے نہیں اس کی سیرت سے مرعوب کرنا چاہ رہی ہوں اور اس کی صورت تو ماشا اللہ چودھویں کا چاند ہے ایسی پیاری لڑکی تو تم چراغ لے کر بھی ڈھونڈ تو نہیں ملے گی بس میں نے کہہ دیا ہے اب کوئی سوال نہ کرو گے تم کل نکاح نامے پر خوشی خوشی دستخط کرو گے اور اجالا کو اپنے ساتھ لاہور لے جاؤ گے اس کی اور تمہاری سیٹ تمہارے ابو نے بک کر ا دی ہے بائے ایئر جاؤ گے تم دونوں اور ہاں اجالا کو خوش رکھنا خبردار اگر اسے اس کے رشتے داروں کی باتوں کے حوالے سے کچھ کہایا ان کی نظر سے دیکھا ہو وہ تمہارے ساتھ رہے گی اس کی سیرت و کردار تم پر خود بخود واضح ہوتی چلی جائے گی۔“ انجم آراء نے ایس کو دیکھتے ہوئے نہایت سنجیدہ اور حاکمانہ لہجے میں کہا۔

”جی بھائی جان! اور پھر آپ ہمیں دعائیں دیں گے ہم نے اتنی خوب صورت سیرت

اور تھلے لڑکی سے آپ کی شادی کرا دی۔“ سمیرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”اور ہم نے آپ کے لئے بھی نئے کپڑے اور جوتے خریدے ہیں اب آپ دولہا بننے کی تیاری کریں۔“ حمیرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”اچھی زبردستی ہے۔“ ایسی نے منہ بسور کر کہا وہ ہنس دیں۔

”اور ہاں بھائی جان آپ اجالا کو منہ دکھائی میں کیا دیں گے۔“ حمیرا نے پوچھا۔
 اپنا یہ منہ دکھا دوں گا ایسی نے اپنی ٹھوڑی پکڑ کر اس انداز سے کہا کہ ان سب کو ہنسی آگئی۔
 اور اگلی شام اجالا اور ایسی کا نکاح کر دیا گیا ایسی خوش تھا یا نہیں مگر جب اس نے دلہن کے روپ میں اجالا کو دیکھا تو پلکیں جھپکن ہی بھول گیا سرمئی عروسی جوڑے پر سلور کلر کا خوبصورت کام کیا گیا تھا دلہن کے لباس کا یہ رنگ بہت مختلف تھا اور اجالا پہ سچ بھی بہت رہا تھا اس کی دودھ اور گلاب کی سی رنگت اس رنگ میں خوب نمایاں ہو رہی تھیں ایسی کو ایسا لگا جیسے سرمئی بادلوں سے چاند نکل آیا ہو وہ سر سے پاؤں تک حسن و دلکشی کا پیکر دکھائی دے رہی تھی چہرے کے دلکش نقوش لبوں و رخسار کے پھول آنکھوں کے کنول ہاتھوں کی موتیا سی شاخیں سڈول بازوؤں پر مہک رہی تھیں سیاہ سلکی بالوں کے بیچ و خم میں الجھتی نگاہ دل کے تار ہلا رہی تھی ایسی نے پہلی بار اتنا مکمل حسن ایک ساتھ یکجا دیکھا تھا۔

”کیوں بھائی ہو گئے نا اجالا کے دیوانے؟“ سمیرا نے ایسی کی نگاہوں کی چوری پکڑتے ہوئے شرارت سے مسکراتے ہوئے سرگوشی کو تو وہ جھینپ سا گیا۔
 ”کوئی نہیں۔“ ایسی نے نگاہ پھیر لی، سمیرا ہنس دی۔

رخصتی کے وقت اجالا کو بے تحاشا رونا آیا وہ سب سے ملی مگر جب حمید فاروقی سے ملی تو روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی حمید فاروقی نے اسے ڈھیروں پیار کیا دعائیں دیں اور پریم آنکھوں سے اسے ایسی کے ساتھ ایئر پورٹ پر الوداع کیا ایسی کو اماں جان انجم آرائیں احمد، سمیرا، حمیرا اور ان کے شوہروں نے اجالا کا خیال رکھنے کی بہت تاکید کی جس سے وہ بری طرح چڑ گیا تھا ایسی نے لاہور میں اپنے دوست شرجیل کو فون کر دیا تھا اور اس کی بیوی تہمینہ ان دونوں کو ایئر پورٹ پر رسیو کرنے کے لئے موجود تھی انہوں نے دونوں کو بکے اور شادی کے گفٹ پیش کیے ایسی کے گھر اپنی گاڑی میں ہی ان دونوں کو لائے۔

”جلدی کا کام سنا تھا کہ شیطان کا ہوتا ہے مگر بھابھی کو دیکھ کر لگتا ہے کہ تو نے تو پرستان کا پھول اپنے دامن میں سجالیا ہے۔“ شرجیل نے ایس سے کہا تو وہ فخر سے مسکرا دیا اور اجالا شرم و حیا سے سر جھکا گئی۔

”ایس بھائی آپ کی تو لائری نکل آئی ہے۔“ تہینہ نے اجالا کی طرف اشارہ کیا تھا۔
 ”یہ لائری نہیں لڑکی ہے میرے تو وہم و گمان میں نہیں تھا کہ میری شادی اس طرح اچانک ہوگی۔“ ایس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”اللہ کا شکر ادا کریں ایس بھائی آپ کو تو بیٹھے بٹھائے اتنی حسین بیوی مل گئی ہے اجالا بھابھی کا خیال رکھیے گا۔“ تہینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی بہتر گھر سے لے کر اس گھر تک ہر کوئی مجھے اجالا کا خیال رکھنے کا کہہ رہا ہے کسی نے اجالا سے یہ نہیں کہا کہ ایس کا خیال رکھنا۔“ ایس نے مسکرا کر کہا تو اجالا شرمائی۔

”ایس بھائی بیوی تو کسی کے کہے بنا ہی اپنے شوہر کا خیال رکھتی ہے یہ تو شوہر ہی لا پرواہ اور غیر ذمے دار ہوتے ہیں اسی لئے انہیں بار بار احساس دلانا پڑتا ہے۔“ تہینہ نے مسکراتے ہوئے کیا تو شرجیل فوراً بولا۔

”یہ تم نے ان ڈائریکٹ مجھ پر حملہ کیا ہے نیگم۔“

”ہر اس شوہر پر جسے بیوی کا احساس ہے نہ خیال۔“ تہینہ نے ہنس کر کہا۔

”خیال سے یاد آیا ہمیں بھابھی کا خیال کرنا چاہیے یہ دہن بنی بیٹھی بیٹھی تھک گئی ہوں گی ہم اب چلتے ہیں ان دونوں کو بھی آپس میں تبادلہ خیال کرنے کا موقع ملنا چاہیے نا۔“ شرجیل نے کھڑے ہو کر کہا۔

”ہاں اوکے بھابھی بھائی ہم چلتے ہیں کچن میں ہاٹ پاٹ میں بریانی، چکن تورمہ اور تنوری روٹیاں رکھی ہیں آپ دونوں کھانا کھا لیجئے گا انشا اللہ کل ملاقات ہوگی۔“ تہینہ بھی کھڑی ہو گئیں اور ان دونوں کو مخاطب کر کے کہا۔

”بہت بہت شکریہ بھابھی اور یار شرجیل تمہارا بھی شکریہ۔“

ایس نے ان دونوں کا شکریہ ادا کیا اور انہیں رخصت کر کے گیٹ اور دروازہ لاک کر کے اندر بیڈ روم میں آیا تو اجالا کو صوفے پر سر جھکائے بیٹھے دیکھا جانے کیوں وہ اس کی طرف بڑھتے

بڑھتے رک گیا اور اپنے کوٹ میں سے موبائل نکال کر گھرفون کر کے اپنے خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دینے لگا۔

اجالا پریشان سی کن اکھیوں سے اسے دیکھ رہی تھی فون بند کر کے اس نے اپنی ٹائی اور کوٹ اتارا، جوتے اتارے اور وارڈروب میں سے اپنے کپڑے نکال کر واش روم جاتے ہوئے اس کے پاس رک کر بولا۔

”رات صوفے پر بیٹھے بیٹھے گزارو گی کیا؟“

”جی۔“ اجالا نے پلکیں اٹھا کر دیکھا تو ایسیس کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

”رات بہت ہو گئی ہے۔ چینیج کرو اور سو جاؤ اور ہاں بھوک ہو تو کھانا کچن میں موجود ہے کھا لینا۔“ وہ نظریں چرا کر کہتا ہوا واش روم میں گھس گیا اجالا نے واش روم کے بند دروازے کو دیکھا اور دکھ سے سوچا۔

”تو کیا خوشی کا ہر دروازہ مجھ پر بند ہے کیا یہ رشتہ بھی مجھے وہ مان وہ خوشی وہ پیار اعتبار اور احساس نہیں دے سکے گا جو اس کا تقاضا ہے اور جس کے لئے میں آج تک ترقی رہی ہوں کیا ایسیس مجھ سے شادی کر کے ناخوش ہیں؟“

”میں کیوں بار بار امید کے چراغ روشن کر لیتی ہوں اگر میرے نصیب میں محبت اور مسرت نہیں لکھی تو رونے یا کڑھنے سے کیا حاصل؟ رونے سے خوشی تو میسر نہیں آ سکتی مجھے تسلیم کر لینا چاہیے کہ میرے نصیب میں ان رشتوں کا پیار اعتبار اور خوشی نہیں لکھی اور جس چیز پر اختیار رہی ہو اس کے لئے بے قرار ہونے سے کیا فائدہ۔“ ”اجالا حمید“ ”اجالا ایسیس“ بن کر بھی اپنی تقدیر نہیں بدل سکتی اتنا تو کر سکتی ہے نا کہ اب وہ روئے نہیں ہاں اب میں نہیں روؤں گی بہت رو چکی ہوں اب تک اب نہیں رونا مجھے بس خاموشی سے اپنا کام کرنا ہے اپنا فرض نبھانا ہے۔ اجالا نے دل میں عہد کیا اور ایسیس کے واش روم سے نہا کر آنے سے پہلے اپنے زیور اتار کر رکھ دیئے اپنے سوٹ کیس میں سے سادہ کاٹن کا پرل کلر کا سوٹ نکالا اور دوسرے کمرے میں جا کر چینیج کر کے آگئی وہ بالوں میں کنگھی کر رہی تھی جب ایسیس واش روم سے نہا کر نکلا اسے عام سے لباس میں دیکھ کر اسے قدرے حیرت ہوئی وہ دیکھ رہا تھا وہ سادگی میں بھی بلا کی حسین لگ رہی تھی اس کی نگاہ اس کی جانب مائل تھی مگر دل و دماغ خود پر اچانک مسلط کی جانے والی اس ذمے داری کو قبول کرنے سے

انکاری تھے۔ سو وہ سر جھٹک کر اس کے احساس سے جان چھڑاتا کچن میں چلا گیا اجالا اپنے ساتھ اپنا وہی سامان لائی تھی جو وہ پاپا کے گھر سے لے کر نکلی تھی ایس کے گھر والوں کی طرف سے ایک سوٹ کیس اس کے ساتھ کر دیا گیا تھا جس میں اجالا کے لئے چند ملبوسات زیورات میک اپ کٹ اور دوسری چھوٹی موٹی چیزیں تھیں جلدی میں یہی انتظام ہو سکا تھا آنجم آرا اور اماں جان نے ایس کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ اجالا کولاہور سے ڈھیر ساری شاپنگ کرائے اس کے لئے کپڑے جوتے ضرور خریدے اس کے لئے اسے علیحدہ سے نفیس احمد نے پچاس ہزار روپے کیش بھی دیئے تھے اجالا نے ایس کی طرف سے بری کے نام پر ملنے والے سوٹ کیس کو کھولا ہی نہیں ایس کے رویے نے اسے خود بھی ریزرور ہنہ پر مجبور کر دیا تھا۔ ایس کھانا کھا کر کمرے میں آیا تو اسے اپنے بیڈ پر سوتے پایا۔

”لو اب یہ محترمہ میرے بیڈروم اور بیڈ پر قابض رہیں گی۔“ ایس بڑبڑایا۔

”ایس احمد، اجالا اب تمہاری بیوی ہے اور اسے اس ناطے سے تمہارے بیڈروم میں ہی ہونا اور سونا چاہیے۔“ اس کے دماغ نے اسے سمجھایا۔

”اچھی زبردستی ہے۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا لائیٹ آف کر کے خود بھی بیڈ کے کنارے پر لیٹ گیا مگر اپنے برابر میں موجود نازک کوئل وجود کی خوشبو نے دیر تک اسے سونے نہیں دیا۔



اجالا صبح سویرے ہی اٹھ گئی تھی نماز ادا کر کے کچھ دیر اپنی کتابیں نکال کر سیٹ کرنے میں لگائی پھر کچن میں چلی آئی اسے زوروں کی بھوک لگ رہی تھی ہاٹ میں موجود لوازمات گرم کیے اور اپنی بھوک مٹا کر برتن دھو کر رکھ دیئے، پھر وہ گھر کا معائنہ کرنے لگی اس گھر میں تین بیڈرومز دو لانچ ہاتھرومز تھے۔ لاؤنج کچن ڈرائنگ روم کے علاوہ باہر برآمدہ تھا۔ سائیڈ پر گیٹ کے عین سامنے پورچ تھا اور گیٹ کے بائیں جانب برآمدے اور صحن نما روش کے آگے چھوٹا سا ہرا بھرا پھولوں سے سجلاں تھا اجالا کو گھر پسند آیا تھا مگر گھر والے کا رویہ اسے ہرگز پسند نہیں آیا تھا بھلا کوئی اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ ایسا غیروں جیسا سلوک کرتا ہے وہ اس احساس ناقدری کو ذہن سے جھٹکتی ہوئی اندر آ گئی۔ ایس جاگ گیا تھا اور اسے کمرے میں ناپا کر کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ سارے کمروں کچن میں دیکھنے کے بعد باہر جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ وہ اندر آ گئی۔

”کہاں تھیں تم؟“ ایسی نے قدرے تند لہجے میں پوچھا تو وہ سہم سی گئی۔

”میں..... یا ہر لان میں تھی۔“

”گھر سے باہر اکیلی مت نکل جانا راستہ بھول گئیں تو میرے لئے مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔“

ایسی نے سکون کا سانس لے کر کہا۔

”جی بہتر آپ ناشتے میں کیا لیں گے؟“

”کیوں؟“ ایسی نے حیرانگی سے اس ایک رات کی دلہن کو دیکھا۔

”آپ فریش ہو جائیں میں ناشتہ بنا دیتی ہوں۔“

”میں خود پیتا لوں گا ناشتہ تمہیں یہ زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”یہ زحمت تو اب مجھے ہی کرنی ہے ہمیشہ آپ بتا دیں میں بنا دوں گی۔“ اجالا نے مسکراتے

ہوئے نرم لہجے میں کہا تو چند لمحوں کے بعد وہ اسے بغور دیکھتا رہا پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا۔

”ٹھیک ہے پھر آ ملیٹ کے ساتھ پراٹھا بنا دو اور چائے بھی ساتھ ہو لیکن عمدہ نسل کی ہو۔“

”اوکے میں بتاتی ہوں آپ منہ ہاتھ دھولیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی اور کچن کی طرف

بڑھ گئی ایسی تو چائے کے ساتھ سلاؤس اور بوائے اٹھ کر ناشتہ کرنے کا عادی ہو چکا تھا اجالا کو

کام میں مصروف کرنے کے لئے جان بوجھ کر آ ملیٹ اور پراٹھے کی فرمائش کی تھی۔

”پتا تو اب لگے گا محترمہ کو جب آٹا بھی خود گوندھنا پڑے گا بلکہ پہلے تو ڈھونڈنا پڑے گا کہ

رکھا کہاں ہے بڑی آئیں ناشتہ بنانے والی ہونہ۔“ ایسی مسکراتے ہوئے دل میں ہنستا ہوا واش

روم میں چلا گیا۔

اجالا کو آٹا ڈھونڈنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی فوراً اس نے آٹا گوندھا اور آ ملیٹ بنانے

کے بعد دو پراٹھے بنائے ایسی کچن میں داخل ہوا تو وہ ٹرے میں ناشتہ سجائے اس کے سامنے

کھڑی تھی۔

”آپ ناشتہ کر لیں اتنی دیر میں چائے بھی تیار ہو جائے گی۔“ اجالا نے ٹرے اسے دیتے

ہوئے کہا تو وہ اپنی سوچ پر شرمندہ سا ہو کر ٹرے لے کر لاؤنج میں آ گیا آ ملیٹ اور پراٹھا مزیدار

تھا ایسی کو حیرت ہو رہی تھی کہ ”رشید محل“ میں ملازموں کی موجودگی میں اس نے یہ کام کیسے کرنا

سیکھ لیا، اس کے ناشتہ ختم کرنے سے پہلے اجالا چائے کا بڑا سا لگ بھی اس کے پاس میز پر رکھ گئی

اس کی کلائی میں کھٹکتی چوڑیوں کی صدا اور ہاتھوں سے اٹھتی خوشبوئے حنا ایسیں کو دیر تک محسوس ہوتی رہی شرجیل اور تہینہ کا فون آیا تھا انہوں نے ان دونوں کو رات کے کھانے پر اپنے گھر مدعو کیا تھا ایسیں کا بہترین دوست تھا شرجیل لہذا اسے اس کی دعوت قبول کرتے ہی بنی۔

”رات کو شرجیل کی طرف ڈنر پر جانا ہے تیار ہو جانا۔“ ایسیں نے فون سننے کے بعد اجالا سے کہا تو اس نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شرجیل اور تہینہ کے گھر ڈنر پر جا کر اجالا کو احساس ہوا کہ ایسیں صرف اس سے نالاں ہے وہ ناخوش ہے اس سے شادی کر کے کیونکہ وہ شرجیل اور تہینہ بھابھی کے ساتھ بہت بے تکلفی سے ہنس بول رہا تھا اور وہ اسے دیکھے جا رہی تھی ایسیں خوب تو تھا تقریباً پانچ فٹ نواچ قد تھا اس کا مضبوط جسم کا مالک تھا وہ چہرے کے نقوش ایسے دلنشین تھے کہ دیکھنے والے ایک بار پلٹ کر ضرور دیکھتے تھے، اس پر اس کا دل آویز مسکراہٹ، گندی رنگت میں اس کا حسن اور بھی دلکش دکھائی دیتا تھا بالوں کا خوبصورت استاکل مضبوط ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر بچھا گہری صاف شفاف لکیروں کا جال بازوؤں پر چمکتا، ہلکا سنہری رواں اسے مردانہ وجاہت کا سبمل ظاہر کر رہا تھا۔ اجالا کا دل یکا یک انوکھے راگ الاپنے لگا یہ خیال کہ یہ خوبصورت شخص اس کا شریک زندگی ہے سن کر آپ ہی آپ سرور بخشنے لگا شرجیل اور تہینہ کے گھر سے واپسی پر ایسیں نے چپ کی بکل ماری تو اجالا بھی خاموشی سے چہنچ کر کے نماز عشاء کی ادائیگی کے بعد سونے کے لئے لیٹ گئی۔

اتوار کی چھٹی تھی اور اس دن ایسیں نے گھر کی صفائی ستھرائی اور دوسرے کام کرنے کے لئے دو میاں بیوی کو اتوار کے اتوار کام پر آنے کے لئے رکھا ہوا تھا ان کے آنے پر اس نے اجالا سے ان کا تعارف کر دیا تھا انہوں نے ایسیں کو شادی کی مبارکباد دی، زبیدہ اور اسلم اپنا کام ختم کر کے چلے گئے، ایسیں تیار ہو کر باہر گھومنے نکل گیا اور اجالا گھر میں اکیلی رہ گئی، اسی دوران حمید فاروقی کا فون آن گیا اور انہیں سب اچھا ہے کہہ کر مطمئن کرتی رہی ایسیں واپس آیا تو کچن کے سامان سے لدا ہوا تھا چکن، پھل، سبزیاں اور کچھ بیکری کا سامان بھی تھا، ڈبل روٹی، جیم، مکھن، انڈے، جوس وغیرہ وہ ہفتے بھر کی خریداری اتوار کے دن ہی کرتا تھا زبیدہ اور اسلم کھانا پکا کر فریزر میں رکھ جاتے تھے آج زبیدہ اور اسلم کو اس نے خود ہی صفائی ستھرائی کرا کے کپڑے دھلوا کے واپس بھیج دیا تھا وہ فریج میں ڈبل روٹی، مکھن اور جوس رکھ کر مڑا تو اجالا گوشت اور سبزی سنبھالنے کے لئے چلی آئی۔

”رہنے دو میں کر لوں گا ویسے بھی دو دن کی دلہن سے کام کروا کر میں نے اپنی شامت کو آواز نہیں دینی ویسے بھی مجھے یہ سب کام کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔“ اسیس نے اس کے ہاتھ سے گوشت کا شاپر لیتے ہوئے کہا۔

”اکیلے رہنے کا یہی تو فائدہ ہے انسان وہ کام بھی کرنا سیکھ جاتا ہے جو اس کے کرنے کے نہیں ہوتے۔“ اجالا نے مسکرا کر کہا۔

”چکن تو رومہ فریج میں رکھا ہے آج کا کام تو چل جائے گا کل جو تمہارا دل چاہے زبیدہ سے کہہ کر پکوا لینا وہ کل صرف کھانے پکانے آئے گی۔“

”آپ اسے منع کر دیں یہ کام میرے کرنے کا ہے میں کر لوں گی۔“

”میں تمہاری وجہ سے اپنی روٹین خراب نہیں کرنا چاہتا بہر حال تمہارا جو دل چاہے کرو سوائے مجھے ڈسٹرب کرنے کے۔“ وہ بے عروقی سے بولا تو اجالا نے دکھ سے اسے دیکھا اور کچن سے باہر نکل آئی۔

رات کو اسیس ٹی وی لاؤنج میں بیٹھائی وی دیکھ رہا تھا اور اجالا تنگ آ کر اپنی کورس کی کتاب لے کر بیڈروم میں آ گئی تھی ساڑھے دس بجے اسیس بیڈروم آیا تو وہ بہت انہماک سے اپنی پڑھائی کر رہی تھی۔

”آج سونا نہیں ہے کیا؟“ اسیس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی تو مجھے پڑھنا ہے۔“ اجالا نے چونک کر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

”لیکن مجھے نیند آ رہی ہے۔“ وہ بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے بولا۔

”تو آپ سو جائیں۔“

”میں روشنی میں سونے کا عادی نہیں ہوں۔“ اس نے کچھ جتایا تھا اسے۔

”نو پراٹلم میں لایٹ آف کر دیتی ہوں آپ سو جائیں میں لاؤنج میں بیٹھ کر پڑھ لوں گی“

اجالا نے مسکراتے ہوئے کہا اور صوفے سے اٹھ کر لایٹ آف کر کے کتاب ہاتھ میں لئے لاؤنج میں آ گئی۔

”اسیس آپ کو روشنی یعنی اجالا نہیں چاہیے اندھیرا چاہیے آپ کو نیند کو آ رہی ہے اور لگتا ہے جیسے نصیب میرے سو رہے ہیں پتا نہیں میری قسمت کب جاگے گی؟“ اجالا نے دل میں اسے

مخاطب کر کے کہا اور بہت دیر بعد وہ خود کو پڑھنے کے لئے ذہنی طور پر آمادہ کر سکی اور جب پڑھتے پڑھتے تھک گئی تو وہیں صوفے پر سو گئی۔

ایس نے آفس جانا تھا اس لئے الارم لگا کر سویا تھا آنکھ کھلی تو اسے خالی بیڈ دیکھ کر اجالا کا خیال آیا پہلے وہ بستر سے نکل کر کمرے سے باہر آیا اور لاؤنچ میں صوفے پر اسے سوتے دیکھ کر کچھ شرمندہ سا ہوا پھر فوراً ہی سر جھٹک دیا اور واپس پلٹ گیا تھوڑی دیر میں اجالا بھی جاگ گئی تھی۔

اجالا نے ناشتہ تیار کر دیا تھا ایس نے خاموشی سے ناشتہ کیا اور آفس جانے کے لئے تیار ہونے چلا گیا، ڈیرینگ ٹیبل پر اجالا کی چوڑیاں گھڑی جیولری پرفیوم اور باڈی اسپرے کے علاوہ لپ اسٹک وغیرہ بھی رکھی تھیں ایس کو اس کی پیمپوں کے درمیان سے اپنی چیزیں ڈھونڈتے ہوئے الجھن ہو رہی تھی بے دھیانی میں ہی اس نے اپنے پرفیوم کی بجائے اجالا کا ”بلو لیڈی“ اٹھا کر اسپرے کر لیا خوشبو نے اسے احساس دلایا کہ وہ غلطی سے اس کا پرفیوم استعمال کر چکا ہے۔

”کیا مصیبت ہے اچھی بھلی زندگی میں بھونچال آ گیا ہے یہاں وہاں جگہ جگہ محترمہ کی چیزیں بکھری پڑی ہیں۔“ ایس نے جھلا کر خود کلامی کی پھر تیز آواز میں اجالا کو پکارا۔

”اجالا.....اجالا۔“

”جی۔“ وہ اس کے یوں چلانے پہ گھبرا کر دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی۔

”یہ چیزیں تم کہیں اور نہیں رکھ سکتیں۔“ ایس نے ڈیرینگ ٹیبل پر رکھی اس کی چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اس نے اسی سے پوچھا۔

”کہاں رکھوں؟“

”اس گھر میں اور بھی کمرے ہیں اور ڈیرینگ ٹیبل وہاں بھی موجود ہے۔“

”اوہ، ٹھیک ہے میں اپنی چیزیں آپ کے کمرے سے اٹھا لوں گی واپسی پر یہ آپ کو یہاں نظر نہیں آئیں گی“ اجالا نے اپنے دکھ کے احساس توہین کو برداشت کرتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی کی چابی اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا اجالا نے بے اختیار اس کے پیچھے آتے ہوئے پوچھا۔

”سینے آپ واپس کب تک آئیں گے؟“

”میں آفس جا رہا ہوں پکنک اسپاٹ پر نہیں جا رہا کہ۔“ وہ غصے سے بولا اور جملہ ادھوا تھا

چھوڑ کر اس کے افسردہ چہرے کو دیکھتے ہوئے باہر نکل گیا اجالا اپنی اس ناقدری پر تڑپ کر رہ گئی کوئی بھی تو ایسا نہیں تھا جو اسے اپنے رشتے کے حوالے سے اہمیت دیتا ہو یا اس کی پروا کرتا ہو وہ سب کے لئے ان چاہی ناپسندیدہ اور زبردستی مسلط کی گئی فرد بن گئی تھی اس احساس نے اجالا کی پلکیں نم کر دیں اجالا نے خود کو سنبھالا گھر کی ڈسٹنگ وغیرہ کرنے کے بعد اپنی تمام چیزیں ایسیں کے کمرے سے اٹھا کر دوسرے بیڈروم میں سیٹ کر لیں۔

”میری چیزیں جس شخص کو اپنی جگہ پر قبول نہیں ہیں بھلا اسے میں کیسے قبول ہو سکتی ہوں کتنے طریقے سے ایسیں نے مجھ سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا کتنی آسانی سے مجھے سمجھا دیا ہے کہ میری ان کی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ہے اور وہ مجھے اپنے کمرے میں نہیں دیکھنا چاہتے مجھ سے کچھ بھی شیئر نہیں کرنا چاہتے خیر ان کی مرضی مجھے تو اپنا فرض ادا کرنا ہے آگے جو مقدر جو نصیب۔“ اس نے آزدگی سے کہا اور کھانا پکانے کے بعد نہا کر تیار ہوئی اور پڑھنے بیٹھ گئی ایسیں شام کو ساڑھے چار بجے گھر آیا تو اپنے کمرے کو اس کی چیزوں سے خالی پا کر مطمئن ہو گیا اور چیخ کر کے لاؤنج میں آ گیا اجالا نے چائے اور چکن سینڈوچز بنائے تھے اس کے لئے جوڑے میں سجا کر اس کے سامنے سیٹر ٹیبل پر پڑے رکھ دی اور خود اپنے کمرے میں چلی گئی کہ ایسیں کے پاس تو اسے دیکھنے اور بات کرنے تک کی گنجائش نہیں تھی رات کا کھانا کھاتے ہوئے ایسیں نے اس کو دیکھا اور کہنے لگا۔

”حیرت ہے محل میں رہنے والی لڑکی کروڑوں کی مالک امیر زادی کو کنگ بھی کر لیتی ہے۔“
 ”مجھے بی جان نے سب کام سکھائے تھے۔“ اجالا نے اس کے طنز کو خوشدلی سے سہتے ہوئے مسکرا کر نرمی سے جواب دیا۔

”بیوقوف بنانا بھی سکھایا تھا۔“

”آپ میری مرحومہ بی جان کی تو ہین مت کریں اور ویسے بھی بنے ہوؤں کو بنانے سے کیا حاصل؟“ اجالا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”ارے بھی تم تو برا منا گئیں میں نے یونہی ایک بات کہہ دی تھی۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”کوئی بات یونہی نہیں کہی جاتی ایسیں صاحب۔“ یہ کہہ کر اس نے برتن سمیٹے اور اٹھ کر کچن میں چلی گئی ایسیں بھی کچھ دیر بیٹھی رہی وہی سے جی بھلانے کے بعد اپنے کمرے میں آ گیا اور اجالا اپنے

کمرے میں جا کر سو گئی ایسی کو اس کے کمرے میں نہ آنے پر بے چینی ہونے لگی تو اٹھ کر باہر آیا لاؤنج کی لائیٹ آف تھی۔ پھر برابر والے کمرے میں جھانکا تو اجالا کو کتاب سینے پر رکھے سوتے پایا کچھ دیروہ وہیں کھڑا اس کے چہرے کو دیکھتا رہا جس پر معصومیت افسردگی اور اداسی رقم تھی پھر وہ لائیٹ آف کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

”مجھے کپڑے پر لیس کرنے ہیں استری چاہیے۔“ صبح اس نے ایسی سے کہا تو وہ اپنے کمرے میں گیا اور استری لا کر اسے دے دی۔

”ذرا دھیان سے لگانا یہ استری کرنٹ مارتی ہے بٹن آن کرنے کے بعد تار کو مت چھونا۔“ وہ استری لے کر جانے لگی تو ایسی نے ہدایت نامہ جاری کیا۔

”جی اچھا۔“ وہ آہستہ سے کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور ایسی ناشتے کی ٹیبل پر آ گیا ابھی اس نے ناشتہ شروع ہی کیا تھا کہ اجالا کی چیخ نے اسے شٹا دیا وہ سلاؤس پلیٹ میں چھوڑ کر تیزی سے اس کے کمرے میں بھاگا وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھے خوفزدہ سی کھڑی تھی۔

”کیا ہوا کہاں لگا ہے کرنٹ؟“ ایسی نے اس کے قریب آ کر فکر مندی سے پوچھا۔
”کہیں نہیں۔“

”تو تم چیخیں کیوں.....؟“

”وہ وہاں اتنی موٹی کالی چھپکلی اچانک نکل آئی تھی۔“ اس نے سوئچ بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا تو ایسی نے طویل سانس لیوں سے خارج کیا۔

”جھینکس گاڈ! تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا لاؤ استری مجھے میں جانتے ہوئے مرمت کے لئے دیتا جاؤں گا اگر تمہیں اس سے کرنٹ لگ کر کچھ ہو جاتا تو سب نے مجھے ہی الزام دینا تھا کہ زبردستی شادی کرائی تھی لڑکے کی جیسی اس نے اپنی بیوی کو کرنٹ لگا کر مار دیا۔“ ایسی نے اس سے استری لیتے ہوئے کہا اور کمرے سے چلا گیا وہ وہیں اس کے لفظوں پر غور کرتی رہ گئی۔

”زبردستی تو میرا اندازہ درست نکلا ایسی کو مجھ سے شادی کے لئے ماموں ممانی اور اماں جان نے زبردستی تیار کیا تھا وہ میرے خدایا میری اتنی ذلت کیوں آخر میں نے کون سا گناہ کیا ہے اللہ تعالیٰ کہ میرا شوہر بھی میرے ساتھ کو بخوشی قبول کرنے کو تیار نہیں ہے آخر میرے ساتھ

ہی یہ سب کیوں ہو رہا ہے کیا میں ساری زندگی اپنے شوہر کی بے اعتنائی اور بے رخی کا زخم سہتی رہوں گی کیا مجھے کوئی سکھ نہیں ملے گا شوہر کی محبت اور توجہ نہیں ملے گی مجھے؟“ وہ دل میں اپنے رب سے سوال کر رہی تھی آنسوؤں سے اختیار چھن گیا تھا اور ٹپ ٹپ برکھا رہنے لگی تھی۔

پھر کئی دن یونہی گزر گئے اجالا نے ایس کے سارے کام خود سنبھال لئے تھے اس کے کپڑے جوتے اسے ہر صبح تیار ملتے ناشتہ کھانا وقت پر ملتا وہ اس سے ضرورتاً ہی کوئی بات کرتا تھا تو وہ جواب دے دیتی تھی نفیس احمد، انجم آراء اور اماں جان جج پر جا چکے تھے، حمیرا، سمیرا اور حمید فاروقی کے ٹیلی فون آتے رہتے تھے اجالا اور ایس ایک دوسرے سے ہنوز اجنبی بنے زندگی گزار رہے تھے اسی دوران بقرعید آگئی۔

”گوشت سنبھالنا اور پکانا نہیں ہے کیا جو تم نے اتنا بھاری بھر کم جوڑا پہن رکھا ہے۔“

”جب گوشت آئے گا میں چھینچ کر لوں گی بی جان کہتی تھیں کہ عید اللہ کا انعام ہے تحفہ ہے ہم مسلمانوں کے لیے اس کی ناقدری اور ناشکری نہیں کرنی چاہیے اور پورے اہتمام اور دل کے ساتھ اسے منانا چاہیے۔“ اجالا کو اس کی بات سے تکلیف تو پہنچی تھی مگر سہہ گئی اور مسکراتے ہوئے بولی تو ایس سے کوئی جواب نہ بن پڑا اس کے بچے سنوڑے روپ کو دیکھے گیا اسی وقت ڈور بیل بج گئی تو وہ فوراً باہر چلا گیا اجالا کی آنکھیں آپ ہی آپ بھینگے لگیں قصائی آ گیا تھا اور ایس نے قربانی کے لیے جو بکرا خریدا تھا اس کی قربانی کی تیاری ہو رہی تھی اجالا نے چھینچ کر لیا اور سادہ کائٹ کا گلابی سوٹ پہن لیا حمید فاروقی کا فون آیا تو اس کی افسردگی پھر کم ہو گئی ولید اور نوید سے بھی اس نے بات کی قربانی کا گوشت فریزر میں رکھنے اور پکانے میں اس کا سارا دن نکل گیا ایس اپنے دوستوں کے گھر گوشت تقسیم کرنے کے بعد دوستوں میں ہی اپنی عید گزار کر گھر لوٹا تو رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

اجالا ٹی وی پر عید کی خصوصی نشریات دیکھ کر دل بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایس کے آنے پر ٹی وی آف کیا اور لاک وغیرہ لگا کر اپنے کمرے میں جا کر سو گئی دوسرے دن شرجیل اور تہمینہ ان کے گھر آئے اور تیسرے دن ان دونوں کو ان کے گھر دعوت پر جانا پڑا یوں عید کے تین دن گزر گئے۔

ایس کو ہلکا سا فلو اور بخار ہو گیا تھا صبح آفس جا رہا تھا تو اجالا کو اس کے بار بار چپکنیں مارنے سے اندازہ ہو گیا تھا جیسی اس نے اس کے لئے یخنی اور سوپ بنا کر رکھا تھا آفس سے وہ رات آٹھ بجے لوٹا تھا اور اس کا چہرہ اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں آواز بھی بھاری ہو گئی تھی۔

”سنو میں کھانا نہیں کھاؤں گا مجھے صرف ایک کپ چائے دے دینا۔“ ایس نے اسے کچن کی طرف جاتے دیکھ کر کہا وہ سر ہلا کر کچن میں چلی آئی اور اس کے لئے بنایا ہوا سوپ گرم کر کے اس کے کمرے میں لے آئی۔

”یہ سوپ پی لیں بخار بھی نہیں ہوگا اور طبیعت بھی سنبھل جائے گی۔“

”میں نے کھانا کھانے سے منع کیا تھا۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

”یہ کھانا نہیں پینا ہے سوپ پی لیں فلو کو افاقہ ہوگا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”میں نے تم سے چائے کا کہا تھا سوپ کا نہیں جو کہا جائے وہ کیا کروا کر نہیں کر سکتیں تو صاف جواب دیدو میں خود بنا سکتا ہوں چائے۔“ وہ غصے سے بولا۔

”چائے میں ابھی بنائے دیتی ہوں آپ کی طبیعت کی خرابی دیکھ کر میں نے سوپ بنایا تھا

اور میں بیوی ہوں آپ کی آپ کی صحت کا خیال رکھنا اور یہ سب کرنا میرا فرض ہے۔“ وہ بہت نرمی اور تحمل سے بولی۔

”او آئی سی، تو اس بہانے تم مجھے میرے فرائض یاد دلانے کی کوشش کر رہی ہو ہوں۔“ وہ تلخی

سے مسکراتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا اور اجالا شرمندہ امت اور احساس ذلت سے غصے سے سرخ

ہو گئی اس نے اسے اتنا حقیر جانا تھا اس قدر گرا ہوا سمجھا تھا کہ وہ اس کی نظر التفات کے لئے اس

کے سامنے ہچھی پچھی جائے گی وہ تو اپنی حساس اور رشتوں کا پاس کرنے والی طبیعت اور عادت

کے ہاتھوں یہ سب کرتی رہی تھی اور ذلت بھی اٹھا رہی تھی اس کے ہاتھوں۔

”جی نہیں مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے اور آپ کوئی ننھے بچے نہیں ہیں کہ میں آپ کو آپ

کے فرائض یاد دلاؤں میں آپ کے اس گھر میں آپ کی بیوی کی حیثیت اور رشتے سے آئی ہوں

میں آپ کے ساتھ کورٹ میرج کر کے یا گھر سے بھاگ کر نہیں آئی جو آپ اس طرح سے روز

اول سے میری توہین کرتے چلے آ رہے ہیں، مسٹر ایس احمد، اگر یہ شادی زبردستی کی تھی تو بڑوں

کے سامنے انکار کر کے ڈٹ جاتے انہیں قائل کرتے ان کے احترام میں ان کی نظروں میں اچھا

بننے کے لئے بے دلی سے آپ نے مجھ سے یہ رشتہ جوڑ لیا ان پر تو آپ کا بس نہ چلا اور مجھ پر اپنی ناکامی کا بے بسی کا غصہ نکالنے لگے آپ بڑوں کا احترام کرنا جانتے ہیں تو رشتوں کا احترام کرنا بھی سیکھیے آپ تو اپنے بڑوں کے بنائے گئے۔ اس رشتے کی مسلسل توہین کر رہے ہیں۔ اور میں کوئی لاوارث نہیں ہوں کہ آپ میرے ساتھ جو چاہیں سلوک کرتے رہیں میں صرف رشتے کے احترام میں خاموش ہوں۔ آپ کے بڑوں کو جو مان اور فخر آپ پر ہے اسے برقرار رکھنے کے لئے خاموش ہوں یہ ہمارے اور خاص کر آپ کے بزرگوں اور ماں باپ کا فیصلہ تھا جو مجھے بھی قبول کرنا پڑا اور نہ مجھے زبردستی آپ کی ذات اور زندگی پر مسلط یا حاوی ہونے کا کوئی شوق نہیں تھا آپ اگر میری وجہ سے اتنے ہی بیزار اور عاجز آ چکے ہیں تو مجھے آزاد کر کے اپنی پرانی زندگی میں لوٹ سکتے ہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ مجھے یہ رشتے ناطے کبھی بھی راس نہیں آئے۔ آپ کے والدین واپس آ جائیں تو انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیجئے گا ورنہ یہ کام میں خود انجام دے لوں گی مجھے ساری زندگی ذلیل و خوار ہونا قبول نہیں ہے سمجھے آپ۔“ اجالا نے نہایت تیز، سپاٹ اور سنجیدہ لہجے میں کہا اور سوپ کا پیالہ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر کمرے سے باہر نکل گئی ایسی حیرت زدہ تھا کہ وہ اس کی بے رخی کے باعث کس نہج پر سوچ رہی تھی آج اس کے دل کا سارا غبار نکل گیا تھا وہ یہ سب کہنا نہیں چاہتی تھی لیکن ایسی کے طنزیہ غصیلے اور تلخ جملے نے اسے بے قابو کر دیا تھا اب بے کل ہونے کی باری ایسی کی تھی اجالا نے جو کچھ اس سے کہا تھا وہ اس پر نادم نہیں تھی۔

اگلے دن حمید فاروقی کا فون آ گیا، وہ ان کی آواز سن کر خوش ہو گئی۔

”پاپا کیسے ہیں آپ؟“

”میں ٹھیک ہوں تم کیسی ہو اور ایسی بیٹے کا کیا حال ہے؟“

”ہم بھی ٹھیک ہیں پاپا۔“

”گڈ اجالا بیٹا تمہارے امتحان کی رول نمبر سلپ آ گئی ہے ایک ہفتے بعد تمہارے پیپرز

شروع ہو رہے ہیں میں نے تمہاری کل کی سیٹ بک کروادی ہے ٹکٹ تمہیں آج ہی مل جائے گا تم ایس سے یہاں آنے کی اجازت لے لینا۔“ حمید فاروقی نے سنجیدگی سے کہا۔

”پاپا انہیں بھلا میرے میکے جانے پر کیا اعتراض ہو گا اور پھر میں نے امتحان دینے آنا ہے“

”پھر بھی بیٹا پوچھ لینا اس سے کہیں وہ ناراض ہو جائے۔“

”وہ ناراض نہیں ہوں گے پاپا وہ تو میرے چلے جانے پر خوش ہوں گے۔“ اس نے دل میں کہا اور پھر بولی۔

”ٹھیک ہے پاپا میں پوچھ لوں گی۔“

”اوکے بیٹا ان شاء اللہ کل ملاقات ہوگی اپنا خیال رکھنا اللہ حافظ۔“

”اللہ حافظ۔“ اجالا نے بھی جواباً کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

”آخر ایسا کون سا ہوٹل ہے جہاں عید پر چھٹیاں نہیں ہوتیں اجالا عید پر تو گھر آئی نہیں پھر امتحان دینے کیسے آرہی ہے آپ مجھے بتاتے کیوں نہیں ہیں؟“ حمید فاروقی فون بند کر کے مڑے تو صائمہ بیگم نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

”تاکہ تم اجالا کو اس جگہ سے بھی ذلیل کر کے نکلوانے کے لئے سرگرم ہو جاؤ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ وہ یہاں نہیں ہے اب اس کے نہ ہونے پر بھی تمہیں چین نہیں ہے اور میں باپ ہوں اجالا کا اسے کسی ایسی جگہ ہرگز نہیں چھوڑ سکتا جہاں اس کی جان اور آن کو کوئی خطرہ ہو وہ غیروں میں نہیں ہے اپنے شوہر کے گھر میں ہے۔“ حمید فاروقی نے مہینے بعد آج انہیں یہ بات بتا ہی دی جو صائمہ بیگم کے لیے شدید حیرت کا باعث بنی تھی۔

”کیا شوہر کے گھر اس کی شادی کب کی آپ نے؟“

”جب میں اسے یہاں سے لے گیا تھا تو اس کی شادی کرا کے ہی واپس آیا تھا۔“

”آخر پتہ تو چلے کس سے شادی کی ہے آپ نے اپنی بیٹی کی؟“

”تم سے مطلب تم تو اس کے شوہر اور سسرال والوں کو بھی اس کے خلاف بھڑکانے کا فریضہ انجام دو گی۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لئے بتا دوں کہ اجالا کے سسرال والے تمہاری اور ”رشید محل“ والوں کی ہراس زیادتی سے واقف ہیں جو تم سب نے اجالا کے ساتھ کی ہے اور اب وہ جہاں ہے وہاں سب اس کی قدر بھی کرتے ہیں اور اس سے پیار بھی کرتے ہیں انہوں نے تو اجالا کے بارے میں تم لوگوں کے ظلم و ستم جانتے ہی فوراً اجالا کا رشتہ مانگ لیا تھا۔“ حمید فاروقی نے سنجیدگی سے کہا۔

”اور آپ نے بنا چھان بین کیے فوراً بیٹی کو میاہ دیا۔“

”چھان بین کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں اجنبیت ہو اور ان لوگوں کو میں برسوں لا تعلق رہنے کے باوجود بہت اچھی طرح جانتا ہوں وہ ہی اجالا کے اصل خیر خواہ ہیں اور اجالا ان کا خون ہے غیر نہیں ہے ان کے لئے۔“

”ادب سمجھی اجالا کو اس کی ماں کے میکے والوں نے اپنی بہو بنایا ہے ہے ناں۔“

”ہاں اس کے ماموں کے اکلوتے بیٹے ایس احمد سے اس کا نکاح اور رخصتی کرا کے میں یہاں آیا تھا ایس لاہور میں بہت اچھی جاب کر رہا ہے اجالا وہیں ہے اس کے ساتھ“ حمید فاروقی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”چلیں مبارک ہو بیٹی کے بوجھ سے تو نجات مل گئی آپ کو ویسے جہیز میں کیا کچھ دیا ہے بیٹی کو؟“ صائمہ بیگم خوش تھیں کہ اجالا سے ہمیشہ کے لئے جان چھوٹ گئی شادی کے بعد تو وہ کبھی کبھار ہی میکے آیا کرے گی۔

”کچھ نہیں دیا وہ لوگ لالچی نہیں ہیں تمہاری طرح۔“ وہ سلگ کر بولے۔

”اور ایک بات کان کھول کر سن لو وہ یہاں امتحان دینے آرہی ہے اس کے لئے کوئی امتحان نہ کھڑا کر دینا اسے یہاں سکون سے رہنے دینا یوں بھی اب وہ مہمانوں کی طرح ہی اس گھر میں آیا کرے گی اب بھی اگر تم نے کوئی زیادتی کی میری بیٹی کے ساتھ تو اچھا نہیں ہوگا۔“

”ہنہ“ صائمہ بیگم نے سر کو جھکا لید اور نوید کو اجالا کی آمد کی خبر نے خوشی سے ہمکنار کیا تھا۔

☆☆☆

”میری رول نمبر سلپ اور ڈیٹ شیٹ آگئی ہے مجھے کراچی جانا ہے امتحان دینے۔“ رات کو کھانے کی میز پر اجالا نے ایس سے کہا۔

”تو جاؤ میں نے کب روکا ہے تمہیں؟“ وہ لٹھ مار لہجے میں بولا تو اسے بہت دکھ ہوا اسے اس کے جانے سے واقعی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

”آپ کو بتانا ضروری تھا۔“

”کیوں، کیوں ضروری تھا؟“

”کیونکہ اب آپ میرے شوہر ہیں خواہ زبردستی ہی بنے ہیں۔“

”اماں جان، امی ابو واپس آ جائیں گے تو ان کے پاس چلی جانا۔“

”اس کا فیصلہ تو اب وقت کرے گا کہ مجھے کس کے پاس چلے جانا ہے اور کس کے پاس نہیں جانا ہے۔“ وہ یہ کہہ کر کھانے میں مشغول ہو گئی وہ بس چند ثانیے اسے دیکھتا رہا پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

صبح ساڑھے نو بجے کی فلائیٹ تھی اجالا کی وہ جو سامان گھر سے لے کر آئی تھی وہی واپس لے جا رہی تھی ایس کے گھر والوں کی طرف سے دیا گیا سوٹ کیس جوں کا توں رکھا تھا ایس کے کمرے میں اجالا نے اسے کھولا تک نہیں تھا اس کی چابیاں بھی ایس کے پاس ہی تھیں ایس کو آفس میں ضروری کام تھا اس لئے شدید فلو اور کھانسی کے باوجود اسے آفس جانا پڑ رہا تھا وہ تیار ہو کر جانے لگا تو اجالا اپنا سامان لے کر چلی آئی۔

”اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو پلیز مجھے ایئر پورٹ چھوڑتے جائیے۔“
 ”تو تم آج ہی جا رہی ہو۔“ ایس نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔
 ”جی ہاں پاپا نے ٹکٹ بھجوا دی تھی۔“
 ”اوکے آؤ۔“

”یہ گھر کی چابیاں لے لیں۔“ اس نے کمرے لاک کر کے چابیاں تھما دیں وہ دیکھ رہا تھا وہ سیاہ شلوار قمیض اور سرمئی دوپٹے میں سادہ مگر افسردہ سی لگ رہی تھی وہ اس کا سوٹ کیس اٹھا کر باہر لے گیا۔

اجالا پر نرم اور الوداعی نظروں سے گھر کو دیکھتی اپنا سفری بیگ لے کر باہر گاڑی میں آ بیٹھی ایس نے ڈکی میں اس کا سوٹ کیس رکھا اور بیگ بچھلی سیٹ پر رکھ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔
 ”ایس کیا آپ کو مجھ سے کچھ نہیں کہنا کوئی ایسا لفظ کوئی ایسی بات جو مجھے واپسی کی امید سے سرشار رکھے؟“ وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے ایس کو دیکھتے ہوئے دل میں اس سے مخاطب تھی مگر وہ پتھر بنا گاڑی ڈرائیونگ کرتا رہا اور ایئر پورٹ کے قریب پہنچ کر گاڑی روک دی۔
 ”اب اترو بھی کیا یونہی میرے اعصاب پر سوار رہو گی؟“ ایس نے اسے بیٹھے دیکھ کر تلخی سے کہا تو اس کا دل پارہ پارہ ہو گیا مگر لب مسکرا دیئے۔

”جا رہی ہوں اور بے فکر ہو کر جائیے اب میں آپ کے اعصاب پر سوار بھی نہیں رہوں گی ہاں اپنا خیال رکھیے گا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے آفس سے جلدی فارغ ہو کر ڈاکٹر کو دکھا لیجئے

گافرنج میں سوپ اور پنجنی میں نے بنا کر رکھ دیا تھا وہی گرم کر کے پینا ہے آپ نے اور ہاں اگر ہو سکے تو ہفتے میں ایک بار مجھے کال کر لیجئے گا بے شک بات مت کیجئے گا شوہر نہ سہی کن بن کر ہی سہی فون کر لیجئے گا تاکہ پاپا کا مان اور اعتبار قائم رہے۔“ وہ اسے دیکھتے ہوئے نرمی سے بولی۔

”اور کوئی حکم؟“

”نہیں یہ حکم نہیں ہے ایک بیوی کی ہدایت اور درخواست ہے ماننا نہ ماننا آپ کی مرضی پر ہے چلتی ہوں یہاں تک ساتھ آنے کا شکر یہ اللہ حافظ۔“ اجالا نے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور دل کو سنبھالتی گاڑی سے اتر گئی سامان ایس نے اس کے پاس رکھا اور گاڑی تیزی سے آگے بڑھا کر لے گیا دو موتی اجالا کی آنکھوں سے ٹوٹ کر خساروں پر پھسل گئے ایئر پورٹ پر اسے حمید فاروقی نوید اور ولید لینے آئے تھے وہ سب سے مل کر اور وہ سب اس سے مل کر بہت خوش ہو رہے تھے صائمہ بیگم نے ”رشید محل“ والوں کو فون کر کے اجالا کے ایس سے نکاح اور اجالا کی آمد کی خبر کل ہی کر دی تھی وہ گھر پہنچی تو کچھ دیر عمرانہ، شبانہ، سعد، سہیل اور روہیل باجماعت اسی سے ملنے چلے آئے، اسے شادی کی مبارکباد اور تحفہ بھی دیئے جو ناچار اسے قبول کرنا پڑے۔

☆☆☆

”ٹرن، ٹرن۔“ ایس سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ فون کی بیل بج اٹھی۔

”ہیلو۔“ اس نے رسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

”السلام علیکم!“ دوسری جانب اجالا تھی۔

”علیکم السلام کون؟“ ایس نے اس کی آواز پر دھیان نہیں دیا تھا روانی میں پوچھا۔

”میں اجالا ہوں۔“

”تو میں کیا کروں؟“ وہ اسے ستانے کے لئے بولا۔

اندھیرے سے نکل آئیں آپ کو ہر طرف اجالا ہی اجالا ملے گا اجالا نے ذومعنی بات کہی۔

”یہ کہنے کے لئے فون کیا تھا؟“

”نہیں آپ کی خیریت معلوم کرنی تھی اب طبیعت کیسی ہے آپ کی؟“

”جیسی صبح تھی ویسی ہی اب بھی ہے کیوں کیا سننا اور جاننا چاہتی ہو کہ تمہارے چلے جانے

سے تمہارے ہجر میں میری طبیعت خراب ہو گئی ہوگی۔“

”نہیں مسٹر ایس احمد میں ایسی خوش فہمیاں نہیں پالتی میں صرف اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کرتی ہوں اپنی طرف سے اچھا کرنے کی سعی کرتی ہوں دوسرے کا عمل اور رویہ اس کا اپنا مسئلہ ہے وہ خود اس کا ذمہ دار ہے خواہ وہ منفی ہو یا مثبت مجھے صرف اپنے رویے کو درست رکھنا ہے اور بس۔“ وہ سنجیدگی سے بولی تو وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

”اور کچھ۔“

”اپنے کھانے پینے کا خیال رکھیے گا۔“

”محترمہ آپ کے میری زندگی میں داخلے سے پہلے بھی میں اپنا خیال رکھتا رہا ہوں اور میرے سب کام چلتے رہے ہیں آپ کو میرا خیال کرنے کی ضرورت نہیں ہے آپ اپنے پیپرز کی تیاری کریں اور اب میری جان چھوڑیں مجھے نیند آرہی ہے صبح مجھے آفس بھی جانا ہے۔“ وہ بے مروتی کی انتہا کرتے ہوئے تلخ لہجے میں بولا تو اس کی روح تک چھلنی ہو گئی کتنا سنگدل تھا وہ اس کے جذبات و احساسات کی اس رشتے کی ذرا بھی پروا نہیں تھی اسے۔

”معافی چاہتی ہوں آپ کو بے وقت پریشان کیا، اللہ حافظ شب بخیر۔“ اجالا نے نرمی سے کہہ کر فون بند کر دیا، ایس نے بھی رسیور کرڈیل پر رکھ دیا۔

”شرم کرو ایس وہ تمہاری خیریت دریافت کر رہی تھی تمہارے لئے فکر مند تھی اور تم نے اسے ہرٹ کر دیا اس کے خلوص کو طنز اور تمسخر میں اڑا دیا کیا قصور ہے اجالا کا کیا کمی ہے اس میں جو تم اسے اس طرح سے ذلیل کرتے رہے ہو وہ اگر غلط سوچ اور برے کردار کی مالک ہوتی تو تم پر عیاں ہو جاتی تمہاری بے رخی ہی اسے باہر دل بہلانے کے سہارے ڈھونڈنے پر اکسانے کے لئے کافی تھی مگر وہ بہت سادہ معصوم اور حساس لڑکی ہے اپنی ذمہ داری اور فرض نبھاتی رہی تمہاری تمام تر بے حسی کے باوجود اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا اور تم نے اسے روز اول سے حقیر اور قابل تحقیر سمجھا اور اپنے رویے سے سلوک اور برتاؤ سے بھی اجالا پر واضح کرتے رہے کہ وہ تمہارے لئے نا پسندیدہ ان چاہی اور قابل نفرت ہستی ہے وہ تو پہلے ہی رشتوں کے ہاتھوں ڈسی ہوئی تھی تم نے بجائے تریاق کرنے کے خود بھی اوروں کی طرح اس کی روح پر اس کے دل پر چرے لگائے اسے گھائل کرتے رہے اور وہ صبر اور شکر کے ساتھ سب کچھ سہتی رہی کیا تھا اگر تم اس کے ساتھ دوستانہ برتاؤ رکھتے۔ تم نے اس کی ہر بات پر اسے طنز کا نشانہ بنایا اور وہ مسکرا کر تمہارا ہر طنز سہتی چلی گئی۔ شیم

آن یو ایس احمد تم ایک معصوم اور بے ضرر لڑکی سے محض اس لئے دشمنی کرتے رہے۔ کہ اس سے تمہاری شادی اچانک طے کر دی گئی۔ اس کے کردار کو خواہ مخواہ تم نے شک کی نگاہ سے دیکھا تھا ”رشید محل“ والوں کی خوب سیرت با کردار خیال رکھنے والی حساس لڑکی کے لائق ہی نہیں تھے اس نے تو تم سے اپنا حق بھی نہیں مانگا اجنبیوں کی طرح وہ اس گھر میں ایک ماہ گزار کر چلی گئی ہے تم نے تو اسے اپنے کمرے میں رکھی پر فیوم کی شیشی جتنا اہم بھی نہیں سمجھا کہ اپنے کمرے میں اس کی موجودگی گوارہ کر لیتے اجالا کا اعتبار اس رشتے سے بھی اٹھ گیا محض تمہاری بے حسی کی وجہ سے۔“ ایس کو اس کا ضمیر آئینہ دکھا رہا تھا خوب لتاڑ رہا تھا وہ جوں جوں شروع سے آخر تک اپنے رویے کے متعلق سوچتا جا رہا تھا احساس جرم اور احساس ندامت میں گھرتا جا رہا تھا۔

اگلے دو دن تک وہ بخار میں سلگتا رہا اجالا اس کے لئے جو سوپ اور بخنی بنا کر فریج میں رکھ گئی تھی اس نے ہمت کر کے وہی گرم کر کے پی تھی طبیعت ذرا سنبھلی تو اسے پھر سے اجالا کے خیالوں نے گھیر لیا اسے رہ رہ کر اجالا کا مثبت اور اپنا اس کے ساتھ منفی سلوک یاد آ رہا تھا اسے احساس ندامت سے دوچار کر رہا تھا وہ بے چینی سے کبھی لیٹتا، کبھی اٹھ بیٹھتا تو کبھی اٹھ کر ٹہیلنے لگتا۔ ”ایس آپ کی طبیعت خراب ہے آپ لیٹ جائیں ناں۔“ اجالا اس کے سامنے کھڑی کھڑ رہی تھی۔

”اجالا تم آگئیں۔“ ایس بے اختیار اس کی طرف لپکا۔

”میں گئی ہی کب تھی؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”اچھا تم دور کیوں کھڑی ہو یہاں آؤ نا میرے پاس۔“ ایس بے قراری سے کہتا ہوا اسے پکڑنے کے لئے آگے بڑھا تو اس کا خیالی پیکر غائب ہو گیا ایس کے ہاتھ خلا میں معلق رہ گئے ایس کو اپنی حالت پر شدید بے بسی اور شرمندگی کا احساس ہوا۔

”آپ کے پاس میرے لئے ہے ہی کیا جو میں آپ کے پاس آؤں؟“ اجالا کی آواز اسے اپنی سماعتوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی اس نے بے بسی سے اپنا سر پکڑ لیا اور بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔

”کیا مصیبت ہے وہ پاس تھی تو مجھے احساس نہیں تھا اب چلی گئی ہے تو دو دن میں میرا حال بے حال کر دیا ہے اس نے کہیں اس کی چوڑیوں کی کھنک بکھری ہے تو کہیں ملبوس کی خوشبو کہیں

مدم نرم شیریں آواز کالمس بول رہا ہے تو کہیں حسن صبیح چہرے کا رنگ تصور کھینچ رہا ہے شاید مجھے اس کی عادت ہو گئی تھی جیسی تو میں اس کے جانے پر اس کی کمی محسوس کر رہا ہوں۔“ وہ خود کلامی کرتے ہوئے بولا۔

”عادت نہیں ایسی احمد تمہیں اجالا سے محبت ہو گئی ہے اور تم اپنے انکار کی وجہ سے اس سے الجھتے رہے تھے کہ وہ لڑکی جسے تم زبردستی اپنی زندگی میں شامل کرنے پر آمادہ ہوئے تھے جسے تم نے مجبوراً قبول کرنے کی حامی بھری تھی وہی لڑکی دلہن کے روپ میں تمہارے سامنے آئی تو تم نے تمہارے دل نے اسے بخوشی قبول کر لیا تھا اور تم اپنے اس خیال اور احساس کی نفی کرنے کے چکر میں اسے نظر انداز کرتے رہے اس کی توہین کرنے سے بھی باز نہ آئے اب کیا کرو گے اب وہ جا چکی ہے مگر پھر بھی تمہارے دل میں ہے یہی اس کی محبت کی حیت ہے یہی اس کے حسن عمل کی کامیابی ہے کہ تمہیں اجالا سے محبت ہو گئی ہے اور تم اس کی کمی محسوس کر کے بے چین ہو رہے ہو۔“ ایسی کے دل و دماغ نے اسے آئینہ دکھایا تو وہ مزید بے قرار ہو گیا۔

”اُف محبت یہ لاعلاج مرض مجھے کیوں ہو گیا آخر؟“ وہ بے بسی سے بولا۔

”اس لئے کہ اجالا ہے ہی محبت کیے جانے کے لائق۔“ دل و دماغ نے جواب دیا۔

”محترمہ خود تو چلی گئی ہیں مگر مجھے دیوانہ بنا گئی ہے پیپر زوہ دینے لگی ہے اور امتحان ادھر میرا شروع ہو گیا ہے برے پھسنے ہوا ایسی احمد اپنے رویے پر شرمسار ہوتے رہو جو تم نے اپنے مزاج کی نفی کرتے ہوئے اجالا کے ساتھ اپنا یا تھا۔“ اس کے دل نے کہا تو وہ تھک کر بستر پر لیٹ گیا۔

☆☆☆

اجالا امتحانات کی تیاری اور پیپر دینے کے باوجود ایسی کو اپنے دل و دماغ سے نہ مناسکی اسے بہت دکھ تھا کہ ایسی نے اسے ایک بار بھی فون نہیں کیا تھا وہ حمید فاروقی کو تو کہہ دیتی تھی کہ ایسی کا فون آتا ہے مگر صائمہ بیگم سے جھوٹ بولتے ہوئے اسے بہت محتاط رہنا پڑتا تھا اول تو وہ اپنی پڑھائی میں ہی مصروف رہتی تھی تا کہ صائمہ بیگم سے سامنا نہ ہو سکے پھر اس نے موبائل فون خرید لیا تا کہ اس کے جھوٹ پر صائمہ بیگم کو بھی یقین آ جائے وہ آخری پیپر دے کر بظاہر بہت ہلکی پھلکی ہو گئی تھی مگر اندر سے اسے عجیب طرح کے خوف اور وسوسے پریشان کر رہے تھے اسے ڈر تھا کہ اگر صائمہ بیگم پر ایسی کی اس کے ساتھ بیگانی عیاں ہو گئی تو وہ اسے پھر سے خاندان بھر میں

تماشا بنا کر رکھ دیں گی وہ امتحان دینے آئی تھی اب امتحان ختم ہو گئے تھے اگر ایس اسے لینے نہ آیا تو سب کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کے درمیان ناچاقی ناراضگی یا بیگانگی حاکم ہے۔

وہ نماز پڑھ کر اللہ سے اپنے بہتر اور خوشگوار باوقار اور پر بہار مستقبل کی دعائیں مانگتی ایس کی بے رخی پر اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی کہ نجانے کب اسے اس کا خیال آئے گا؟

”اجالا مہینہ ہو گیا ہے تمہیں یہاں آئے ہوئے نہ ایس تم سے ملنے آیا ہے اور نہ ہی اس نے تمہیں کبھی فون کیا ہے تمہارا اس سے نکاح ہوا بھی تھا یا مجھے بیوقوف بنا رہے ہو تم باپ بیٹی؟“ صائمہ بیگم نے ایک دن اس سے پوچھ ہی لیا وہی ہوا جس کا اسے خدشہ تھا اس نے خود کو نارمل رکھتے ہوئے جواب دیا۔

”نکاح کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ پاپا آپ سے جھوٹ بولتے ایس سے میرا نکاح ہوا تھا اور فون تو وہ مجھے تقریباً ہر روز رات کو ساڑھے بارہ بجے تک کرتے ہیں موبائل اسی لئے خریدا تھا میں نے تاکہ آپ میری فون کالز سے ڈسٹرب نہ ہوں۔“

”اچھا تو تمہارے امتحان تو اب ختم ہو گئے ہیں کب آئے گا وہ تمہیں لینے کے لئے؟“ صائمہ بیگم نے اسے جانچتی کھوجتی نظروں سے دیکھتے ہوئے اگلا سوال داغا اب اسے ایک اور جھوٹ بولنا تھا۔

”رات میری بات ہوئی تھی ان سے وہ اس وقت اسلام آباد میں ہیں اور آج رات کی فلائٹ سے کمپنی کے کام سے لندن جا رہے ہیں کہہ رہے تھے کہ ایک مہینہ بھی لگ سکتا ہے اور کام ایک ہفتے میں بھی ختم ہو سکتا ہے پھر وہاں سے واپسی پر ہی مجھے ساتھ لے جائیں گے۔“ اس نے مسکرا کر سنجیدگی سے کہا۔

”چلو دیکھیں گے مہینہ کون سا دور ہے؟“ صائمہ بیگم نے اسے شکی نظروں سے دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے ایسے کہا جیسے وہ اس کی بات کا مذاق اڑا رہی ہوں اسے بتا رہی ہوں کہ انہیں اس کی بات پر یقین نہیں ہے اجالا کا دل سہم سا گیا تھا اور اس نے رات کو نماز تہجد پڑھ کر رورو کر اللہ تعالیٰ سے اپنے شوہر کی واپسی کی دعا مانگی۔

”یا اللہ، یا رحمن، یا سمیع تو جانتا ہے جو سچ ہے میرے پروردگار مجھے میرے گھر اور خاندان والوں کی نظروں میں سرخرو کر دے، میرے شوہر ایس کو میری محبت کا احساس عطا کر دے وہ مجھے آ

کر لے جائیں میں اور جھوٹ نہیں بول سکتی اللہ میاں اپنے حبیب ﷺ کے صدقے مجھے اس امتحان میں سرخرو فرمادے میرے شوہر کا دل میری محبت سے بھر دے مجھے اس بندھن سے وابستہ ہر خوشی عنایت کر دے میرے مالک! کیا میرے نصیب میں تو نے کوئی خوشی کوئی سکھ نہیں لکھا کیا شوہر کی محبت بھی میرا مقدر نہیں ہے؟ میں تھک گئی ہوں اللہ میاں مجھے اس مشکل اور پریشانی سے نجات دلا دے میری دعا میری التجا میری فریاد قبول فرمالے مجھ گناہ گار کے گناہ اور ناکردہ سب گناہ معاف فرمادے بے شک تو معاف کرنے والا ہے معافی کو پسند فرمانے والا ہے بس مجھے بھی معاف فرمادے اور میری دعاؤں کو شرف قبولیت بخش دے۔“ وہ گڑگڑا کر رورور کر دے دعائیں مانگتے مانگتے وہیں پھر سے سجدہ ریز ہو گئی۔

دوسرے دن ”رشید محل“ سے سعد اور عشرت بیگم سعید فاروقی کشور بیگم وحید فاروقی ”حمید لاج“ کے ڈرائنگ روم میں موجود تھے وہ اپنے اپنے بچوں کی شادی کے دعوت نامے لے کر آئے تھے سہیل نے ماں کی بات مان لی تھی اور خاموشی سے عشرت بیگم کی بھتیجی کوثر سے شادی کے لئے ہاں کر دی تھی سعد نے باپ کو اپنے ساتھ ملا کر اپنی بات منوائی تھی اور اس کی شادی اس کی من پسند لڑکی مہرین سے ہو رہی تھی خالد کو دوسری لڑکیوں کے ساتھ دیکھ کر اجالا کو مضبوطی کر دار اور اپنے رویے کے عمل اور کردار کے منفی پہلوؤں نے اسے خاصا سبق سکھادیا تھا اور پھر سعید فاروقی نے بھی بیوی کے منع کرنے کے باوجود اس کی اچھی خاصی کلاس لی تھی اور اب وہ اچھی بچی بن کر رہنے کا عہد کر چکی تھی لہذا اس کی شادی شہانہ سے ہو رہی تھی کیونکہ وہ شہانہ کو پسند بھی کرتا تھا اور سہیل اور سعد نے بطور خاص اجالا اور اسیس کا مشترکہ دعوت نامہ اجالا کو دیا تھا اور عائشہ نے بھی فون پر اجالا سے اپنے رویے کی معافی مانگی تھی اور شادی میں شرکت کی سختی سے تاکید کی تھی اب ان کا خاص کر کشور بیگم اور عشرت بیگم کا رویہ بھی اجالا کے ساتھ درست تھا اولاد کی حرکتوں نے انہیں اپنی حرکتوں کی سنگینی اور پستی کا شدت سے احساس دلا دیا تھا اور انہوں نے پوری نیک نیتی سے اجالا کو اپنے ساتھ ”رشید محل“ چلنے کے لئے کہا تو وہ انکار نہ کر سکی اور اگلے دن اپنا سامان لے کر ”رشید محل“ چلی آئی شادیوں میں ابھی پورے گیارہ دن باقی تھے حمید فاروقی نے اجالا کو شادی کی شاپنگ کے لئے بیس ہزار روپے کیش دیئے تھے اس نے شہانہ عمرانہ اور عائشہ کے ساتھ مل کر اپنے لئے شاپنگ کی وہ مطمئن تھی کہ چند دن شادیوں کے ہنگامے میں گزر جائیں گے اور اسیس کے نہ آنے کا سوال سر

نہیں اٹھائے گا۔ حمید فاروقی کو بھی اس نے ایس کے لندن جانے کا جھوٹ بولا تھا مگر وہ اس کی طرف سے پریشان تھے ایس نے انہیں بھی تو فون نہیں کیا تھا اب تک۔

ادھر ایس کے گھر والے اماں جان، نفیس احمد اور انجم آراء حج کی سعادت حاصل کر کے واپس وطن لوٹ آئے تھے ایس انہیں ایئر پورٹ پر رسیو کرنے اور چند روز گھر سب کے ساتھ رہنے کے بعد واپس لاہور آ گیا تھا اور اجالا کے بارے میں اس سے جس نے بھی پوچھا اس نے یہی جواب دیا کہ اس کے امتحانات شروع ہو گئے ہیں وہ پیپرزدینے کراچی گئی ہے۔

سب کو اس کی بات پر یقین آ گیا مگر اماں جان اور انجم آراء کو شک گزرا تھا اسی لئے اس کے لاہور جانے کے کچھ روز بعد وہ دونوں بمعہ نفیس احمد کے لاہور اس کے گھر میں موجود تھیں ایس تو ان سب کو ایک ساتھ دیکھ کر بوکھلا گیا انجم آراء نے اس کے کمرے کا معائنہ کیا جہاں ان کو اجالا کو دیا گیا سوٹ کیس جس میں اس کے لئے ملبوسات اور زیورات موجود تھے مختصر سی بری جوں کا توں رکھا دکھائی دیا تو وہ معاملے کی سنگینی سے خود بخود آگاہ ہو گئیں اور ایس سے دو ٹوک لہجے میں پوچھنے لگیں۔

”ایس سچ بتاؤ تمہارا اجالا کے ساتھ برتاؤ کیسا تھا وہ واقعی پیپرزدینے گئی ہے یا تمہارے رویے کی وجہ سے ہرٹ ہو کر گئی ہے؟“

”وہ امتحان دینے ہی گئی تھی اب اگر اس کا وہاں دل لگ گیا ہے۔ تو اس میں میرا کیا تصور ہے؟“ ایس نے نظریں چراٹتے ہوئے جواب دیا۔

”تمہارا ہی تصور ہے دل تو اس کا یہاں لگنا چاہیے تھا اگر تم نے اسے محبت سے رکھا ہوتا تو وہ پیپرزدینے ہی واپس چلی آتی یہ بند سوٹ کیس بتا رہا ہے کہ تم نے اسے اتنا حق بھی نہیں دیا کہ وہ اس سوٹ کیس کو ہی کھول لیتی یا اپنے ساتھ لے جاتی۔“ انجم آراء نے غصے سے کہا تو اماں جان تاسف سے بولیں۔

”اس کی سوتیلی ماں صائمہ نے تو خوب طعنے دیئے ہوں گے اسے کہ سرال والوں نے اسے ایک جوڑا کپڑوں تک کا نہ خرید کر دیا شاباش ہے بیٹے خوب عزت افزائی کرائی ہے تم نے ہماری بھی اور اس کی بھی۔“

”زبردستی کی شادی کا یہی نتیجہ نکلتا ہے مجھے کچھ وقت چاہیے تھا اسے قبول کرنے کے لئے

بہر حال میں لے آؤں گا اسے۔“ ایس نے بے بسی سے کہا۔

”ایس بیٹا! تم نے اچھا نہیں کیا اجالا کے ساتھ کیا فرق رہ گیا۔ تم میں اور ”رشید محل“ والوں میں جو سلوک انہوں نے ساری زندگی اجالا کے ساتھ کیا، وہی تم نے کیا۔ میں تو حید بھائی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا اجالا تو خود واپس جا رہی تھی کہ وہ زبردستی تم پر مسلط نہیں ہونا چاہتی تھی مگر ہم تینوں نے اسے تمہارے لئے ہمیشہ کے لئے مانگ لیا اور تم نے یہ صلہ دیا ہے انہیں ان کے اعتبار کا کیا سوچتی ہوگی اجالا کہ دنیا کا ہر رشتہ کھوکھلا اور برا ہے کوئی پر خلوص سچا اور رشتوں کا احساس اور پاس کرنے والا نہیں ہے اس کی زندگی میں افسوس صد افسوس۔“ نفیس احمد نے تاسف بھرے لہجے میں کہا وہ شرمندہ ہو رہا تھا اور بے قرار بھی تو تھا اجالا کے بغیر یہ دن اسے بھی قیامت لگ رہے تھے مگر اس کے سامنے جانے کی اسے منکر لانے کی ہمت نہیں کر سکا تھا وہ۔

”اس پیپر میرج کا انجام کیا ہوگا؟“ انجم آراء صدے سے بولیں۔

”خوشگوار ہوگا انشاء اللہ۔“ ایس نے مسکرا کر کہا تو انہوں نے خفگی سے اسے گھورا۔

”ایس اسے منا کے لے آؤرنہ میرا مری ہوئی کا منہ مت دیکھنا پہلے کیا کم دکھ جھیلے ہیں اس بن ماں کی بچی نے جو تم نے بھی یہ فرض ادا کر دیا گناہ کمایا ہے تم نے اس کا دل دکھا کر اسے نظر انداز کر کے کیا سوچتی ہوگی وہ ہمارے بارے میں؟“ اماں جان روتے ہوئے بولیں انہیں اپنی اکھوتی نواسی کے ساتھ پوتے کے اس سلوک نے بہت دکھ پہنچایا تھا۔

”وہ آئے گی تو خود ہی اس سے پوچھ لیجئے گا رونا بند کریں میں کل ہی جا رہا ہوں اسے لینے کے لئے۔“ ایس نے اماں جان کے ہاتھ تھام کر کہا۔

”میرے کہے سے جا رہا ہے۔“

اپنے دل کے کہے سے جا رہا ہوں بلکہ دونوں کے کہے سے جا رہا ہوں وہ مسکراتے ہوئے

بولاً۔

”اگر تو نے اسے خوش نہ رکھا۔“

”یقین کریں میں اسے بہت خوش رکھوں گا۔“

”دل سے کہہ رہا ہے ناں۔“

”جی ہاں دل سے کہہ رہا ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تو تینوں کے چہرے مسکرا دیئے۔

”قبول کر لیا تیرے دل نے اسے۔“ اماں جان نے اسے کھوجتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”قبول تو پہلے دن ہی کر لیا تھا۔“

”تو پھر اسے خود سے دور کیوں رکھا وہ اجنبی بن کے کیوں رہی تیرے گھر میں تو نے اسے بیوی کا مقام اور حق کیوں نہیں دیا؟“

”غلطی ہو گئی بہت بڑی غلطی ہو گئی معاف کر دیں اماں جان! قسم سے آئندہ ایسا نہیں ہوگا ہر غلطی اور زیادتی کا ازالہ کر دوں گا میں۔“

”معافی مجھ سے نہیں اجالا سے مانگ جس کا تو نے دل دکھایا ہے جسے تو نے بوجھ اور مصیبت سمجھا تھا۔“ اماں جان نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”جو حکم اماں جان مابودلت بہ نفس نفیس اجالا بیگم سے معذرت طلب کریں گے۔ اور اپنے ہمراہ انہیں خلعت شاہانہ سے مزین کر کے آپ کے روبرو حاضری دیں گے“ ایس نے اس انداز سے کہا کہ ان تینوں کی ہنسی نکل گئی۔

☆☆☆

”رشید محل“ میں چاروں شادیاں بہت دھوم دھام سے ہوئیں سب نے خوب لطف اٹھایا خاص کر اجالا نے مایوں، مہندی کی تقاریب میں بہت انجوائے کیا جب اسے سہاگن کہہ کر دلہنوں کو مہندی لگانے کے لئے بلایا گیا تو اس کا دل بے اختیار زور زور سے دھڑکنے لگا تھا اس لمحے ایس اسے بری طرح یاد آیا تھا مگر اس نے اپنی کیفیت اور اس رشتے کی حقیقت ایس کی نگاہوں میں اپنی حیثیت کسی پر بھی ظاہر نہیں کی تھی اور ہنسی خوشی شادیوں کے تمام فنکشنز تقاریب اٹینڈ کی تھیں فارغ ہو کر جب وہ ”حمیدولا“ جا رہی تھی تو اس نے نوید اور ولید سے کہا۔

”ہاں بھی چھوٹو اور موٹو میرے ساتھ گھر چلو گے۔“

”تم تو اپنے شوہر کے ساتھ اپنے گھر ہی چلی جاؤ تو بڑی بات ہے میرے بچوں کو اپنا عادی مت بناؤ۔“ صائمہ بیگم قریب ہی کھڑی تھیں اس کی بات سن کر تلخ اور طنزیہ لہجے میں بولیں۔ تو وہ آرزو کی سے انہیں دیکھنے لگی۔

”آپ کے بچے میرے بھائی بھی تو ہیں آنٹی۔“

”بس بس زیادہ بہنایا دکھانے کی ضرورت نہیں ہے یہ میرے ساتھ جائیں گے تمہارے نصیب میں تو اکیلے جانا اور اکیلے رہنا ہی لکھا ہے تم جاؤ اکیلی مسز ایس احمد، ہونہہ سہاگن تو دیکھو جن کے شوہر کو اپنی بیوی کا حسن اسیر نہ بنا سکا وہ بھلا اور کس طرح اپنا بنے گا؟“ صائمہ بیگم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ان سب باتوں کا مقصد کیا ہے آنٹی؟“

”اس کی باتوں کا مقصد محض دوسروں کا دل دکھانا ہوتا ہے انہیں نچا دکھانا ہوتا ہے بیٹا تم دل پر مت لینا اس کی باتوں کو یہ تو سدا کی بے حس اور بد فطرت عورت ہے تمہارے بارے میں مثبت سوچنا تو اس کے نزدیک گناہ کبیرہ ہے۔“ حمید فاروقی بھی سب سے مل کر گھر جانے کے لئے آ گئے تھے صائمہ بیگم کی بات ان کے کانوں تک پہنچ گئی تھی انہوں نے غصے سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ شپٹا گئیں۔

”پاپا ہم آپ کی ساتھ جائیں گے۔“ نوید نے کہا۔

”ہرگز نہیں تم میرے ساتھ جاؤ گے چلو بیٹھو گاڑی میں۔“ صائمہ بیگم نے غصے سے نوید اور ولید کو گھورتے ہوئے کہا اور ان کا بازو پکڑ کر گاڑی کی طرف دھکیلا۔

”میں تو اپنی بیٹی کے ساتھ گھر جاؤں گا چلیں بیٹا“ حمید فاروقی نے اجالا کے شانوں کے گرد بازو حائل کر کے محبت سے کہا۔

”جی پاپا۔“ وہ خوش ہو کر بولی صائمہ بیگم غصے سے اسے دیکھتی اپنی گاڑی میں جا بیٹھیں نوید اور ولید دونوں فرنٹ سیٹ پر بیٹھنا چاہ رہے تھے بالآخر نوید فرنٹ سیٹ پر بیٹھا اور ولید پچھلی سیٹ پر صائمہ بیگم نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور گاڑی تیزی سے ”رشدِ محل“ کے احاطے سے نکال کر باہر لے گئیں ان کے جانے کے بعد اجالا نے اپنا سامان گاڑی میں رکھا اور گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی حمید فاروقی کے بیٹھنے پر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

”اجالا بیٹا، میں نے جلد بازی میں تمہاری شادی ایس سے کر تو دی تھی لیکن مجھے ڈر ہے بیٹا کہ میں نے کہیں تمہاری زندگی کے اہم معاملے میں غلط فیصلہ تو نہیں کر لیا میں نے تو ان لوگوں کی محبتیں دیکھ کر فوراً ہاں کر دی تھی مگر مجھے لگتا ہے بیٹا کہ تم اندر سے خوش نہیں ہو۔“ حمید فاروقی نے جو محسوس کیا اسے کہہ دیا۔

”پاپا آپ نے تو میرے لئے بہتر ہی سوچا تھا ناں کوئی جان بوجھ کر تو مجھے ایس کے ساتھ نہیں لیا ہوا تھا ان حالات کا شاید تقاضا تھا پاپا بعض اوقات بہت زیادہ سوچ بچار اور وقت ضائع کر کے کیے گئے فیصلے بھی غلط ثابت ہو جاتے ہیں آپ میرے لئے پریشان مت ہوں میرے نصیب میں جو دکھ لکھے ہیں وہ مجھے بہر حال مل کر رہیں گے اور جو خوشیاں میری قسمت میں لکھی ہیں وہ بہر حال مجھ سے کوئی چھین نہیں سکتا کچھ کام اوپر والے کے بھی تو ہیں ناں پاپا اللہ نامہربان تو نہیں ہے کہ اس نے میرے حصے میں کوئی سکھ کوئی خوشی کوئی راحت لکھی ہی نہ ہو لوگوں کے رشتوں اور رویوں نے مجھے مایوس ضرور کیا ہے پاپا لیکن میں نا امید نہیں ہوں پاپا دیکھ لیجئے گا ایک دن آپ کی اجالا کی زندگی میں چار سو اجالا ہی اجالا ہوگا مایوسی بدگمانی ناقدری کا کوئی اندھیرا نہیں ہوگا۔“ اجالا نے مسکراتے ہوئے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے نرم سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”انشا اللہ بیٹا میں تو ہر پل تمہاری خوشیوں کی دعائیں مانگتا ہوں۔“

”آپ کی دعائیں ضرور قبول ہوں گی پاپا اور آپ پریشان مت ہوں وہ جلد ہی مجھے آ کر لے جائیں گے۔“ اجالا نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا دل اللہ کے دربار میں جھکا فریاد کر رہا تھا۔

”یا اللہ میاں سب اپنی اپنی زندگیوں میں سیٹ ہو گئے ہیں میری زندگی بھی سیٹ کر دیں ایس کے دل میں احساس اور خیال پیدا فرما دے وہ مجھے خوشدلی سے قبول کر کے آ کے یہاں سے لے جائیں۔“

”آئس کریم کھاؤ گی بیٹا۔“ حمید فاروقی نے گاڑی آئس کریم اسپاٹ کے قریب پہنچنے پر اس سے پوچھا تو وہ چونک سی گئی۔

”جی پاپا آئس کریم اور پوچھ پوچھ۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی اور گاڑی آئس کریم پارلر کے قریب روک دی دونوں آئس کریم منگا کر کھا چکے۔ تو حمید فاروقی کے موبائل کی بیپ بج اٹھی انہوں نے دیکھا صائمہ بیگم کے موبائل کا نمبر تھا۔

”لیجئے بیگم صاحبہ نے گھر پہنچتے ہی فون بجا دیا تشویش ہو رہی ہو گی کہ ہم باپ بیٹی اب تک پہنچے کیوں نہیں۔“ حمید فاروقی نے اجالا کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا اور موبائل آن کر کے کان سے لگا لیا۔

”جی بیگم صاحبہ! فرمائیے۔“

”حمید ہمارا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔“ دوسری جانب سے صائمہ بیگم کی گھبراہٹ اور پریشانی میں ڈوبی آواز ابھری۔

”کیا ایکسیڈنٹ کہاں ہوا تم لوگ سب ٹھیک تو ہونا۔“

”کچھ ٹھیک نہیں ہے آپ فوراً سی، ایم، ایچ پنچپن ولید اور نوید دونوں زخمی ہیں ولید کی حالت تو بہت خراب ہے۔“ وہ روتے ہوئے بولیں۔

”ہم پہنچ رہے ہیں۔“ انہوں نے یہ کہہ کر موبائل آف کر دیا اور اجالا کو ہسپتال چلنے کا کہا اجالا نے فوراً گاڑی کا رخ ہسپتال کی طرف موڑ دیا۔

صائمہ بیگم ریش ڈرائیونگ کر رہی تھیں اچانک سامنے سے ویگن آگئی۔ انہوں نے گاڑی موڑنے کی کوشش کی اسی کوشش میں گاڑی کا پچھلا حصہ ویگن کی زد میں آ گیا جہاں ولید پچھلی سیٹ پر بیٹھا وہ شدید زخمی ہو گیا تھا نوید کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا تھا اس کے سر سے بھی خون کا فوارہ اٹل پڑا تھا صائمہ بیگم کو جھٹکے لگے تھے مگر انہوں نے اپنے اوسان بحال رکھے اور بچوں کو وہاں جمع ہو جانے والے لوگوں کی مدد سے ٹیکسی میں بیٹھا کر ہسپتال چلی آئیں۔

”یہ سب اسی منحوس اجالا کی وجہ سے ہوا ہے ضرور اسی نے بددعا دی ہوگی ہمیں۔“ صائمہ بیگم نے اجالا کو دیکھتے ہی روتے ہوئے غصے سے کہا۔

”ہوش کی بات کرو صائمہ غلطی تمہاری اپنی تھی غصے میں تم خود گئیں تھیں اور یقین کر لو کہ یہ تمہاری اجالا کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کا نتیجہ ہے اللہ نے تمہیں تمہارے اعمال کا نتیجہ دکھایا ہے کسی کی اولاد کو دکھ دے کر خوش ہوتی تھیں ناں تم آج تمہاری اپنی اولاد زخموں سے چور ہے تو بجائے اپنی غلطی تسلیم کرنے اور اللہ سے معافی مانگنے کے تم اس معصوم پر الزام دھر رہی ہو یہ تم سے اور ولید، نوید سے بے پناہ محبت کرتی ہے شرم آئی چاہیے تمہیں۔“ حمید فاروقی نے انہیں تاسف بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے غصے سے کہا۔

”پاپا پلیز یہ موقع ایسی باتوں کا نہیں ہے۔“ اجالا نے حمید فاروقی کا بازو پکڑ کر کہا۔

”بیٹا یہی موقع تو ہے ایسی باتوں کا اگر اس عورت کو اب بھی عقل نہ آئی تو ساری زندگی پچھتائے گی یہ“ حمید فاروقی نے سپاٹ لہجے میں کہا اسی وقت ڈاکٹر رضا نوید کو لے کر ایمر جنسی روم سے باہر نکلے اس کے سر پر پٹی باندھ دی گئی تھی اور دوا بھی کھلا دی تھی انہوں نے وہ سہا ہوا تھا ماں

باپ اور بہن کو دیکھ کر ان کی طرف لپکا۔

”پاپا، آئی۔“ وہ دوڑ کر اجالا سے لپٹ گیا اور رونے لگا اجالا نے اس کا ماتھا چوم لیا۔
”نوید چندارو نو نہیں تم تو بہادر بچے ہونا دیکھنا ابھی درد عائب ہو جائے گا۔“ اجالا اسے پیار سے سمجھا رہی تھی حمید فاروقی ڈاکٹر رضا کی طرف متوجہ ہوئے۔

”ڈاکٹر صاحب! نوید کے لئے کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے نا نہیں حمید صاحب! الحمد للہ نوید کی حالت بہتر ہے پٹی ہم نے کر دی ہے۔ آپ کو دواؤں کا نسخہ اور ہدایت وغیرہ کا چارٹ نرس دیدے گی ہاں ولید کی حالت سیریس ہے خون بہت بہہ گیا ہے آپ فوراً اے پازیو کا خون مہیا کریں ورنہ بچے کی زندگی کو خطرہ ہو سکتا ہے۔“ ڈاکٹر رضا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”حمید! کچھ کریں میرے ولید کو بچالیں ڈاکٹر صاحب میرا خون لے لیں میرے بچے کو بچا لیں۔“ صائمہ بیگم حمید فاروقی کا بازو پکڑ کر روتے ہوئے بولیں۔

”آپ حوصلہ رکھیں اور دعا کریں ہم انشا اللہ بچے کو بچانے کی پوری کوشش کریں گے آگے جو اللہ کی مرضی ہمیں امید اچھی رکھنی چاہیے۔“ ڈاکٹر رضا نے انہیں دیکھ کر کہا۔

”ڈاکٹر صاحب میرا بلڈ گروپ اے پازیو ہے آپ میرا بلڈ میرے بھائی کو لگا دیں۔“ اجالا نے نوید کو صائمہ بیگم کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”اسے کہتے ہیں بہن بھائی سے محبت آئیے ہم آپ کا بلڈ ٹیسٹ کرنے کے بعد آپ کا بلڈ لیں گے۔“ ڈاکٹر رضا نے مسکرا کر کہا تو وہ ان کے پیچھے چلی گئی۔

”دیکھاتم نے آج وہی ننھوں، آوارہ، حرافہ تمہارے بیٹے کو اپنا خون دینے کے لئے گئی ہے برداشت کر لوگی اس کا خون اپنے بیٹے کی رگوں میں۔“ حمید فاروقی نے صائمہ بیگم کو دیکھتے ہوئے طنز یہ لہجے میں کہا تو وہ روتے ہوئے بولیں۔

”خدا کے لئے حمید بس کریں معاف کر دیں مجھے میں مانتی ہوں یہ میرے ہی برے اعمال کا نتیجہ ہے پلیز دعا کریں میرا بچہ بچ جائے میں اجالا کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی معافی مانگ لوں گی اس سے بھی۔“

”وہ کوئی احسان نہیں کر رہی تم پر اپنے بھائی سے محبت کا حق ادا کر رہی ہے اپنا فرض بھاری ہے۔“ حمید فاروقی نے نوید کو اپنی گود میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

”پاپا ہم آپنی کے ساتھ جانا چاہتے تھے مئی نے نہیں جانے دیا اور ایکسیڈنٹ کرا دیا ولید بھائی کو بہت چوٹ لگی ہے پاپا۔“ نوید روتے ہوئے بولا۔

اجالا خون کی بوتل دے کر آئی۔ اور خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ دل میں ولید کی صحت و سلامتی کی دعائیں مانگنے لگی۔

”اجالا بیٹا مجھے معاف کر دو میں نے بہت دکھ دیئے ہیں تمہیں۔“ صائمہ بیگم اچانک اپنی جگہ سے اٹھیں اور اس کے سامنے آ کر ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے بولیں۔

”آئی یہ کیا کر رہی ہیں آپ پلیز ایسا مت کریں آپ بڑی ہیں مجھ سے بیٹھیں ادھر“ اجالا نے ان کے ہاتھ تھام کر چوم کر بے قراری سے کہا اور انہیں اپنے برابر بٹھالیا۔

”بڑی تو ہوں مگر بہت چھوٹے پن کا مظاہرہ کرتی رہی ہوں تمہارے ساتھ تم نے ولید کو خون دے کر مجھ پر احسان کیا ہے۔“

”ایسا مت کہیں آئی، بس آپ دعا کریں کے میرا خون ولید کی زندگی بچانے کے کام آ جائے۔“

”آمین۔“ انہوں نے دل سے کہا اور اجالا کو اپنے گلے سے لگالیا۔

”آج سے تم مجھے آئی نہیں کہو گی مئی کہو گی۔“ وہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر بولیں۔

”مئی۔“ اجالا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے صائمہ بیگم نے اس کی اجلی پیشانی کو چوم لیا۔

”یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے تو نے میری بیوی کے دل میں میری اجالا کے لئے نرمی اور محبت

پیدا کر دی اب اس نرمی اور محبت کو ہمیشہ قائم رکھنا مالک۔“ حمید فاروقی نے یہ معجزہ دیکھ کر دل میں دعا مانگی پھر سب ولید کی سلامتی کی دعاؤں میں مگن ہو گئے۔

”رشید محل“ بھی فون کر دیا گیا وہاں سے سعید فاروقی اور وحید فاروقی کے علاوہ عشرت بیگم

بھی ہسپتال پہنچ چکے تھے اجالا کے خون دینے کا سن کر انہیں بھی اس پر رشک آ رہا تھا عشرت بیگم تو

اپنے سابقہ رویے پر ایک بار پھر سے شرمندہ ہو گئی تھیں اور اجالا خوش تھی کہ سب اپنوں کے دلوں

میں اس کے لئے اپنائیت اور محبت کے جذبات پیدا ہو گئے ہیں۔

ولید کو صبح فجر کے وقت ہوش آ گیا تھا وہ خطرے سے باہر تھا سب نے اللہ کا شکر ادا کیا

صائمہ بیگم نے دونوں بچوں کا صدقہ اتارا شکرانے کے نفل ادا کیے ولید کو ریکوری روم میں شفٹ کر

دیا گیا اس کے سر اور بازوؤں پر پٹیاں بندھی تھیں دایاں بازو فریکچر ہو گیا تھا ”رشید محل“ سے سب ولید اور نوید کی خیریت معلوم کرنے آتے رہے ایک ہفتے بعد آج ولید گھر آ رہا تھا اجالانے گھر آ کر پورا گھر نئے سرے سے صاف ستھرا کرایا ولید کا کمرہ پھولوں سے سجایا دوپہر کا کھانا سب نے اکٹھے کھانا تھا لہذا آج ولید کے ہوسپل سے ڈسپانر ہو کر گھر آنے کی خوشی میں اس نے ملازمہ کے ساتھ مل کر کھانا بھی خاص بنوایا تھا آخر میں وہ نہا کر کاٹن نیٹ کا بے بی پنک کلر کا شلوار قمیض دوپٹہ زیب تن کیے بالوں کو کھولے پر فیوم سے مہکتی تیار ہو کر کمرے سے باہر آ گئی ڈرائنگ روم میں آئی تو وہ دروازہ ڈور تیل بجنے پر دوڑ کر جا کر کھولا تو مارے حیرت کے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ایسی احمد سیاح پیٹ کوٹ اور سفید شرٹ میں ملبوس اس کی نظروں کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”آپ یہاں۔“ وہ بمشکل بول پائی تھی وہ اس کی حیرت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔

”کیوں جناب کیا میں اپنی سرال میں نہیں آ سکتا، آ سکتے ہیں مگر۔“

”اگر مگر ہی کرتی رہو گی سلام دعا نہیں لو گی خیر ہم سلام کیئے لیتے ہیں السلام علیکم۔“ ایسی نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا اور مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ آگے کر دیا وہ حیرت سے کبھی اس کے چہرے کو تو کبھی اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔

”بیگم صاحبہ آپ کا اور میرا رشتہ تو اتنا گہرا ہے کہ میں مصافحہ کیا آپ سے معاف نہ بھی بے خوف و خطر کر سکتا ہوں اب یہ ہاتھ کیا یونہی پھیلا رہے گا؟“ ایسی نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے شرارت بھرے لہجے میں کہا تو اس نے جھجکتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اس کی انگلیوں سے مس کر دیں۔

”مکمل اختیار رکھتا ہوں آپ مکمل ہاتھ ملانا پسند کریں گی یا ہم خود ہی آپ کے گلے سے لگ

جائیں؟“ وہ شرارت سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”پلیز مسٹر ایسی مجھے اس قسم کی گفتگو سننے کی عادت نہیں ہے۔“ وہ حیا آمیز کوفت میں مبتلا

ہو کر جھلا کر بولی اور واپس پلٹ آئی۔

”تو ڈیڑھ عادت ڈال لو کیونکہ اب تمہیں اسی قسم کی گفتگو سننے کو ملا کرے گی۔“ وہ دھیرے

سے ہنسا اور اس کے پیچھے آتے ہوئے بولا۔

”کیوں؟“

”اس کا جواب میں تمہیں گھر پہنچ کر دوں گا امی ابو اور اماں جان جج سے واپس آ گئے ہیں اور اماں جان نے تمہیں موجود نہ پا کر اور تمہارے ساتھ میرا غیردوں کا سا برتاؤ برتنے پر وہ مجھ سے شدید خفا ہیں انہوں نے میری خوب کھینچائی کی ہے اور حکم دیا کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر آؤں اور ان کے حضور حاضری دوں۔“ ایسی نے نرمی سے کہا۔

”تو آپ اماں جان کے کہنے پر مجھے لینے آئے ہیں۔“ وہ افسردگی سے بولی۔

”اجالا یا رکھا سارے بھید سارے راز و اسرار سارے سچ آج ہی ادھر ہی کھڑے کھڑے پوچھ لو گی کچھ راز سچ اپنے گھر کے لئے بھی رہتے دو۔“ وہ شرارت بھرے لہجے میں بولا تو وہ حیا سے سرخ ہو گئی۔ یہ ایسی وہ تو نہیں تھا جسے وہ چھوڑ کر آئی تھی۔ یہ لہجہ یہ انداز یہ الفاظ لگا ہوں سے چھلکتی وارفتگی اور محبت یہ تو اور ہی ایسی تھا اس کے سامنے جو اس کے دل و نظر میں اپنی محبت کے پھول کھلاتا جا رہا تھا۔

”آپ بیٹھیں میں آپ کے لئے چائے لاتی ہیں۔“ وہ ہنستا کر بولی۔

”مجھے چائے کی نہیں تمہاری چاہ کی طلب ہے اجالا۔“ ایسی نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”جی۔“ اجالا نے گھبرائے ہوئے انداز میں اس کا دلکش چہرہ دیکھا۔

”جی میں تمہیں اپنے دل کے کہنے پر لینے آیا ہوں۔“

”اتنی دیر سے خیال آیا آپ کے دل کو میرا۔“ اس کی زبان سے بے اختیار شکوہ پھسل گیا۔

”خیال تو شروع دن سے ہی تھا مگر تمہارے سامنے آنے کی ہمت نہیں پار ہا تھا۔ خود میں

تمہارے ساتھ اچھا سلوک جو نہیں کیا تھا میں نے میں اپنے رویے پر بہت نادم ہوں پلیز اجالا

مجھے معاف کر دو۔“ وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔

”معاف کر دیا اور کچھ۔“ اجالا نے اس کی آنکھوں سے سچ چھلکتا دیکھ کر کہا۔

”اب میرے ساتھ گھر چلو پلیز۔“

”چلوں گی مگر کچھ دن بعد۔“

”کچھ دن کیا میں ایک دن کی بھی مہلت نہیں دوں گا تمہیں پلیز چلو نیا ر تمہارے بغیر اس

گھر کے درد و یار تک میرا منہ چڑا رہے ہوتے ہیں میں تمہارے تصور کے پیچھے کب تک دیوانہ وار

لپکتا رہوں گا؟“ وہ بے قراری اور محبت سے چور لہجے میں بولا۔

”آپ نے حقیقت میں تو مجھے قبول نہیں کیا تھا اور میرے تصور کے پیچھے دیوانے ہو گئے۔“ وہ اس کی محبت کا اظہار سن کر روح تک سے سرشار ہوتے ہوئے بولی۔

”تمہارے یہاں چلے آنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ تم تو روز اول سے میرے من میں تھیں میں ہی تم سے البتہ تار با دراصل اچانک شادی ہونے پر چڑ گیا تھا اسی لئے تم سے گریزاں اور نالاں رہا تم تو میرا چین سکون نیند آرام سب کچھ اپنے ساتھ لے آئیں تھیں پلیز اب تو چلو نا۔“

”مئی اور پاپا تو آ جائیں۔“

”آ جائیں گے تم اتنی دیر میں اپنا ضروری سامان پیک کر لو۔“

”ولید ہو سٹل سے آج ڈسچارج ہو کر گھر آ رہا ہے اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اللہ نے کرم کیا اس کی جان بچ گئی اس لئے آج یا کل پرسوں تک تو میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ تفصیل بتا کر کہنے لگی۔

”نہیں جاؤ گی تو میں یہیں چھوڑ جاؤں گا۔“ اس نے خفگی سے دھمکی دی۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“ وہ بے نیازی سے بولی اس کی اپنے لئے بے قراری دیکھ چکی تھی اس لئے مطمئن تھی کہ اب وہ اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑے گا۔

”اور مرضی کی مامی کیوں میرا امتحان لے رہی ہو جانتی ہو کتنی راتوں سے میں ٹھیک سے سویا نہیں ہوں۔“ وہ پیار بھری خفگی سے بولا۔

”جب پاس تھی تب تو بڑے مزے سے بے نیازی سے سو جاتے تھے۔“

”پاس تھیں تو مجھے تمہاری قدر و قیمت کا، اہمیت کا احساس نہیں تھا دور ہوئیں تو لگا جیسے سب کچھ تمہارے دم سے ہی تو تھا۔“

”سچ۔“ اجالا نے خوش ہو کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”ہاں جان من سچ، اب کیا سارے سچ یہیں اگلو الو گی؟“

”اوہو، ایسے عیاں آئے ہیں۔“ حمید فاروقی ولید کو اپنے ساتھ لگائے اندر داخل ہوئے صائمہ بیگم ان کے پیچھے تھیں، وہ دونوں ان کی طرف بڑھے۔

”السلام علیکم انکل!“ ایس نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے اسے گلے سے لگالیا اجالا خوشی خوشی اور مطمئن ہو کر ولید کو کپڑا کر صوفے تک لے آئی اور اسے صوفے پر بیٹھا دیا۔

ایس سے اس کے گھر والوں کی خیریت دریافت کی گئی اور ایس نے ولید اور نوید کے ایکسیڈنٹ کا احوال پوچھا ان دونوں کی خیریت دریافت کی دوپہر کا کھانا سب نے اکٹھے کھایا اجالا نے دس نفل شکرانے کے ادا کیے ولید کے گھر آنے اور ایس کے آنے کی خوشی میں۔

”اجالا، میں نے اپنی اور تمہاری شام کی سیٹیں بک کرائی ہوئی ہیں چلو ناں۔“ ایس کھانے سے فارغ ہوتے ہی اس کے پاس آ کر کہنے لگا۔

”آپ چلے جائیں شام کی فلائٹ سے۔“
”اکیلا۔“

”جی ہاں آپ کو کچھ تو سزا ملنی چاہیے نا اپنی بے رخی کی۔“

”تم تو بہت اچھی ہو پلیز معاف کر دو۔“ ”معاف تو میں نے کر دیا ہے آپ کو۔“

”مجھے احساس ہے تم جس کرب اور اذیت سے گزری ہو میں نے بہت دکھ دیا ہے تمہیں مگر جان یقین کرو آج کے بعد میں تمہیں سکھائی سکھ دوں گا بہت پیار کرتا ہوں میں تم سے یقین آ جائے گا تمہیں جب تم میرے ساتھ رہو گی“ ایس نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے ایمانداری سے کہا۔

”ایس بیٹا تم آرام کر لیتے کیا دو مہینے کی باتیں آج دوپہر میں ہی کر ڈالو گے؟“ صائمہ بیگم نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”آئی میں تو اجالا کو لینے کے لئے آیا ہوں اس کے بغیر میرے گھر اور زندگی میں اندھیرا چھا گیا ہے میں نے شام کی سیٹیں بک کرائی ہیں وہاں سب اسے بہت یاد کرتے ہیں۔“ ایس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ ہے ہی بہت اچھی مجھے بہت دیر سے اس کی قدر ہوئی ہے ایس بیٹا اجالا کا بہت خیال رکھنا یہ معصوم ہے ہم عورتوں نے جانے کس دشمنی اور حسد میں اسے بدنام کر کے رکھ دیا یہ تو پاکیزہ ہے کنول کے پھول کی طرح بیٹا کبھی کسی کے بہکاوے میں آ کر اجالا پر شک مت کرنا اس سے بد گمان مت ہونا یہ بہت حساس ہے اور محبت کرتی ہے یہ تو سب سے۔“ صائمہ بیگم نے اجالا کے پاس بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”میں جانتا ہوں آئی انشا اللہ اب اجالا کو میری محبتوں کا اجالا ہمیشہ روشن خوش اور سرشار

رکھے گا بس آپ آج شام ہمیں دعاؤں کے ساتھ رخصت کر دیں۔“ اسیں نے دل سے کہا۔
 ”آج تو نہیں بیٹا۔“

”پھر کب؟“ وہ بے چین ہوا۔

”پندرہ دن بعد، اس کا نکاح ہوا ہے نا تو رخصتی دھوم دھام سے اس گھر سے ہوگی اور مایوں مہندی کی رسمیں بھی ہوں گی پورا خاندان اس کی شادی میں شرکت کرے گا اب تم بارات لانے کی تیاری کر لو ہم اپنی بیٹی کو پوری شان سے دلہن بنا کر رخصت کریں گے تمہارے امی ابو سے حمید خود بات کر لیں گے ہاں تم بے شک شام کو چلے جانا رکنا چاہو تو یہ بھی تمہارا اپنا گھر ہے۔“
 ”جی۔“ وہ حیران رہ گیا وہ اپنی بات مکمل کر کے چلی گئیں۔

”اجالا یہ سب کیا ہے؟“ اسیں نے اجالا کے خوشی اور حیا سے مسکراتے چہرے کو دیکھا۔
 ”یہ میری خوش بختی ہے کہ صائمہ آنٹی میری ماں بن کر سوچ رہی ہیں حالات نے سب کچھ میرے حق میں کر دیا ہے اب آپ بھی وہی کریں جو می نے کہا ہے۔“

”لیکن پندرہ دن تک میں کیا کروں گا؟“

”وہی جو گزشتہ دو ماہ سے کر رہے تھے۔“ وہ شوخی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”کیا؟ میں پاگل ہو جاؤں گا اجالا۔“

”تب مجھے آپ کی محبت کا یقین آ جائے گا۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”گو یا ابھی یقین نہیں آیا۔“

”آیا تو ہے کچھ کچھ۔“ وہ شرارت سے ہنسی۔

”اچھا سمجھ گیا تم مجھ سے بدلہ لے رہی ہو تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے ہے ناں۔“

”محبت نہ ہوتی تو آپ کے حسن سلوک کا احوال یہاں آ کر سب کو کہہ سنا تی اور آپ کے

امی ابو سے الگ شکایت لگاتی۔“ وہ بنجیدگی سے بولی تو وہ دل سے مسرور ہو گیا۔

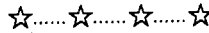
”تمہاری محبت کے یقین نے مجھے جو خوشی بخشی ہے یہ پندرہ دن اس کے فسوں میں سرشاری

میں گزر جائیں گے پھر ہم تم ہوں گے اور ہماری محبتوں کا اجالا چار سو ہوگا انشا اللہ۔“ اسیں نے

اس کا ہاتھ تھام کر اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے یقین سے کہا تو وہ اسے دیکھتے ہوئے شرمیلے پن

سے مسکرا دی اب اس کی زندگی سے اندھیرا چھٹ گیا تھا اور اجالا چار سو پھیل گیا تھا پیار کا اعتبار اور

وقار کا اجالا موسم بہار کا اجالا۔



سفر خاصا طویل تھا اسے کوئی دشواری تو نہیں ہوئی تھی لیکن وہ کچھ گھبرا رہی تھی چونکہ پہلی بار اکیلی گھر سے نکلی تھی انجان راستہ اور علاقہ اجنبی چہرے ایئر پورٹ سے اس نے ٹیکسی کے ذریعے گاؤں کی جانب سفر شروع کیا تھا جہاز کے بعد ٹیکسی اور اب پیدل چلنے کی باری تھی۔ آگے ٹیکسی والے نے جانے سے انکار کر دیا تھا اور راؤ مظفر علی خان کی حویلی تک اسے پیدل اکیلے ہی جانا تھا کیونکہ ان کی حویلی تک جانے والی سڑک پر غیر متعلقہ ٹریفک ممنوع تھی اس نے دور تک جاتی سڑک کو دیکھ کر گہری سانس کھینچتے ہوئے خود کو چلنے کے لئے تیار کیا دور دور تک آبادی بھی نظر نہیں آ رہی تھی تا حد نظر کھیت ہی کھیت تھے موسم یکا یک ہی بدل گیا تھا یکدم سے گہرے سرمئی سیاہ بادلوں نے آسمان کو گھیر لیا تھا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اسے فرحت اور تازگی کا احساس دلارہی تھی مگر وہ ڈر بھی رہی تھی کہ کہیں یہ کالے بادل برس نہ پڑیں اور وہ حویلی پہنچنے سے پہلے بھیگ نہ جائے رحیم یار خان کا موسم ایسا ہی تھا بے اعتبار کبھی بے حد خشک گرم اور جس زدہ تو کبھی اچانک ٹھنڈا سرد اور بھیگا ہوا بادل مزید گہرے ہوتے چلے گئے دوپہر کے وقت ہی سیاہ بادلوں کے سبب گہرا اندھیرا چھا گیا تھا اب تو وہ خوب خوفزدہ ہو رہی تھی اور تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی اور بارش سے پہلے حویلی پہنچنا چاہ رہی تھی مگر بارش بھی اس سے مقابلے پر اتر آئی اور اتنا ابر برسا کہ جیا کو لگا جیسے آکاش بوندوں کی چادر بن گیا ہے اس کی چادر پانی میں بھیگ کر اس کے بدن سے لپٹ گئی تھی وہ اپنے سوٹ کیس کی ڈوری کھینچتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا اجنبی راستے پر اکیلے سفر کرنا اور اکیلی لڑکی ذات کا ایسے موسم میں باہر پھرنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔

”یا اللہ! یا بارش رک جائے یا حویلی آجائے۔“ جیانی نے دل میں دعا مانگی بارش تھمی نہ حویلی آئی البتہ اس کے پیچھے گاڑی نے زور سے ہارن بجایا جس سے وہ بھاگ کر خوفزدہ ہو کر کنارے پر ہوئی پھر سہی ہوئی نظروں سے گاڑی کو دیکھنے لگی اگلے پل دروازہ کھول کر نیچے اترنے والا وہ جو کوئی بھی تھا اسے دیکھ کر وہ بالکل غیر ارادی طور پر دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور آیت الکرسی پڑھنے لگی۔

”کون ہیں آپ؟“ اسے ڈرتے دیکھ کر اس نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا لہجے کی شائستگی

سے وہ کسی حد تک سنبھل گئی پھر بھی جواب دینے سے گریز کیا تو وہ اس کی سہمی صورت اور ہونٹ ہلنے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

”میں کوئی بھوت پریت یا شیطان ٹائپ کی شخصیت نہیں ہوں مجھے راؤ مظفر علی خان کی حویلی جانا ہے یہ سڑک اسی حویلی تک جاتی ہے آپ کو کہاں جانا ہے؟“

”مجھے راؤ صاحب کی حویلی ہی جانا ہے۔“ اس نے اپنے پیچھے نظر دوڑا کر جواب دیا۔

”کہاں سے آرہی ہیں آپ؟ میرا مطلب ہے پہلے کبھی آپ کو نہیں دیکھا۔“

”جی میں پہلی بار یہاں آئی ہوں۔“

”آئی سی آئی آپ نے تو مجھے بھی بارش میں بھگو دیا ہے سر سے پاؤں تک بھیک گیا ہوں میں۔“ اس نے ذومعنی بات کہی ساتھ ہی گاڑی کا دروازہ کھول دیا پھر اسے شش و پنج میں دیکھ کر کہنے لگا۔

”میرانا م علی امر ہے اور میں راؤ مظفر علی صاحب کا پوتا ہوں فی الحال اتنا تعارف کافی ہے آئیے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو اس نے دھیرے سے قدم آگے بڑھا دیے اس نے اس کا سوٹ کیس لے کر ڈیڑگی میں رکھ دیا وہ چھلی سیٹ پر بیٹھ گئی علی امر نے اپنے گیلے بالوں میں ہاتھ پھیرے اور گاڑی اشارت کر دی۔

”یہ ماموں میاں کا پوتا ہے اور امر بھائی کا بیٹا ہے مگر اتنا بیک یہ تو مجھ سے بھی بڑا ہے بلکہ کافی بڑا ہے یہ امر بھائی کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے؟“ جیانے علی کے بھرے بھرے کسرتی جسم اونچے لمبے قد کا ٹھکودیکھتے ہوئے سوچا۔

”کہیں میں پھنس تو نہیں گئی؟“ اس نے خوفزدہ ہو کر سوچا۔

”بارش کا شور رات کی تاریکی اور ایک ویران سڑک پر اجنبی شخص کا ساتھ شیطان کو مہمان

بننے کے لئے اور کیا چاہیے۔“

”آپ مطمئن ہو کر بیٹھیے میں آپ کو بحفاظت حویلی پہنچا دوں گا ہر مرد شیطان کا بھائی نہیں ہوتا کچھ میرے جیسے خوب سیرت مرد بھی ہوتے ہیں۔“ علی نے بیک مر میں اس کے چہرے کے تاثرات پڑھتے ہوئے کہا تو وہ آپ ہی آپ شرمندہ ہو گئی۔

”میں کیوں خوفزدہ ہو رہی ہوں یہ شخص امر بھائی کا بیٹا ہے اس کے نام کے ساتھ تو امر بھائی

کا نام لگا ہے یہ کونسا مجھے جانتا تھا جو مجھ سے اپنے نام کے بارے میں جھوٹ بولتا رشتے داروں سے کبھی نہ ملنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے اب پہچانا مشکل ہو رہا ہے۔“ اس نے دل میں سوچا۔

”مگر یہ ہے تو ایک مرد ہی ناں۔“ اس کے دماغ نے ڈرایا تو اس نے آئینے میں دیکھا وہ بہت محفوظ انداز میں مسکرا رہا تھا وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے باہر دیکھنے لگی چند سیکنڈ بعد گاڑی ”راؤ مظفر علی خان۔“ کی حویلی کے بڑے سے گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی جیانیہ دائیں جانب نظریں دوڑائیں وسیع و عریض لان بارش میں نہا رہا تھا سرخ اینٹوں کے چھجوں پر بارش برستی جا رہی تھی اور گرد دھوتی جا رہی تھی گاڑی طویل روش سے ہوتی ہوئی پورچ میں جا کر رک گئی علی گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

”آئیے محترمہ! اندر چلیے۔“ علی نے اس کی جانب آ کر گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا تو وہ جھجکتے ہوئے گاڑی سے نیچے اتر گئی علی نے اس کا سوٹ کیس گاڑی سے نکال کر ملازم کو دے دیا اور اندر لے جانے کا حکم دیا۔

”اپنا نام بتانا پسند فرمائیں گی آپ؟“ علی نے پورچ میں جلتی ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی میں اس کی کھلتی ہوئی گندمی رنگت والے چہرے کے دلکش نقوش کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میرا نام ”جیا علی“ ہے۔“ اس نے مدہم آواز میں بتایا۔

”او..... تو علی شروع ہی سے آپ کے نام سے منسوب ہے۔“ وہ معنی خیز اور شرارتی لہجے میں بولا تو وہ ٹیٹا گئی کیلے کپڑوں میں اسے لاج الگ آ رہی تھی۔

”مظفر ماموں کہاں ہیں؟“ جیانیہ پوچھا۔

”دادا جان تو اندر آنے والی ہستی کا انتظار فرما رہے ہیں۔“ سمج نے بڑے سے لکڑی کے مقش دروازے سے باہر نکلتے ہوئے کہا تو ساتھ ہی لائٹ بھی چلی گئی اور زردار بجلی کڑکی تو جیا کی چیخ نکل گئی۔

”ڈریے مت ابھی ملازم جزیئر آن کر دے گا تو روشنی ہو جائے گی۔“ علی نے نرمی سے اسے تسلی بھرے انداز میں کہا۔

”وہ آئیں حویلی میں اتنا تو سمج نے دیکھا پھر اس کے بعد ٹیوب لائٹس روشن نہ رہی۔“ سمج نے موقع کی مناسبت سے شعر کا پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے کہا۔

”سمیج کے بچے کیوں ہماری بیٹی کے لئے شرمندگی کا سامان کر رہے ہو چلو دور ہو اور جیا کو آنے دو۔“ مظفر ماموں کی آواز سن کر جیا کو حوصلہ ہوا اسی وقت جزیئر آن ہو گیا تھا روشنی ہوتے ہی جیا نے مظفر ماموں کو پہچان لیا اور آگے بڑھ کر سلام کیا وہ اس کے سر پر دست شفقت رکھ کر بولے۔

”وعلیکم السلام! جیتی رہو شکر ہے تم یہاں آئیں اور خیریت سے آگئیں۔“
 ”خیریت سے کہاں دادا جان! یہ تو بارش میں غسل فرماتی آئی ہیں۔“ سمیج نے چپکتے ہوئے کہا تو وہ نادام ہو کر نظریں جھکا گئی۔
 ”کوئی بات نہیں جیا بیٹی تم ایسا کرو کہ پہلے چہنچ کر لو اس کے بعد ہم سب سے تمہارا تعارف کرائیں گے ویسے باقی سب لوگ بھی تم سے ملنے کے لئے بے تاب ہیں۔“ مظفر صاحب نے کہا تو وہ بولی۔

”ماموں جان! امی کو فون کر کے میرے یہاں پہنچنے کی اطلاع کر دیجئے۔“
 ”بیٹا! فون تو بارش کی وجہ سے خراب ہو گیا علی کے موبائل پر اطلاع دے دوں گا میں عطیہ کا فون آیا تھا۔ آدھا گھنٹہ پہلے کہ جیا آ رہی ہے پہنچی یا نہیں بس اس کے بعد لائن کٹ گئی۔“ مظفر صاحب نے اسے اپنے ساتھ اندر لاتے ہوئے بتایا۔
 ”آپ فون کر دیجئے میں چہنچ کر کے آتی ہوں۔“
 ”ٹھیک ہے سمیج جاؤ جیا کو کمرہ نمبر چار میں پہنچا کر آؤ۔“ مظفر صاحب نے سمیج سے کہا جو اس پیاری سی لڑکی کو بہت خوشی سے دیکھ رہا تھا۔

”چلیئے پھپھو! میں آپ کو آپ کے کمرے تک چھوڑ آؤں آپ کو میرے نام کا علم تو ہی گیا ہے میں سمیج احمر ہوں علی احمر میرے بڑے بھائی ہیں حال ہی میں MES کر کے امریکا سے واپس پلٹے ہیں اور مابدولت نے بی ایس سی کے ایگزامز دے رکھے ہیں رزلٹ آج کل میں آنے والا ہے آپ نے ہمارے دادا جان کو ماموں جان کہا ہے اس سے یہ تو واضح ہو گیا کہ آپ عطیہ آنٹی اب میں انہیں دادی پھپھو کیا کہوں میرا خیال ہے آنٹی ہی مناسب ہے تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ عطیہ آنٹی کی بیٹی ہیں یعنی مظفر دادا کی بہن کی بیٹی تو اس رشتے سے آپ ہماری پھپھو لگیں میں آپ کے ماموں کے بیٹے احمر صاحب کا بیٹا ہوں اور نگین میری چھوٹی بہن ہے بس سو سال کا

فرق ہے ہماری عمروں میں اور علی بھائی سے بڑی نورین آبا ہیں جو کہ منور تایا کے بیٹے عمر سے بیاہی گئی ہیں ان کے دو بچے ہیں ایک بیٹا اور ایک بیٹی اور عمر بھائی کی ایک بہن ہے بہت پیاری اس کا نام نشاء ہے جسے دیکھ کر نشہ سا ہو جاتا ہے اور اشعر نشاء کا بھائی ہے میرا ہم عمر ہے اور ہمارا متوقع بہنوئی بھی بزرگوں نے نکلین کو اشعر کے سر منڈھنے کا سوچ رکھا ہے یہ آپ کا کمرہ ہے ہر چیز یہاں موجود ہے اگر پھر بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو بندہ حاضر ہے۔“ سمیع نے اس کے کمرے تک پہنچے پہنچے اتنی تیزی سے اپنا تعارف اور گھر والوں کا غائبانہ تعارف کرایا کہ جیسا کہ ہنس کا ہنس کر چہرہ سرخ ہو گیا۔

”تم بہت بولتے ہو بے چاری نشاء تو چند ہی دنوں میں اپنی سماعتوں سے فارغ ہو جائے گی۔“ جیانیے مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا تو وہ جھینپ کر بولا۔
 ”ابھی تک اس کی سماعتوں میں فرق نہیں آیا بچپن سے میری دلنشین آواز کی لوری سنتی آئی ہے وہ آپس کی بات ہے پھپھو آپ ہیں خاصی ذہین آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں نشاء کو.....“
 ”تم نے اس کا تعارف جس انداز میں کرایا تھا اس سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل تو نہیں تھا۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”میں واقعی بہت بولتا ہوں اور بعض اوقات وہ باتیں بھی بول جاتا ہوں جو نہیں بولنی چاہئیں خیر آپ تو اپنی ہیں آپ سے کیا پردہ۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔
 ”سمیع! ساری تاریخ اور جغرافیہ آج ہی سنا دو گے بتا دو گے انہیں کچھ کل کے لئے بھی بچا رکھو۔“ علی کی سنجیدہ آواز ان دونوں کے کانوں میں پڑی تو جیانیے دیکھا وہ اسی کے چہرے پر نظریں مرکوز کئے ہوئے تھا۔

”سارا دیدار آج ہی کرنے کا ارادہ ہے کیا کچھ کل کے لئے بھی بچا رکھیں۔“ سمیع کہاں پیچھے رہنے والا تھاٹ سے بدلا اتارا جیاشرم سے سرخ پڑ گئی اور تیزی سے کمرے میں کھس گئی۔
 ”سمیع کے بچے تمہیں زندہ میں چھوڑوں گا نہیں۔“ علی تجل ہو گیا اور جیانیے کے کمرے میں کھتے ہی غصے سے بولتا اس کے پیچھے بھاگا۔

”ہائے اللہ! میرے بچے ابھی پیدا ہوئے نہیں اور انہیں جان سے مارنے کی پلاننگ ابھی سے ہونے لگی ہائے میرے معصوم بچوں کے دشمن میرے پیچھے پڑ گئے ہیں میرے بچو! تمہارا اللہ

نگہبان۔ ”صبح بڑے دردناک انداز میں دہائی دیتا آگے بھاگا تھا علی کو اس کے اس انداز پر بے تحاشا ہنسی آئی۔

وہ نہا کر کپڑے تبدیل کر کے بال سنوار کے ڈرائنگ روم میں آگئی جہاں حویلی کے سب افراد موجود تھے۔ فردا فردا سب نے اس کو خوش آمدید کہا۔ اور مظفر ماموں کو اسے کسی سے متعارف کرانے کی ضرورت نہیں پڑی، اس نے خود ہی سب کو ان کے ناموں سے پہچان کر سلام دعا کی کیونکہ صبح کی زبانی سب کا غائبانہ تعارف تو ہو ہی چکا تھا۔ نشاء اسے بھی بہت پسند آئی منور بھائی کی اکلوتی بیٹی تھی گوری چٹی نازک سی نشاء کو دیکھ کر جیانے صبح سے کہا۔

”تم نے نشاء کا تعارف صحیح کر لیا تھا مگر خاصی کجوسی سے کام لیا تھا۔“

”پھپھو! فرار خدا نہ تعریف، سب کے سامنے کر کے میں نے اپنا مستقبل، تو تاریک نہیں کرانا۔“ وہ آہستگی سے بولا تو نشاء کے صبح چہرہ پر حیا کی سرخی پھیل گئی صبح نے بہت چاہ سے اسے دیکھا تھا۔

”بچے آنکھیں سب کچھ عیاں کر دیتی ہیں سب کے سامنے اپنی آنکھوں کو بھٹکنے سے بچایا کرو۔“ جیانے مسکراتے ہوئے شوخی سے کہا تو وہ شوخی سے ہنس پڑا۔

”ہماری پھپھو تو بہت گریس فل ہیں چھوٹی سی پیاری سی ہے ناگی۔“ نشاء نے نگین کو مخاطب کر کے کہا تو وہ بھی جیا کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہاں یہ تو ہے بہت خوبصورت ہیں پھپھو۔“

”میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ اشعر نے شرارت سے پوچھا۔

”بہت ہی برا خیال ہے۔“ نگین نے شپٹا کر سپاٹ لہجے میں کہا تو ان تینوں کو ہنسی آگئی پھر اشعر اسے تنگ کرنے کی غرض سے سنجیدگی سے بولا۔

”اچھا..... یہ بات ہے تو میں امی تک تمہارا یہ خیال پہنچا دوں گا تا کہ جو ان کا تمہارے اور میرے بارے میں خیال ہے وہ ان کے دل و دماغ سے نکل جائے۔“

”فی الحال تو تم یہاں سے نکل جاؤ ہر وقت سر پر نازل رہتے ہو۔“

”عذاب کی طرح۔“ صبح نے ٹکڑا لگایا تو اشعر کا موڈ آف ہو گیا۔

”میں پھپھو کا خیال کر رہا ہوں ورنہ اس محفل سے واک آؤٹ کر جاتا۔“ اشعر نے روٹھے

ہوئے لہجے میں کہا۔

”شکر ہے تمہیں کسی کا خیال تو ہے۔“ نکلیں نے پھر شرارت سے کہا۔

”اوہو..... بھی کیا ہو گیا ہے آپ لوگ تو بچوں کی طرح جھگڑنے اور روٹھنے لگے۔“ جیانے

مسکراتے ہوئے کہا تو وہ سب ایک سینڈ کو خاموش ہو گئے اور پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر کھکھلا کر ہنس پڑے رات کا تیسرا پہر تھا جب جیا کی آنکھ کھل گئی بھوک اور پیاس دونوں ہی لگ رہی تھیں سب کے سامنے کچھ تکلف کے مارے اور کچھ سفر کی تھکن کے مارے اس نے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا تھا مگر اب بہت بھوک لگ رہی تھی نکلیں اس کے ساتھ باتیں کرتے کرتے اس کے پاس ہی بیڈ پر سو گئی تھی۔

”نکلیں کو جگاؤں مجھے تو کچن کا راستہ بھی نہیں معلوم مگر یہ تو گھنٹہ پہلے ہی سوئی ہے ناحق اس کی نیند خراب کروں گی تو کیا کروں میرے سوٹ کیس میں بسکٹ کا ڈبہ ہو گا۔“ اس نے سر سے پاؤں تک چادر تان کر سوئی ہوئی نکلیں کے ڈھکے ہوئے سراپے کو دیکھتے ہوئے سوچا اور اٹھ کر اپنا سوٹ کیس آہستگی سے بغیر آواز کئے کھول لیا بسکٹ کا ڈبہ فوراً نظر آ گیا اس نے اٹھا کر دیکھا ڈبہ خالی تھا وہ صبح ناشتہ کئے بغیر گھر سے نکلی تھی اور راستے میں جوس اور بسکٹ کھا کر پیٹ بھر لیا تھا اب پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے وہ..... میز پر رکھے پانی بھرے گلاس سے تین چار گھونٹ پانی پی کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

”شاید کوئی ملازمہ جاگ رہی ہو اس طرح پہلی رات ہی مہمان بن کر آنے والی لڑکی کھانے کی تلاش میں سرگرداں بھلا اچھی لگتی ہے انتہائی فضول حرکت ہے یہ تو۔“ اس کے دماغ نے اسے لتاڑا۔

”تو کیا بھوک کا لگنا فضول حرکت ہے۔“ وہ چلتے چلتے کمرے کی قطار کے آخری سرے پر پہنچ گئی ادھر سے گیلری دائیں جانب جا رہی تھی وہاں کیا تھا وہ نہیں جانتی تھی لہذا موسم کی خنکی پھول پودوں کی مٹی کی بھینی بھینی مہک سانسوں میں اتارنے کے لئے گیلری کے احاطے میں لگی جالی نما گرل کے قریب کھڑی ہو گئی بارش تھم چکی تھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوانے اس کی سانسوں میں تازگی بھر دی اچانک کتوں کے بھونکنے اور جھگڑنے کی خطرناک آواز آئی تو وہ بری طرح ڈر کر الٹے قدموں واپس بھاگی اور کمرے میں آ کر ہی دم لیا۔

”تکین! ابھی تک سو رہی ہو کتنی خوفناک آوازیں آرہی ہیں باہر تمہیں ڈر نہیں لگ رہا۔“ وہ

بیڈ پر اس کے قریب بیٹھ کر بولی۔

”جی نہیں کیونکہ ہم ان آوازوں کے عادی ہیں لوری کا کام دیتی ہیں یہ آوازیں“ تکین کے بجائے چادر میں سے علی کی آواز آئی تو وہ مزید خوفزدہ ہو گئی چیخ نکلتے نکلتے حلق میں اٹک گئی کیونکہ علی کا ہاتھ اس کے منہ پر آ کر ٹھہر گیا تھا وہ چادر اتار کر اٹھ بیٹھا تھا۔ جیا کی آنکھیں حیرت سے بھٹی رہ گئیں۔

”چیخ کراپنے ساتھ ساتھ میرا بھی کبازا کرائیں گی آپ لگتا ہے کہ چیخنے میں پی ایچ ڈی کی ہے آپ نے۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”آپ یہاں کیسے آ گئے یہ تو..... میرا کمرہ ہے؟“ وہ اس کا ہاتھ ہٹا کر بیڈ سے پھرتی سے نیچے اترتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولی تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی نہیں یہ میرا کمرہ ہے۔“

”آپ جھوٹ بول رہے ہیں میں نے دیکھا تھا یہ کمرہ نمبر چار ہے مجھے کمرہ نمبر چار ہی میں ٹھہرایا گیا تھا۔“ اس نے غصے سے تپ کر کہا۔

”یہ کمرہ نمبر چار ہی ہے آپ کو بھی چوتھا کمرہ الاٹ ہوا ہے لیکن بائیں جانب سے چوتھا کمرہ آپ کا ہے اور دائیں جانب سے چوتھا کمرہ میرا ہے اس رو میں آٹھ بیڈرومز ہیں آپ غلطی سے میرے کمرے میں بھاگ آئی ہیں براہِ والا کمرہ آپ کا ہے“ اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”آئی ایم سوری۔“ وہ خجل ہو کر بولی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”سینے۔“ اس نے آہستہ سے پکارا۔

”جی۔“ اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔

”اگر آپ چاہیں تو میں آپ کا اس کمرے میں مستقل قیام کا بندوبست کروا سکتا ہوں“ علی کی بات معنی خیز اور لہجہ شیر تھا وہ شپٹا گئی اس کے جملے کی گہرائی نے اسے تپا دیا۔

”شکریہ مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے میں چند دن بعد واپس چلی جاؤں گی۔“ اس نے

سپاٹ لہجے میں کہا۔

”ہم جانے دیں گے تب ناں۔“ وہ شوخی سے بولا تو اس نے غصے سے اسے گھورا اور اپنے

کمرے میں آگئی۔

”بدتمیز نہ ہو تو کیسی فضول باتیں کرتا ہے یہ شخص۔“ جیانے علی کو دل ہی دل میں کو سا پھر ذرا دیر کو اس کی آنکھ لگی اور جب آنکھ کھلی تو نگین غائب تھی اس نے اٹھ کر ٹائم دیکھا صبح کے ساڑھے سات بج رہے تھے وہ بستر سے نکل آئی اور وضو کر کے فجر کی قضا نماز ادا کرنے کے بعد باہر آگئی لان کی چار دیواری دھل کرنی نکور ہو گئی تھی پھول پودے سبزہ تر و تازہ ہو گیا تھا ٹھنڈی ہوا میں پھول پتے خوشی سے رقص کر رہے تھے لان پانی سے بھرا تھا بارش اتنی شدید تھی کہ باہر سڑکوں پر بھی پانی کھڑا ہو گیا تھا وہ لان کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتی گلاب کا پھول توڑنے کی غرض سے لان میں داخل ہوئی تو اس کا پاؤں بری طرح پھسل گیا مگر اس سے پہلے کہ وہ لان میں منہ کے بل جا گرتی علی کے مضبوط بازوؤں نے اسے تھام لیا اور باقاعدہ اسے شانوں سے پکڑ کر اٹھا کر لان کے ساتھ بنی سینٹ کی پکی روش پر کھڑا کر دیا وہ اس اچانک افتاد پر چیخ کر رہ گئی۔

”پھلنے کا بہت شوق ہے آپ کو تو مجھ پر پھسل جائیں سنبھالنے کا فن میں جانتا ہوں۔“ علی نے خفت اور خجالت سے سرخ چہرے سے گھورتی جیا کو دیکھتے ہوئے شوخ اور معنی خیز لہجے میں کہا۔

”شرم نہیں آتی آپ کو؟“ وہ اس کے ہاتھوں کی حرارت سے سلگ کر بولی۔

”ہنکی میں کیسی شرم اور وہ محاورہ تو آپ نے یقیناً سنا ہو گا کہ جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم اب اگر آپ لان میں گھاس اور کیچڑ سے غسل فرمالیتیں تو مجھے ضرور شرم آتی آخر کو آپ ہماری مہمان ہیں اور مہمان کی تو واضح تو اچھے طریقے سے کرنی چاہیے نا۔“

”اف..... کس قدر بولتے ہیں آپ لوگ۔“ وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”آپ بھی بولا کیجئے اس سے اندر کی گھٹن کم ہو جاتی ہے دل پر کوئی بوجھ نہیں رہتا انسان ہلکا پھلکا اور فریش رہتا ہے آپ بھی کچھ اپنی کہیں کچھ ہماری سنیں۔“ علی نے اس کے چہرے کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ چڑھ کر بولی۔

”سوری میرے پاس فالٹو دماغ نہیں ہے کہ آپ کی سنوں۔“

”یہ بھی بہت بڑی بات ہے کہ آپ کے پاس دماغ ہے تو سہی۔“

”جسٹ شٹ اپ۔“ اس کورات کا اور اب کا غصہ ایک ساتھ ہی آگیا۔ غصے سے کہہ کر وہ

آگے بڑھ گئی وہ ہنستا ہوا اس کے برابر آ کر چلنے لگا۔

”ایک بات تو بتائیے رات آپ کیا چرانے کے لئے کمرے سے باہر نکلیں تھیں؟“ اس نے اس کے چہرے کو چومتی بالوں کی لٹ کو دیکھتے ہوئے شرارت سے پوچھا تو وہ رک کر چیخ کر بولی۔
 ”واٹ..... چرانے سے کیا مطلب ہے آپ کا میں آپ کو چور دھتی ہوں؟“

”اس میں کیا شک ہے رات آپ نے واردات ہی ایسی کی ہے۔“ وہ مزید قریب ہوا۔
 ”آپ کا مطلب ہے کہ میں نے رات چوری کی ہے؟“ وہ تپ کر بولی۔

”چوری تو معمولی سا لفظ ہے آپ نے تو ڈاکہ ڈالا ہے۔“ وہ شرارت سے مسکراتے ہوئے اس کے دلکش چہرے کو دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا۔

”کیا چرایا ہے میں نے کس چیز پر ڈاکہ ڈالا ہے بتائیے ذرا؟“

”تو آپ چوری شدہ مال واپس کر دیں گی؟“ وہ ہنسا۔

”اگر آپ کا ہوا تو ضرور واپس کر دوں گی۔“ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”لیکن میں ایسا نہیں چاہوں گا جو کچھ آپ نے میرا لیا ہے۔ وہ آپ کے پاس رہے گا۔ تو

سکون رہے گا۔“ اس نے سنجیدہ اور معنی خیز لہجے میں کہا۔

”سکون تو میرا بڑا کر دیا ہے آپ نے۔“ وہ الجھن آمیز لہجے میں بولی۔

”کیا واقعی؟“ وہ جانے کس خیال کے تحت خوشی اور شوخی سے بولا۔ جیانیہ دیکھا اس کی

آنکھیں کوئی اور ہی کہانی سنار ہی تھیں جو رنگ اور چمک اس کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر ابھری تھی

اس نے اسے حیران ہی نہیں پریشان بھی کر دیا۔

”کیا سوچنے لگیں؟“ علی نے اسے اپنی طرف اس قدر انہماک سے دیکھتے ہوئے پوچھا تو

وہ چونک کر نظریں چرا گئی اور آہستہ سے بولی۔

”کچھ نہیں۔“

”جو لوگ نظریں چرا لیتے ہیں ان کے دل میں چور ہوتا ہے۔“

”چوروں سے کوئی خاص لگاؤ ہے آپ کو؟“ وہ اس کی بات پر سنجیدگی سے بولی۔

”پہلے تو نہیں تھا اب ہو گیا ہے۔“ وہ معنی خیز اور شریر لہجے میں بولا۔ جیانیہ ہنسی۔

”آپ خود ہوں گے چور۔“ وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ کر غصے سے بولی۔

”ہائے کاش..... آپ سچ سچ اس اعزاز سے نوازیں۔“ وہ شرارت سے بولا۔

”یہ اعزاز ہر ایرے غیرے کو نہیں ملا کرتے۔“ اس نے طنز سے کہا۔

”میں ایرا غیرا ہوں ارے میں تو آپ کا.....“

”بھتیجا ہوں ہے ناں۔“ اس نے فوراً اس کی بات کاٹ کر یاد دلایا۔

”جی نہیں آپ کہیں سے بھی میری پھپھو نہیں لگتیں۔“ وہ فوراً بولا۔

”میرے بھتیجے تو تم بھی کہیں سے نہیں لگتے مگر ہو مجبوری ہے ماننا اور کہنا پڑے گا اور بہت

آپ جناب ہو گئی اب میں تمہیں تم کہہ کر مخاطب کروں گی کیونکہ میرا رشتہ تم سے بڑا ہے سمجھے مسٹر

بھتیجے۔“ اس نے سنجیدگی سے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ خفگی سے بولا۔

”ارے واہ..... آپ تو ذرا سی دیر میں لائن کر اس کر گئیں۔“

”میں لائن کر اس کر گئی ہوں یا تم ہٹوئی سے اتر رہے تھے۔“ جیانے اپنا بایاں ہاتھ اپنی کمر پر

رکھ کر باقاعدہ ڈانٹنے والے انداز میں کہا تو وہ بچوں کی طرح نچل اور خفا ہو کر رخ پھیر گیا جیانے

بمشکل اپنی مسکان دہائی۔

”پھپھو بھائی جان آج ایسے ناشتہ لگ گیا ہے۔“ نگین کی آواز پر وہ دونوں خاموشی سے اندر

ڈرائنگ ہال میں چلے آئے جہاں حویلی کے سب افراد موجود تھے جن میں منور بھائی کی بیوی

شاہینہ اور احمر بھائی کی بیوی منزہ بھی موجود تھیں راؤ مظفر علی خان کی بیگم سب کی دادی جان اور جیا

کی ممانی جان قدسیہ بیگم بھی موجود تھیں سلام دعا کے بعد ناشتہ شروع ہوا، رات کے موسم کا احوال

سب بتا رہے تھے۔

”کیوں بھئی بر خوردار! نیند کیوں نہیں آئی جزیر چل رہا تھا۔ گرمی بھی نہیں تھی جو نیند نہ آ

سکتی۔“ مظفر صاحب نے پوچھا۔

”دادا جان! ایسے موسم میں جانے کیسے کیسے مجھ اپنے مورچوں سے باہر نکل آتے ہیں

رات تو ایک موٹا اور کالا سا مجھ پر لوری سنانے پر بضد تھا میں بھی اڑ گیا کہ مجھ میاں تم ضدی

ہو تو ہم بھی کم ضدی نہیں وہ انتہائی بے سری آواز میں گانے کی کوشش کر رہا تھا اور میں انتہائی سب

بسی کے عالم میں اسے بھگانے کی کوشش کرتا رہا“ مسج نے اس انداز سے کہا کہ سب کو ہنسی آ گئی۔

”تو کامیاب کون ہوا؟“ قدسیہ بیگم نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”مجھ پر یا تم؟“

”نہ میں نہ چھر صبح کامیابی سے چلی آئی۔“ اس نے معصومیت سے کہا تو سب ہنسنے لگے۔
 ”یار نیند تو مجھے بھی نہیں آئی میرے کمرے میں اچانک ایک بلا داخل ہو گئی تھی۔“ علی نے
 کن اکھیوں سے جیا کی طرف دیکھتے ہوئے بتایا تو اسے شدید غصہ آیا اس پر۔
 ”بلا۔“ سب نے حیران ہو کر کہا۔
 ”ہاں بلا۔“ علی نے چائے کاسپ لے کر کہا۔
 ”کیسی تھی بلا؟“

”بہت خوبصورت تھی۔“ علی نے جیا کے چہرے کو دیکھ کر کہا وہ ندوس ہو رہی تھی۔
 ”ہائیں..... بلا خوبصورت کیسے ہو سکتی ہے؟“ اشعر نے حیرت سے کہا۔
 ”مائی ڈیر کزن! اگر دیکھنے والی آنکھ خوبصورت ہو تو بلا بھی خوبصورت ہو سکتی ہے۔“ علی
 نے مسکراتے ہوئے جواز پیش کیا۔

”چچی جان! ملاحظہ کیجئے آپ کے برخوردار بلا میں خوبصورتی تلاش کر رہے ہیں ان کی
 آنکھیں چمک کر آئیں۔“ اشعر نے مزہ سے کہا۔
 ”میری آنکھوں کی فکر چھوڑ اپنے ناشتے کی فکر کرو۔“ علی نے اسے گھورا۔
 ”ان لوگوں کا مذاق کسی وقت ختم نہیں ہو سکتا۔“ شاہینہ نے کہا۔

میرا ایلٹ ختم ہو گیا ہے سب نے کہا تو سب کی ہنسی کمرے کی فضاء کو مزید خوشگوار بنا گئی۔
 راؤ انور علی خان کا تعلق زمیندار گھرانے سے تھا مگر وہ پڑھے لکھے زمیندار تھے ان کی جائیداد
 شہر اور گاؤں دونوں مقامات پر تھی شادی خاندان میں ماموں زاد بہن فاطمہ سے ہوئی شادی کے
 پہلے سال اللہ تعالیٰ نے انہیں چاند سا بیٹا عطا فرمایا ان کی جائیداد کا وارث ان کا نور نظر ان کے
 خاندان کا نام آگے بڑھانے والا آگیا تھا وہ بہت زیادہ خوش ہوئے تھے بیٹے کی ولادت پر اور اس
 خوشی میں انہوں نے پورے گاؤں میں کھانا تقسیم کیا تھا غریبوں کی مدد کی تھی خدا کی نعمت یعنی بیٹی کی
 دعا مانگا کرتے فاطمہ بیگم کو بھی بیٹی کی بہت چاہ تھی مگر بیٹے جس کا انہوں نے نام راؤ مظفر علی خان
 رکھا تھا کی ولادت کے بیس سال تک ان کے آگن میں مزید کوئی پھول نہ کھلا انہوں نے رب کی
 رضا میں راضی ہو کر مظفر علی کی شادی کر دی۔ اور جب مظفر علی اور قدسیہ بیگم کے پہلے بچے کی
 ولادت کی خبر آئی تو ساتھ ہی فاطمہ بیگم کو بھی اس خبر نے حیران کر دیا کہ وہ اکیس برس بعد

پھر سے امید سے ہیں انور صاحب کو یہ خبر سناتے ہوئے انہیں بڑی شرم آئی انور صاحب بہت حیران بھی ہوئے اور خوش بھی مگر فاطمہ بیگم اس حالت میں بہو بیٹے کے سامنے آنے میں بہت شرم محسوس کرتی تھیں کبھی کبھی خدا سے شکوہ کر بیٹھتیں کہ بھلا اب اس اہتمام کی کیا ضرورت تھی اب جبکہ وہ خود دادی بننے والی تھیں مگر انور صاحب انہیں سمجھایا کرتے کہ۔

”اللہ کے بھید اس کی مصلحتیں وہی جانتا ہے کفران نعمت نہیں کرنا چاہیئے بلکہ رب سے خیر کی دعا مانگتی چاہیئے۔“ اور قدسیہ بیگم سے پہلے فاطمہ بیگم ایک پیاری سی بیٹی کی ماں بن گئیں ان دنوں وہ بہو بیٹے سے چھپتی پھرتی تھیں لہذا میکے میں تھیں بیٹی کی پیدائش پر انور صاحب اور فاطمہ بیگم خوش جمی بہت تھے انور صاحب نے تو بیٹی کو پہلی بار گود میں اٹھاتے ہوئے فاطمہ بیگم سے کہا تھا۔

☆☆☆

”فاطمہ بیگم! اللہ تعالیٰ نے ہماری بیٹی کے والدین بننے کی خواہش دیر سے ضرور پوری کی ہے۔ مگر پوری کردی ہے ہمیں اپنی رحمت سے نوازا ہے ہمیں اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔“ اور شکر تو فاطمہ بیگم دن رات ادا کیا کرتیں بیٹی کا نام انہوں نے عطیہ تجویز کیا پیار سے سب انہیں نور فاطمہ کہنے لگے۔ عطیہ کی پیدائش کے چھ ماہ بعد مظفر صاحب کے ہاں بیٹے کی پیدائش ہوئی جس کا نام ”منور۔“ رکھا گیا عطیہ اور منور چونکہ ہم عمر تھے لہذا ان کی آپس میں بہت دوستی ہو گئی تھی مظفر صاحب اور قدسیہ بیگم کے ہاں ”منور۔“ کے بعد احمر پیدا ہوئے اور جب وہ شادی کی عمروں کو پہنچے تو عطیہ اور منور کی شادیاں ایک ساتھ کی گئیں عطیہ کی شادی فاطمہ بیگم کے بھانجے احمد حسن سے ہوئی اور منور کی شادی مظفر صاحب کے دور پرے کے رشتے داروں میں ہوئی اور اس کے بعد احمر کی شادی ان کی کزن منزہ سے ہو گئی عطیہ اور شاہینہ کے ہاں ایک ہی دن بیٹے پیدا ہوئے عطیہ کے بیٹے کا نام ”محسن علی۔“ اور منور و شاہینہ کے بیٹے کا نام ”محمد علی۔“ رکھا گیا اس کے بعد منور و شاہینہ کے ہاں اشعر اور نشاء کی ولادت ہوئی احمر اور منزہ کے ہاں پہلی اولاد بیٹی پیدا ہوئی تھی جس کا نام انہوں نے نورین رکھا تھا نورین کے پانچ سال بعد ”علی احمر“ اس کے بعد ”سمیع احمر“ اور اس کے بعد ”نکین احمر“ دنیا میں تشریف لائے عطیہ اور احمد حسن کے ہاں ”محسن علی“ کی پیدائش کے تقریباً چھ سال ”جیا“ پیدا ہوئی۔

☆☆☆

جیلاں میں چیئر پر بیٹھی اخبار کا مطالعہ کر رہی تھی۔ سمیع علی نگین اور نورین آپنی کے بچے ٹین اور حسنین بھی لان میں اچھل کود میں مصروف تھے ٹین اور حسنین تین اور چار سال کے تھے دونوں بہت شرارتی تھی علی کی گود میں بیٹھ کر اب اس سے تصویر اتارنے کا کہہ رہے تھے اور جیانے دیکھا وہ پہلی ملاقات والا ”علی احمد“ اس وقت ایک چھوٹا سا بچہ لگ رہا تھا بچوں کے ساتھ بچہ بن گیا تھا۔

”ماموں جان! تصویر کھینچیں ناں ہماری۔“ حسنین نے علی سے کہا۔

”تصویر کہاں تمہارے کان نہ کھینچوں میں۔“ علی نے مذاق سے کہا۔

”ہائے۔“ ٹین اور حسنین نے ایکدم سے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا تو جیا سمیت ان تینوں کو بھی ہنسی آ گئی۔

”بھائی جان! بچوں کی تصویر اپنے ہمراہ کھنچو ابی لیں یادگار موقع ہے۔“ سمیع نے شرارت سے گھاس پر پھسکر امار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”یادگار موقع..... کیا مطلب؟“ علی نے نہ سمجھتے ہوئے اسے دیکھا۔

”مطلب یہ کہ مبارک ہو آپ کی گود بچوں سے بھر گئی ہے۔“ وہ شرارت سے بولا۔

”بھیا! تمہیں بھی مبارک ہو لو تمہاری گود بھی ہری ہو گئی ہے۔“ علی نے یہ کہتے ہوئے بچوں کو اتارا اور لان میں کئی ہوئی ہری ہری گھاس کے ڈھیر میں سے گھاس اٹھائی۔ اور اس کی گود میں ڈال کر بولا تو اس کا قہقہہ بڑا جاندار تھا جیانے اپنی ہنسی اخبار کے پیچھے چھپائی اور نگین تو بے ساختہ ہنس پڑی اور پھر بولی۔

”تو یہ تو بہ کتنا مذاق کرتے ہیں آپ دونوں میں امی سے آچھلنے کی شکایت لگاؤں گی۔“

”میں تمہارے ایک چپٹ لگاؤں گا، خبردار جو شکایت کا دھڑکھولا۔“ سمیع نے اسے دھمکی دیتے ہوئے کہا تو وہ اسے گھورتے ہوئے جیا سے کہنے لگی۔

”اچھا دھمکی..... پھپھوس رہی ہیں سمیع بھائی کی باتیں۔“

”ہاں سن رہی ہوں اور سوچ رہی ہوں کہ تم لوگ تو بہت جلدی ہو میں پہلے یہاں کیوں نہیں

آئی؟“ جیانے اخبار کے پیچھے سے چہرہ نکال کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”پھلیئے! اب آگئیں ہیں تو واپس مت جائیے گا۔“ علی نے معنی خیز لہجے میں کہا تو وہ اخبار

کی تہہ لگاتے ہوئے بولی۔

”واپس تو مجھے جانا ہے رزلٹ کا انتظار ہے۔“

”جی جی! آپ نے بتایا نہیں تھا کہ آپ اس رات کمرے سے باہر کیوں نکلیں تھیں۔“ علی نے شرارت اور شوق سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو جانے کس خیال سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا نگاہیں جھک گئیں۔

”مجھے بھوک لگ رہی تھی اور میں کھانے کی تلاش میں کچن میں جانے کے لئے باہر نکلی تھی سمجھے تم۔“ وہ نظریں جھکائے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولی۔

”آپ سمجھائیں اور میں نہ سمجھوں ایسے بھی حالات نہیں خیر اب بتائیے اس وقت آپ کیا کھانا پسند کریں گی؟“ وہ اس کے سامنے لان چیئر پر بیٹھتے ہوئے پوچھ رہا تھا ہونٹ اس کے چہرے کے تاثرات پر مسکرا رہے تھے۔

”اس وقت میں صرف تازہ ہوا کھانا پسند کروں گی۔“ جیانیے جواب دیا تو وہ ہنس پڑا، اور پھر بولا۔

”وہ تو آپ کھا ہی رہی ہیں۔“

”جی پھپھو! امی نے پوچھا ہے کہ آپ کیا کھائیں گی دوپہر کو؟“ نشاء بھی چلی آئی تھی علی کی بات سن کر پوچھا تو اس سے پہلے علی نے کہا۔

”پلیز مرغ مسلم کی فرمائش کر دیجیے آپ کے بہانے ہمیں بھی کھانے کو مل جائے گا۔“

”کیا مطلب؟“ جیانیے حیران ہو کر پوچھا۔

”مطلب یہ ہے پھپھو جانی کہ مدت ہوئی ہے مرغ کو مہمان کیے ہوئے۔“ سمیع نے اپنے

پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بڑے دردناک انداز میں یہ شعر پڑھا۔

”میں اب بھی تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکی۔“ جیانیے ہنس کر کہا۔

”میرا مطلب تو سمجھ سکتی ہیں ناں۔“ علی نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے معنی خیز

لہجے میں کہا مگر وہ سادگی سے اس کے جملے کی گہرائی کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

”مطلبی بھیجے کام کی بات کرو یہ مرغی کا کیا معاملہ ہے؟“

”پھپھو! مرغی کا مزہ ذائقہ تک بھول چکی ہے۔ ہماری زبان سبزیاں اور دالیں کھا کھا کر

ہمارے پیٹ میں سبزیوں کے کھیت اُگ گئے ہیں دادا جان مرغ پکانے کے حق میں نہیں ہیں۔“

اشعر بھی آن دھمکا اور اپنی داستان غم سنانے لگا۔

”تو کیا مرغی بالکل نہیں پکتی گھر میں؟“ جیانے حیرانگی سے پوچھا۔

”پکتی ہے اگر ہمارے نصیب جاگ جائیں۔“ اشعر نے کہا۔

”بشرطیکہ پولٹری فارغ کا مرغ بیمار ہو یا گھر کا کوئی فرد بیمار ہو یا کسی مہمان کی آمد حویلی کے

لئے باعث افتخار ہو۔“ سمیع نے مسکراتے ہوئے کہا تو اسے ہنسی آگئی۔

”مرغی نہ پکانے کا سبب کیا ہے؟“ جیانے پوچھا۔

”مرغیوں سے ہمدردی سبزیوں سے بے دردی دالوں سے دشمنی۔“ سمیع نے فٹ سے

جواب دیا وہ ہنستی چلی گئی۔

”دادا جان کا خیال ہے کہ اگر ہم خود ہی اپنے کھیتوں کی سبزیاں اور دالیں نہیں کھائیں گے تو

دوسرے بھی نہیں کھائیں گے فصل میں برکت نہیں ہوگی۔“ سمیع نے دادا جان کے خیالات اس

کے گوش گزار کیے۔

”خیال تو درست ہے ان کا۔“ جیانے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہیں..... یعنی مرغ پھر بیچ گیا ہمارے ہاتھوں۔“ سمیع نے افسوس کا اظہار کیا۔

”پھپھو! آپ کے اور دادا جان کے خیالات میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے تھا۔“ اشعر نے بھی

تاسف زدہ لہجے میں کہا۔

”سچ پھپھو! میں تو خواب میں مرغ روٹھتے اور کھاتے دیکھتی ہوں۔“ نگین نے

معصومیت سے کہا سب کی ہنسی چھوٹ گئی اور اشعر نے نگین کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے

میں کہا۔

”یعنی میری حیثیت ایک مرغ کے برابر بھی نہیں ہے تمہاری نظر میں۔“

”ظاہر ہے اب میں تمہیں روٹھ کر کے تو کھانے سے رہی۔“ نگین نے پٹ سے جواب

دیا سب کی ہنسی حویلی کے لان میں بکھر گئی۔

”بہت ہی ندیدی ہو ہر وقت کھانے کے خواب دیکھتی ہو۔“ اشعر نے اسے گھورتے ہوئے

کہا۔

”تم نے اگر اس کے خوابوں میں جگہ بنائی ہے تو مرغ مسلم کا روپ دھار لو“ جیانے شرارت

سے کہا تو سب ہنس پڑے اور وہ سر کھانے لگا۔

”مجھے کون سارو پ دھارنا ہوگا آپ کے خوابوں میں جگہ بنانے کے لئے۔“ علی جو بڑی دیر سے خاموش تھا نے موقع ملتے ہی جیا کے قریب آ کر سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا۔

”میں خواب نہیں دیکھتی اس لئے آپ کو ایسی کوئی کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ جیا نے آہستہ سے مدھم آواز میں جواب دیا تو وہ سرد آہ بھر کر رہ گیا۔

”تو پھر کیا پکائیں پھپھو؟“ نشاء نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مرغ مسلم۔“ جیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہے آہ..... ہرے پھپھو زندہ باد۔“ سب نے خوش ہو کر نعرہ لگایا وہ ہنس پڑی۔

”صاحب! دولڑکیاں آئی ہیں۔“ ملازم نے آ کر اطلاع دی سمجھ جولان میں گوڈی کر رہا

تھا چمک کر بولا۔

”مجھ سے ملنے۔“

”نہیں صاحب! وہ تو بیگم صاحبہ سے ملنا چاہتی ہیں۔“

”تو میں تمہیں بیگم صاحبہ نظر آ رہا ہوں جو مجھے بتانے چلے آئے۔“

”ہم دیکھتے ہیں آؤ نشاء۔“ نگین نے ہنس کر نشاء کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی ساتھ گھسیٹ لیا۔

”ذرا دھیان سے جاؤ کہیں پولیو کے قطرے پلانے والی ٹیم نہ ہو اور تمہارے منہ میں پولیو

کے قطرے ٹپک کر چلتی بنے انہیں بتا دینا کہ تم پانچ سال سے زائد عمر کی دوشیزائیں ہو۔“ سمجھ نے مذاق سے کہا جیا کو ہنسی آ گئی۔

”بھیا! آپ تو ہر وقت مذاق کرتے ہیں آؤ نشاء!“

”سمجھ! تمہیں می بلار ہی ہیں۔“ علی نے آ کر اسے کہا۔

”یقیناً کوئی چیز فرنگ سے غائب ہو گئی ہوگی اور نام مجھ غریب کا لگ جائے گا اور میرا منہ سونگھ

سونگھ کر مال مسروقہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے گی۔“ سمجھ نے پائپ کے پانی سے ہاتھ منہ

دھوتے ہوئے کہا جیا ہنسنے لگی وہ باتیں ہی ایسی اور مزاحیہ لہجے انداز میں کرتا تھا کہ سننے والے کو اپنی

ہنسی کنٹرول کرنا محال ہو جاتا تھا۔

”تمہاری حرکتیں ہی ایسی مہلک ہیں کچھ عقل سے بھی کام لے لیا کرو۔“ علی نے ہنس کر کہا

تو وہ فوراً اثرٹ جھاڑتے ہوئے بولا۔

”عقل سے بھی کام لے لیا تو باقی کیا بچے گا میرے پاس؟“

”حماقتوں کا ریکارڈ۔“ علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ریکارڈ سے یاد آیا بھائی جان! کوئی اچھا سا ریکارڈ تو لگائیں۔“ سمیع نے کہا۔

”کس کا تمہارا؟“ علی نے شرارت سے کہا جیانس دی۔

”آ کر بتاؤں گا پہلے میں اپنی امی حضور کے پاس اپنی لائن کلیئر کر آؤں۔“ وہ یہ کہہ کر اندر

چلا گیا۔

”بہت جلدی ہے سمیع۔“ جیانس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“ علی نے دلچسپی سے پوچھا۔

”تم یہ جان کر کیا کرو گے؟“

”خوشی سے گیت گاؤں گا۔“

”تو گاؤ۔“ وہ ہنسی اور کندھے اچکا کر بولی اور وہ گانے لگا۔

”تم سنگ نیناں لاگے مانے نا ہی جیارا جیا جیا بولے جیا من کا پی مارا۔“

اس نے پیپا کی جگہ جان بوجھ کر جیا کا نام لگا دیا تھا جیا کو سخت الجھن ہونے لگی تھی کیونکہ وہ

گاتے ہوئے اسے محبت پاش نظروں سے اور وارنٹی سے دیکھ رہا تھا۔

”اسٹاپ اٹ پلیز۔“ وہ غصے سے بولی۔

”یہ گانا پسند نہیں آیا تو دوسرا سنا دیتا ہوں۔“ وہ اس کا غصہ نظر انداز کیے بغیر مسکراتے ہوئے

بولا اور گنگنا نے لگا۔

”مورا جیانہ لگے بن تیرے یار

مورا جیانہ لگے بن تیرے یار“

”علی! بند کرو گانا۔“ جیانس نے غصیلے لہجے میں کہا وہ چن کر وہ گیت گارہا تھا جس میں اس کا نام

آتا تھا اسی لئے وہ شپٹارہی تھی۔

”بس ایک گانا اور سن لیں۔“ وہ بھی پورا ڈھیٹ تھا پھر سے شروع ہو گیا۔

”جیا بن جیانہ جائے جیا بن رہا نہ جائے

جیا جیون ہے میرا یہ اس کو کون بتائے۔“

”کیسا ہے فی البدیہہ آمد ہوئی ہے اس گیت کی۔“ وہ گانے کے بعد اب بہت مزے سے پوچھ رہا تھا۔

”علی! یہ محض گیت ہے یا اس میں حقیقت بھی شامل ہے صاف صاف بات کرو۔“ جیا نے سنجیدہ اور سٹاٹ لہجے میں کہا۔

”تاکہ آپ مجھے صاف صاف جواب دے دیں۔“ علی بھی سنجیدہ ہو کر بولا۔

”یہ تمہاری بات پر منحصر ہے۔“

”تو سنئے جیا! یہ محض گیت نہیں ہیں ان میں حقیقت بھی شامل ہے۔“ علی نے سنجیدگی سے کہا تو وہ بولی۔

”تو سنو علی! اس حقیقت کو محض گیت سمجھو کیونکہ جو تم چاہتے ہو وہ ہو نہیں سکتا۔“

”کیوں نہیں ہو سکتا آپ میری سگی پھپھو تو نہیں ہیں پھر کیوں نہیں ہو سکتا؟“ وہ بے تاب و بے چین ہو کر پوچھ رہا تھا۔

”کیونکہ میں ایک طلاق یافتہ لڑکی ہوں۔“ جیا نے یہ انکشاف کر کے اس پر حیرتوں کے پہاڑ توڑ دیئے۔

”کیا؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ وہ بمشکل حیرت اور بے یقینی سے تکتے ہوئے بولا۔

”وہی جو تم نے سنا۔“ وہ اٹھ کر کیاری کے قریب چلنے لگی۔

”لیکن آپ تو بہت چھوٹی ہیں شادی شدہ یا..... نہیں آپ مذاق کر رہی ہیں“ وہ بے قراری سے اٹھ کر اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

”مسٹر علی! میں اپنے ساتھ ایسا سنگین مذاق نہیں کر سکتی بلکہ میری تو تقدیر نے یہ مذاق کیا ہے۔“ وہ تنخی سے بولی۔

”آپ کی شادی کس سے ہوئی تھی مجھے تو علم نہیں تھا طلاق کیوں ہوئی؟“

”میرا نکاح ابو کے دوست کے بیٹے سے ہوا تھا تم امریکہ میں تھے شاید اس لیے تمہیں علم نہیں ہو سکا طلاق کیوں ہوئی یہ جان کر تم کیا کرو گے؟ تمہاری خواہش کے پوری نہ ہونے کے لیے یہ وجہ ہی بہت بڑی اور اہم ہے کہ میں طلاق یافتہ ہوں اور پلیز دوبارہ مجھ سے اس موضوع پر

بات مت کرنا، جیا نے سنجیدہ اور تلخ لہجے میں کہا اور اندر چلی گئی علی نے بے چینی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے اسے اندر جاتے دیکھا تھا اس کے دل میں بے قراری پھیل گئی تھی۔

”گولڈ انٹرنیشنل سرف۔“ سے کون کپڑے دھوئے گا؟ نشاء اور نکینسرف کے دو منی پیک لے کر اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

”او..... تو وہ لڑکیاں تمہیں اُلو بنا گئیں سیلز گرلز تھیں وہ۔“ سمیج نے کہا۔

”ہاں وہ اپنا نیا سرف متعارف کرانے آئیں تھیں دس پیکٹ دے رہی تھیں ہم نے تو مرونا دو ہی خریدے ہیں بلا ضرورت خرید کر پیسے ضائع کرنے والی بات تھی۔“ نشاء نے بتایا۔

”واہ..... بہت عقلمند ہو خاصی سکھڑی ہو ثابت ہوگی تم سلیقہ شعار اور کفایت شعار بیوی نکین کو بھی سمجھا دینا۔“ سمیج نے شرارت سے کہا۔

”شرم کرو سب کے سامنے فضول بول جاتے ہو۔“ نشاء نے شٹا کر کہا۔

”ان کی تو عقل ہی گٹوں میں ہے۔“ نکین نے بھی جملہ کسا۔

”نگی! تم میری بہن ہو کر میری دل آزاری کر رہی ہو جاؤ میں تم سے نہیں بولتا۔“ سمیج نے باقاعدہ ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

”ارے بھیا! ناراض نہ ہوں سوری لیں سہ سرف مفت لے لیں اور مان جائیں پلیز“ نکین نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے سرف کا پیکٹ اسے دیتے ہوئے کہا۔

”کتنے کا ہے یہ پیکٹ؟“ سمیج نے پلاسٹک کے پیکٹ کو دیکھتے اور ہلاتے ہوئے پوچھا۔

”دس روپے کا ہے۔“ نکین نے بتایا۔

”پانچ روپے کی تو اس میں ہوا بھری ہوئی ہے۔“ سمیج نے پیکٹ اچھالتے ہوئے کہا تو وہ دو تلوں ہنس پڑیں جبکہ جیا سنجیدگی سے بیٹھی رہی۔

”کیا بات ہے پھپھو! آپ ایک دم چپ چپ سی ہو گئی ہیں؟“ سمیج نے باریک بین نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کوئی بات نہیں ہے امی یاد آ رہی ہیں۔“ اس نے بہانہ بنایا۔

”لیجی امی یاد آنے پر بچے روتے ہیں اور آپ چپ ہو گئیں ہیں۔“ سمیج نے حسب عادت مذاق سے کہا تو وہ مسکرا کر اپنے کمرے کی جانب چل دی وہ تینوں کندھے اچکا کر رہ گئے۔

جیانے الف اے کا امتحان پاس کیا تھا کہ محسن بھائی کی شادی طے پا گئی محسن بھائی ایک بہت بڑی تعمیرانی کمپنی سے منسلک تھے ان کے ایک دستخط سے کروڑوں کے ٹھیکے حاصل کیے جا سکتے تھے احمد حسن صاحب نے محسن بھائی کی شادی اپنی بھتیجی سے طے کی تھی۔ عظمیٰ محسن بھائی کو بھی بہت پسند تھیں، رفیق اختر، احمد حسن صاحب کے دیرینہ دوست تھے ان کا کنسرکشن کا بزنس تھا اور احمد حسن صاحب کا گارمنٹس کا بزنس تھا، رفیق اختر نے اپنے بیٹے انیق اختر کے لیے جیا کا رشتہ مانگا جو بھاء کسی پس و پیش کے قبول کر لیا گیا اور محسن بھائی کی شادی کے روز جیا کا نکاح انیق اختر سے کر دیا گیا، جیا کو انیق اختر اپنی عمر سے کافی بڑا لگا تھا، وہ تھا بھی اس سے دس برس بڑا، احمد حسن اس رشتے سے بہت خوش تھے کیونکہ انیق اختر اپنے باپ کے بزنس اور جائیداد کا اکلوتا وارث تھا رفیق اختر نے جیا کی رخصتی اس کی تعلیم مکمل ہونے تک نہ کرانے کا وعدہ کیا تھا کیونکہ جیا سمیت احمد حسن اور عطیہ بیگم کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ اپنی تعلیم ضرور مکمل کرے لہذا جیا نے بی اے میں ایڈمیشن لے لیا اس کی سہیلیاں اس کی قسمت پر رشک کرتی تھیں کہ اتنی جلدی ایک امیر زادے کے نام سے منسوب ہو گئی تھی وہ مگر نجانے کیوں جیا کے دل میں اپنی سہیلیوں کی چھیڑ خانوں شریر جملوں کے باوجود کوئی ہلچل نہیں مچتی تھی بس جیا کا رنگ سرخ شونہی اس کے چہرے کا حصہ ضرور بن جایا کرتا تھا انیق اختر کا آنا جانا ”احمد لاج“ میں باقاعدگی سے جاری تھا جیا اس کے سامنے کم کم ہی آیا کرتی اور جب آتی تو وہ چڑھ کر کہتا۔

”تم مجھ سے مشرقی لڑکیوں کی طرح شرما کر چھٹی مت رہا کرو۔“

”جناب انیق صاحب! آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں مشرقی لڑکی ہی ہوں۔“

جیا مسکرا کر جواب دیتی۔

”مانا جاہن! مگر تم میری بیوی بھی ہو اور بیوی پر شوہر کے کچھ حقوق بھی ہوتے ہیں۔“ انیق

اسے سنجیدہ دیکھ کر رو میٹھک موڈ بنا کر بولتا۔

”سارے حقوق رخصتی کے بعد پورے کر لیجئے گا فی الحال صبر کریں۔“

”بہت بور ہو تم بیوی ہو کر تمہارا یہ حال ہے گرل فرینڈ ہو میں تو ایک دن میں تم سے

دوستی ختم کر لیتا۔“ انیق نے منہ بسور کر کہا۔

میں آپ سے دوستی کرتی ہی نہیں ہر رشتہ ہر اظہار اپنے وقت پر مناسب لگتا ہے ایکسکسوزی

وہ سنجیدگی سے کہہ کر اٹھ کر جانے لگی۔ تو اس نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا جیسا کہ جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔

”ناراض مت ہوؤ میں تمہاری ناراضی انور ڈنہیں کر سکتا کیا کروں تمہارے حسن جہاں سوز کے سامنے بے بس ہو جاتا ہوں دل چاہتا ہے کہ تمہیں فوراً اٹھا کر اپنے گھر لے جاؤں اتنا پڑھ لکھ کر کیا کرو گی تم؟“ وہ اس کے قریب کھڑا ہو کر محبت پاش لہجے میں بولا تو جیسا نظریں نہ اٹھا سکی حیا آلود لہجے میں بولی۔

”اتنا کیا مطلب صرف بی اے ہی تو کر رہی ہوں۔“

”بی اے ادھورا چھوڑو اور بیاہ مکمل کرو تا کہ مجھے بھی قرار ملے۔“ وہ اس کے چہرے کو چھوتے ہوئے مدھم اور محبت بھرے لہجے میں بولا تو وہ شرما گئی۔

”اُف..... یہ شرمانا اور مجھے تڑپانا آزمانا میں آج ہی ڈیڈی سے بات کرتا ہوں کہ کل انکل سے رخصتی کی بات کریں۔“ وہ اسے محبت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”نہیں پلیز کم از کم مجھے بی اے تو کمپلیٹ کرنے دیں۔“ اس نے فوراً کہا۔

”ایک شرط پر۔“

”وہ کیا۔“

”وہ یہ کہ تم مجھ سے ملنے اور فون پر بات کرنے سے نہیں کتراؤ گی اگر کبھی میں تمہیں اپنے ساتھ باہر گھمانے لے جانا چاہوں تو تم بلا جھجک میرے ساتھ چلو گی مجھ سے یوں چھپتی نہیں پھرو گی بولو منظور ہے؟“

”آپ امی ابو سے اجازت لے لیں اگر انہیں اعتراض نہ ہو تو منظور ہے۔“ اس نے مدھم آواز میں جواب دیا۔ امی ابو کو درمیان میں لا کر وہ مطمئن ہو گئی تھی اس لئے کہ ان کا حکم اور فیصلہ مقدم و محترم تھا۔

☆☆☆

”ان کی تم فکر نہ کرو انہیں منانا تو میرے ہائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔“ انیق نے بڑے یقین سے کہا اور ہوا بھی یہی تھا اس نے جاتے وقت احمد حسن اور عطیہ بیگم سے بات کر لی تھی اور انہوں نے بخوشی اجازت بھی دے دی تھی اعتراض کا کوئی جواز بھی نہ تھا کیونکہ جیسا انیق کی منکوہ تھی بیوی

تھی وہ اس پر پورا حق رکھتا تھا اب وہ کھلم کھلا بے وقت اسے فون کرتا ملنے چلا آتا باہر جانے کے لیے مجبور کرتا جس سے جیا پریشان ہو جاتی وہ بہت قیمتی تحائف ہر بار اس کے لیے لے کر آتا اس کے حسن کے قصیدے پڑھتا اپنی محبت کا اظہار کرتا تو وہ پکھل جاتی اور اس کے ساتھ باہر بھی چلی جاتی اسے یہ اطمینان رہتا کہ وہ اپنے والدین کی منشا اور مرضی سے انیتق کے ساتھ باہر جاتی ہے مگر اس دوران اسے انیتق کو جاننے کے مواقع بھی مل رہے تھے مثلاً اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی کئی لڑکیوں سے دوستی ہے۔ وہ ڈرنک بھی کرتا ہے اور ہر وقت اپنے ذاتی مفاد کو مد نظر رکھتا ہے۔ یہ وہ انکشافات تھے۔ جو جیا کو انیتق سے بد دل کرتے جا رہے تھے۔ انیتق بہت خوبصورتی سے اس کے سوال نال جاتا اور اسے اپنی خوبصورت باتوں کے جال میں الجھا کر رکھ دیتا۔

”جیا! کل رات میں نے تمہارے شوہر نامہ را کو پی سی میں ایک لڑکی کے ساتھ ڈنر کرتے ہوئے دیکھا تھا۔“ جیا کی دوست فاخرہ نے کالج میں ملتے ہی اسے بتایا۔

”انیتق کے ساتھ؟“ جیا نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔

”ہاں بھی ظاہر ہے اور کتنے شوہر ہیں تمہارے۔“ فاخرہ نے ہنس کر کہا۔

”شٹ اپ اصل بات بتاؤ۔“

”یار! میں بھی ماموں کی فیملی کے ساتھ ڈنر کرنے گئی تھی میں نے وہیں انہیں دیکھا تھا میں تو سمجھی تھی کہ وہ لڑکی تم ہو مگر قریب جا کر دیکھا تو وہ تو کوئی الٹرا ماڈرن لڑکی نکلی انیتق بھائی کے ساتھ تو ایسے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی اور ان کا ہاتھ تھام کر چل رہی تھی جیسے وہی ان کی بیوی ہو چکے مجھے تو بہت غصہ آیا۔ انیتق بھائی پر ان مردوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ بیوی کے علاوہ بھی انہیں وقت گزاری کے لیے گرل فرینڈز چاہئیں۔“ فاخرہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا جیا کو سخت کوفت اور ندامت محسوس ہوئی۔

”تم نے بات کی تھی انیتق سے؟“

”نہیں، اگر تم ان کے ساتھ ہو تیں تو ضرور بات کرتی۔“ فاخرہ نے جواب دیا۔

”اچھا چلو کلاس کا ٹائم ہو گیا ہے۔“ جیا اس موضوع سے جان چھڑانا چاہتی تھی اٹھتے ہوئے

بولی اور دونوں کلاس روم کی جانب چل دیں۔

شام کو جب انیتق اس سے ملنے کے لیے گھر آیا تو اس نے فوراً ہی پوچھا۔

”رات پی سی میں آپ کس لڑکی کے ساتھ ڈنر کر رہے تھے؟“

”رات..... آں ہاں وہ شہلا تھی اس نے ہماری کہنی سے اپنے پلازہ کا نقشہ بنوایا تھا وہ اسے بے حد پسند آیا اب وہ اپنے بنگلے کا نقشہ بنوانا چاہتی ہے میں تو اکیلا ہی ڈنر کر رہا تھا کہ وہ بھی اچانک وہاں چلی آئی مجھے ڈنر کرتے دیکھا تو پہچان کر میری ٹیبل پر چلی آئی لہذا اخلاقاً مجھے اسے بھی اپنے ساتھ ڈنر کرانا پڑا مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو؟“ اس نے شپٹا کر فوراً کہانی بنا کر کہا۔

”کیونکہ میں آپ کی بیوی ہوں پوچھنے کا حق رکھتی ہوں۔“

”بجائے فرمایا آپ نے مگر یہ بتائیے بیوی جی کہ کیا آپ نے میرے پیچھے اپنے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں جو آپ کو میری مصروفیات کی رپورٹ دیتے ہیں؟“

”جاسوس اس کے پیچھے چھوڑے جاتے ہیں جس کے متعلق کچھ علم نہ ہو اور آپ کو تو میں اچھی طرح جانتی جا رہی ہوں۔“ اس نے معنی خیز بات کہی۔

”تم واقعی بیوی لگ رہی ہو، اس وقت شکی بیوی ارے میری جانم! میں صرف تمہارا ہوں تمہاری کالی لمبی زلفوں کا اسیر تمہارا انیق۔“ انیق نے اس کے لمبے سیاہ بالوں کو چھیڑتے ہوئے کہا تو وہ بے دلی سے مسکرا دی اور اگلے دن اس نے اپنے لمبے سیاہ بال کٹوا کر شو لڈر کٹ اسٹائل اپنا لیا اسے اپنے لمبے بالوں سے عشق تھا مگر وہ انیق کو پسند تھے لہذا اس نے دانستہ کٹوا دیئے تاکہ وہ انیق کا رد عمل اس کے جذبے کی سچائی اپنی ذات کے حوالے سے پرکھ سکے یہ دیکھ کر کہ کیا انیق کو واقعی اس کے بال پسند تھے یا وہ محض جمہولی تعریف کرتا تھا ایک ذرا سی بات پر وہ بہت بڑی بات سمجھنے کا سامان کر رہی تھی اور جب انیق نے اس کے شانوں پر لہراتے بال دیکھے تو مسکرا کر بولا۔

”واؤ گریٹ! شکر ہے تم نے بھی مشرقیت اور دقیا نویسیت کے چال پر پہلی قینچی تو چلائی اب اپنا ڈریسنگ اسٹائل بھی تبدیل کرو ویسٹرن سٹچ دو اپنے ڈریسز کو پھر تم غضبناک حد تک حسین دکھائی دو گی انسان کا آدھا حسن تو اس کے پہناوے سے مشروط ہوتا ہے لباس معمولی شخصیت کو بھی غیر معمولی بنا دیتا ہے۔“

”درست کہا آپ نے۔“ جیانے تاسف سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”باہر چلیں۔“

”نہیں میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“ اس نے بیزاری سے کہا۔

”کم آن یار! تمہاری طبیعت میں منٹوں میں ٹھیک کروں گا۔“ انیق نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

”پلیز انیق! میرا موڈ نہیں ہے۔“ وہ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی۔
 ”اچھی بیوی اپنے شوہر کے موڈ کے تابع ہوتی ہے میں گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں فوراً پہنچو۔“ وہ حاکمانہ لہجے میں کہتا ہا ہر نکل گیا۔
 ”ابھی سے یہ عالم ہے، تو جناب بعد میں نجانے، کیا کریں گے۔“ میرے ساتھ وہ غصے سے بولی۔

”جیابیٹا! انیق تمہارا انتظار کر رہا ہے جاؤ نا۔“ عطیہ بیگم نے آ کر کہا۔
 ”امی! میں نہیں جانا چاہتی تو کوئی زبردستی ہے کیا؟“
 ”وہ تمہارا شوہر ہے تمہیں اس کی بات ماننی چاہیے۔“ عطیہ بیگم نے سمجھایا۔
 ”امی! آپ جیسے والدین نے ہی لڑکوں دامادوں کے دماغ خراب کیے ہیں کل کو اگر وہ مجھے اپنے کسی دوست کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر چلنے کا حکم دے دے تو کیا مجھے وہ بھی ماننا پڑے گا؟“ وہ غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

”کیا فضول سوچتی رہتی ہو انیق بھلا ایسا کیوں کہے گا۔“ عطیہ نے اسے ڈانٹا۔
 ”جہاں تک میں انیق کو سمجھ پائی ہوں وہ ایسا ویسا سب کچھ کہہ سکتا ہے۔“
 ”تم ابھی بچی ہونا سمجھو۔“ عطیہ بیگم نے نرمی سے کہا۔
 تو میرے بالغ اور سمجھدار ہونے کا انتظار تو کر لیا ہوتا اتنی جلدی نکاح کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ سلگتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”تمہاری نا سمجھی کی وجہ سے ہم اتنا اچھا رشتہ ٹھکرانے کی حماقت نہیں کر سکتے تھے۔“ عطیہ بیگم نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”حماقت تو آپ کر چکے ہیں۔“
 ”کیا کبھی ہو جاؤ انیق برامانے گا تمہاری اس حرکت کا۔“
 ”برا تو وہ خود ہے اور اس کی حرکتیں بھی۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی آئی انیق اسے دیکھ کر فاتحانہ انداز میں مسکرا دیا اور اسے اپنے ساتھ ریٹورنٹ لے آیا وہ چپ چپ سی گلاس وال سے

باہر لان میں دیکھ رہی تھی تو اس نے ہی بات شروع کی۔

”کم آن یار! اپنا موڈ ٹھیک کر دو دیکھو تو کتنا اچھا موسم ہے۔“

”اچھی خاصی دھوپ ہے باہر یہ اچھا موسم ہے آپ کی نظر میں۔“ جیانے سنجیدگی سے کہا تو

وہ ہنس کر بولا۔

”ہاں بالکل تم جو ہو میری نظر میں۔“

”دیکھا جو چہرہ تیرا موسم بھی پیارا لگا

کانوں میں جھمکا تیرے جھکوستارہ لگا۔“

انیتق نے گنگنا تے ہوئے اس کے کانوں میں موجود سونے کی بالی کو چھیڑا تو وہ شپٹا کر پیچھے

ہٹی اور سخت لہجے میں بولی۔

”کیا کرتے ہیں آپ یہ پبلک پلیس ہے کسی نے دیکھ لیا تو کیا سوچے گا؟“

”جو کسی کے دماغ میں آئے سوچے مجھے کسی کی سوچ سے کوئی غرض نہیں ہے میں کسی کی

خاطر اچھے قیمتی لمحات ضائع نہیں کر سکتا۔“ اس نے بے نیازی سے کہتے ہوئے بڑی بے باکی سے

اس کا ہاتھ تمام کر چوم لیا جیسا غصے اور حیا سے تپ کر اپنا ہاتھ چھڑا کر کھڑی ہو گئی۔

”افوہ..... بیٹھو جی ڈارلنگ! یہاں کون دیکھ رہا ہے ہمیں ہماری ٹیبل تو کارز میں ہے۔“

انیتق نے پھر سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”آپ کو اس قسم کی حرکتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“ وہ مجبوراً بیٹھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولی تو

اس نے مسکراتے ہوئے ڈھٹائی سے پوچھا۔

”اور مجھے کس قسم کی حرکتیں کرنی چاہئیں؟“

”مجھے نہیں معلوم پلیز مجھے گھر ڈراپ کر دیں آئندہ میں آپ کے ساتھ باہر نہیں آؤں گی“

”تم بیوی ہو میری میں تمہیں اپنے ساتھ کہیں بھی لے جانے کا اختیار رکھتا ہوں سمجھیں جیا

ڈارلنگ!“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”لیکن جو کچھ آپ نے ابھی کیا ہے وہ آپ کو نہیں کرنا چاہیے تھا آپ کا حق اختیار اپنی جگہ

لیکن ابھی ہماری رخصتی نہیں ہوئی۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”تو کیا فائدہ نکاح کرانے کا، اگر میں اب بھی پابند ہو کر تم سے ملا کروں؟“

”گھر چلیں پلیز۔“

”چلو میرے ساتھ ”انیق ولا“۔ چلو جو تقریباً مکمل ہو چکا ہے وہاں تو کوئی دیکھنے والا نہیں ہو گا نا میں کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کر سکوں گا۔ اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

”لیکن رخصتی کے بعد۔“ جیانے حیا سے تپ کر کہا۔

”تمہارے ”انیق ولا“ آنے تک کہیں میں ہی دنیا سے رخصت نہ ہو جاؤں۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“ جیانے اس کے چہرے کو پریشانی سے دیکھا۔

”پیار کی باتیں تم برداشت نہیں کرتی ہو تو ایسی باتیں ہی کروں گا نا۔“

”اوکے آئی ایم سوری اب گھر ڈراپ کر دیں مجھے بہت دیر ہو گئی ہے۔“ اس نے ہتھیار

ڈالتے ہوئے کہا کیونکہ وہ اپنی طرف سے امی ابو کو یا اسے شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

”پہلے تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم دوبارہ بھی میرے ساتھ باہر گھومنے کے لئے آؤ گی؟“ اس

نے سنجیدگی سے کہا۔

”اوکے آؤں گی؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ ہوئی نابات چلو اب تمہیں گھر ڈراپ کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ انیق نے خوشی

سے مسکراتے ہوئے کہا تو اس نے سکون کا سانس لیا اور اس کے ساتھ ریسٹورنٹ سے باہر آ گئی۔

دن گزرتے گئے انیق کی بے باکیوں کے باعث جیانے اب اس سے باہر ملنا اس کے

ساتھ جانا چھوڑ دیا تھا، وہ ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اس سے جان چھڑا لیتی آج وہ شاپنگ کے

لیے نکل گئی تھی اپنی ضروری اشیاء خریدنے کے بعد وہ عظمیٰ بھابی کے ساتھ آکس کریم کھانے آکس کریم

پارلر میں داخل ہوئی تو اس کی نظر سامنے ٹیبل کے گرد رکھی کرسی پر بیٹھے انیق پر پڑی اور اس کے

ساتھ ہی ایک خوبصورت سی لڑکی بیٹھی اس سے باتیں کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ آکس کریم بھی کھا

رہی تھی۔ اسے سخت غصہ آیا انیق نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور اسے اچانک سامنے پا کر گھبرا سا گیا تھا

عظمیٰ بھابی نے بھی اسے دیکھا تو جیانے مخاطب ہوئیں۔

”ارے یہ تو انیق ہے یہ یہاں..... یہ لڑکی کون ہے اس کے ساتھ؟“

”ان کی گرل فرینڈ ہے اور کون ہو گی؟“ جیانے تلخ لہجے میں کہا۔

”میں نے تو پہلے بھی ایک بار انیق کو کسی لڑکی کے ساتھ شاپنگ کرتے دیکھا تھا مگر میں اسے

اٹھاؤ ہم سمجھ کر ٹال گئی کسی سے ذکر بھی نہ کیا خواہ مخواہ ٹینشن کری ایٹ ہوگی گمراہ تو انیق سامنے موجود ہے اور لڑکی بھی اس کا مطلب ہے کہ تمہارے خدشے درست ہیں انیق بھونرا صفت اور فکرتی شخص ہے ویری سیڈ اب کیا ہوگا؟“ عظمیٰ بھابی نے سنجیدہ اور متاسف لہجے میں کہا تو وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

”وہی جانیں جنہوں نے ان سے میرا رشتہ جوڑا تھا چلیے بھابی۔“
 ”ارے ٹھہرو تو اب جب آ ہی گئے ہیں تو آ کس کریم کھا کر جائیں گے۔“
 ”نہیں بھابی! پھر سہی۔“

”او کے تم یہاں رکو میں آ کس کریم پیک کروا کر لاتی ہوں گھر جا کر کھائیں گے یوں واپس جانا مناسب نہیں ہے انیق اور شیر ہوگا اور چور تو وہ ہے فراڈ یا وہ ہے ہم نہیں ہیں کہ اسے دیکھتے ہی بھاگ جائیں سامنا کرنے سے کترائیں ریلیکس جیا میں آتی ہوں۔“ عظمیٰ بھابی نے آہستگی سے کہا اور اس کا شانہ تھپک کر آ کس کریم پیک کروانے چلی گئیں۔

”ہائے جیا! تم یہاں کیسے؟“ انیق اسے اکیلا دیکھ کر لڑکی سے معذرت کرتا اس کے پاس آ کر مخاطب ہوا۔

”کیوں یہاں کیا آپ جیسے امیر زادے ہی اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ آ سکتے ہیں۔“ جیا نے طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ کھیانا ہو کر بولا۔
 ”وہ لی ہے۔“

”تلی ہو یا پتلی آپ کی کیا لگتی ہے وہ؟“
 ”وہ میری دوست ہے۔“

”اور میں.....؟“

”تم بیوی ہو میری۔“

”اگر میں کسی لڑکے کے ساتھ اس طرح ڈٹیں پر جانے لگوں تو آپ کو کیسا لگے؟“ جیا نے سپاٹ اور تلخ لہجے میں کہا۔

”اگر لڑکا ہمارے لئے بزنس کے لئے فائدہ مند ہوا تو میں تمہیں انکرج کروں گا۔ ورنہ تمہیں فوراً اس سے دوستی ختم کرنے کا حکم دوں گا تلی کے ذریعے مجھے بہت بڑا اینڈر ملنے کی توقع

ہے۔ اس لئے اسے خوش کرنا اور وقت دینا بھی ضروری ہے۔“ وہ ڈھٹائی اور بے حیائی سے اچھے خیالات کا اظہار کر رہا تھا جیسا کی نظروں سے گرنے میں اسے ایک سیکنڈ لگا تھا دکھ اس کے رگ و پے میں سا گیا۔

”تو آپ اپنی گرل فرینڈ کو اس کام کے لئے استعمال کرتے ہیں۔“ وہ بولی۔

☆☆☆

”ہاں اس کے علاوہ میرا وقت بھی خوشگوار گزر جاتا ہے اب اگر تم مجھ سے کتراتے پھر وگی تو میں وقت پاس کرنے کے لئے ادھر ادھر ہی نظر دوڑاؤں گا تاں ویسے اگر لاتی کا کام تم کر دو تو میں ابھی لاتی سے قطع تعلق کر لوں گا۔“ اس نے بے باکی اور ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”قطع تعلق تو کرنا ہی ہو گا مسٹر انیق! مجھے کلی منڈ لانے والے اور مطلب پرست شخص کے ساتھ زندقہ بسر کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ وہ غصیلے اور سپاٹ لہجے میں بولی۔

”اب تو عمر بھر کا ساتھ ہے جانم!“ وہ خباثت سے ہنسا۔

”چلو جیا!“ عظمیٰ بھابی آئس کریم پیک کروا کر لے آئیں۔

”ہیلو بھابی! کیسی ہیں آپ؟“ انیق نے انہیں دیکھ کر پوچھا۔

”میں تو ٹھیک ہوں تم سناؤ آج کون سی گرل فرینڈ کو خوش کر رہے ہو۔“

”اوہ..... بھابی! یہ تو بزنس کی مجبوری ہے ورنہ محبت تو مجھے جیسا سے ہے آخر جیا میری بیوی

ہے۔“ اس نے شیشا کر جواب دیا۔

”بھابی! چلیں دیر ہو رہی ہے۔“ جیا عظمیٰ بھابی کا ہاتھ پکڑ کر پارلر سے باہر نکل گئی انیق آواز

دیتا رہ گیا۔

”امی! مجھے فاخرہ نے مجھے دوبار بتایا تھا مگر میں نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا تھا اب اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد یقین نہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی انیق ایک آوارہ مزاج اور مطلب پرست شخص ہے وہ رشتوں کو اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرنے اور قربان کرنے والی سوچ رکھتا ہے بیویوں گرل فرینڈز ہیں اس کی بھلا اسے بیوی کی کیا ضرورت ہے۔“ جیا نے گھر آتے ہی عطیہ بیگم کو سب کچھ بتا دیا عظمیٰ بھابی نے بھی اس کی باتوں کی تصدیق کر دی۔

”تم خواہ مخواہ بدگمان ہو رہی ہو انیق امیر باپ کا اکلوتا بیٹا ہے اور امیر زادے اس عمر میں

ایسی دوستیاں بنا ہی لیا کرتے ہیں کل جب تم رخصت ہو کر اس کے گھر چلی جاؤ گی وہ ادھر ادھر منہ ماری نہیں کرے گا۔“ عطیہ بیگم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر درحقیقت وہ اندر سے پریشان ہو گئی تھیں اس کی اور عظمیٰ بھابی کی باتیں سن کر۔

”امی! جس جانور کو ادھر ادھر منہ مارنے کی لت پر جائے وہ کبھی ایک کھونٹے سے بندھ کر نہیں رہ سکتا۔“ وہ تنبیہ سے بولی۔

”ہوش کے ناخن لو لڑکی یہ تم اپنے شوہر کے متعلق کس قسم کے الفاظ استعمال کر رہی ہو؟“ عطیہ بیگم نے غصے سے کہا۔

”جس قسم کا وہ ہے۔“

”جیا! تمہارے باپ نے یہ باتیں سن لیں ناں تو قیامت کھڑی کر دیں گے وہ۔“

”قیامت تو مجھ پر ٹوٹنے والی ہے آپ پر تو آنچ بھی نہیں آئے گی زندگی تو میری داؤ پر لگی ہے پتا نہیں کیا دیکھ کر آپ لوگوں نے انیق سے میرا نکاح کیا تھا ابو کو تو اس کے کردار کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے تھا۔“ جیا نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔

”انہیں سب معلوم تھا تمہارے ابو کے دوست کا بیٹا ہے انیق! اس عمر میں لڑکے ایسی حرکتیں کیا ہی کرتے ہیں۔ اور ہم تمہارے والدین ہیں تمہارا بھلا ہی سوچیں گے۔ ہم دشمن تو نہیں ہیں تمہارے۔“ عطیہ بیگم نے غصے سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا۔“

”جیا!.....“ عطیہ بیگم کو اس سے اس جواب کو توقع نہ تھی انہوں نے اس کے رخسار پر تھپڑ جڑ دیا اور یہ تھپڑ اس کے لئے بھی غیر متوقع تھا زندگی میں پہلی بار اس پر کسی نے ہاتھ اٹھایا تھا اور وہ بھی اس کی پیاری امی جان نے اس نے بے حد دکھ سے انہیں دیکھا مگر آنسو نہ بہانے کا عہد کر لیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”امی! یہ کیا کیا آپ نے اس نے کچھ غلط تو نہیں کہا تھا۔“ عظمیٰ بھابی نے اپنے چھ ماہ کے بیٹے عثمان کو تھپکتے ہوئے کہا۔

”مجھے اس پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا مگر اس کا اس طرح آخری حد تک جا کر سوچنا ٹھیک نہیں ہے عظمیٰ اس کا نکاح ہوا ہے کوئی منگنی نہیں ہوئی کہ ٹوٹ جائے تو اور ہو جائے گی گھر بسانا

بہت مشکل ہوتا ہے اس کے لئے لڑکی کو ہزار طرح کی نامناسب باتوں کو نظر انداز کرنا برداشت کرنا پڑتا ہے۔“ عطیہ بیگم نے سنجیدہ اور کمزور لہجے میں کہا۔

”امی! ہماری جیا بہت معصوم اور پیاری ہے اگر خدا نخواستہ بعد میں انیق نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو جیا کی زندگی تو خراب ہو جائے گی نا آپ ابو سے کہیں کہ وہ رفیق انکل سے بات کریں جیا کے دل سے جو غصہ اُتر گیا ہے وہ اس کے ساتھ ساری زندگی کیسے گزار سکتی ہے ابھی تو بات گھر میں ہے رخصتی کے بعد بہت مشکل ہو جائے گی جیا کے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی۔“ عظمیٰ بھابی نے نرم اور سنجیدہ لہجے میں کہا تو عطیہ بیگم بولیں۔

”اللہ مالک ہے کچھ نہیں ہوگا بس تم جیا کا دل صاف کرنے کی کوشش کرو انیق جیسا بھی ہے اس کا شوہر ہے اسے اسی کے ساتھ زندگی بسر کرنی ہے۔“

”ایک تو ہماری مائیں بیٹی کو شوہر کی تابعداری اور جی حضوری کی پٹی پڑھا پڑھا کر اسے مجبور کر دیتی ہیں کہ وہ شوہر کا ہر ظلم زیادتی سہے اس کی ہر جائز ناجائز اور غلط بات مانے کیونکہ وہ اس کا شوہر ہے بیٹی خواہ ساری زندگی خوشی اور آسودگی کے لئے ترستی رہے والدین اپنے گھر بسائے رکھنے کی تاکید کرتے رہیں گی اسی لئے تو مردوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے ظلم سہے جاؤ اور نبھائے جاؤ۔“ عظمیٰ بھابی نے دکھ سے سوچا۔

☆☆☆

”تم نے بتا دیا کھیل بگاڑ دیا کیا ضرورت تھی جیا کے سامنے اپنی اصلیت ظاہر کرنے کی وہ چھٹانک بھر لڑکی تمہاری درجنوں گرل فرینڈز پر بھاری ہے بہت ہوشیار اور ذہین ہے اگر وہ ضد پر اُتر آئی تو ہمارا کام نہیں بنے گا میں نے تو اس لئے جیا سے تمہاری شادی کا فیصلہ کیا تھا کہ اس کا بھائی اپنے ایک دستخط سے ہمیں لاکھوں کروڑوں کا فائدہ پہنچا سکتا ہے کبھی انکار بھی کرنا چاہے گا تو اپنی بہن کی وجہ سے مجبور ہو کر کانٹریکٹ ہمارے نام جاری کر دے گا اور جیا خود بھی بہت ذہین اور حسین ہے۔ ہمارے بزنس کو آگے بڑھانے میں بہت معاون ثابت ہو سکتی تھی۔“ رفیق اختر سے احمد حسن صاحب نے بات کی تھی اور انیق نے بھی انہیں بتا دیا تھا کہ اسے جیا نے گرل فرینڈ کے ساتھ دیکھ لیا تھا جیسی رفیق اختر غصے میں بھرے بول رہے تھے۔

”ثابت ہو سکتی تھی نہیں ثابت ہوگی ڈیڈ! آپ کیوں فکر کرتے ہیں میرے پاس اس ننھی چڑیا

کو جال میں پھنسانے کے سوگر موجود ہیں بس آپ دیکھتے جاییں میں کس طرح اس چڑیا کے پر کاٹ کر اپنے پنجرے میں بند کرتا ہوں یوں بھی وہ کہیں اور تو اُڑ نہیں سکتی آخر اسے ہمارے ہی گھر کی منڈیر پر چھبھانا ہے۔“ انیق نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ دونوں ہنس پڑے۔

انیق اگلے دن بہت سے قیمتی تحائف لے کر ”احمد لاج“ جیا سے ملنے چلا آیا عطیہ بیگم نے بہت عزت سے اسے بٹھایا حال احوال پوچھا۔

”آئی! میں یہ تحائف جیا کے لیے لایا ہوں ہے کہاں وہ مجھ سے ناراض ہو گئی تھی وہ بھی میں تو اسے چڑانے کے لیے گرل فرینڈز کا سہارا لے رہا تھا۔ بزنس میں سو طرح کے لوگوں سے سلام دعا رکھنی پڑتی ہے اب اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ ہر شخص مرد یا عورت آپ کا دوست ہو“ انیق نے بہت خوبصورتی سے بات بتاتے ہوئے کہا۔

”تم صحیح کہہ رہے ہو میں نے جیا کو سمجھایا ہے تم خود بھی سمجھالینا میں اسے بھیجتی ہوں“ عطیہ بیگم نے مطمئن ہو کر کہا اور اٹھ کر جیا کے کمرے میں آ گئیں۔

”جیا! بیٹا انیق آیا ہے۔“

”وہ اب یہاں کیوں آیا ہے؟“ اس کا خون کھول گیا اس کا نام سن کر۔

”تمہیں منانے آیا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

”وہ اس قابل ہے کہ اس سے ناراض ہو جائے۔“ وہ تنہی سے بولی۔

”آہستہ بولو اگر اس نے سن لیا تو؟“

”تو سن لے وہ کہ نفرت ہے مجھے اس سے“ وہ غصے سے چیخی اور عطیہ بیگم کی بجائے اب کی بار احمد حسن صاحب کا ہاتھ اس کے رخسار پر اپنا نشان چھوڑ گیا عطیہ بیگم نے گھبرا کر پلٹ کر دیکھا وہ غصے میں اسے گھور رہے تھے۔

”ابو! آپ نے مجھے مارا ہاں آپ نے مجھے مار دیا ابو۔“ وہ حیرت صدے اور دکھ سے بولی تو وہ غصیلے لہجے میں بولے۔

”فضول باتیں بند کرو تم ہماری عزت خاک میں ملانا چاہتی ہو۔ ایک شخص تمہارے پیچھے لاکھوں خرچ کر رہا ہے اور تمہارے مزاج نہیں مل رہے کیا کمی ہے انیق میں بولو؟“

”کوئی کمی نہیں ہے انیق میں زیادتی ہی زیادتی ہے۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

”عطیہ بیگم! اسے سمجھاؤ شادی کوئی گڈی گڈی لے کا کھیل نہیں ہے کہ اس کے کہنے پر ختم کرایا جائے میں انیق کو لے کر فیکٹری جا رہا ہوں اچھی طرح سمجھا دینا اسے۔“ احمد حسن صاحب اپنی بات مکمل کر کے چلے گئے وہ بے ذمہ سی ہو کر بستر پر بیٹھ گئی۔

”میرا خیال ہے کہ اب تمہیں مزید کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں وہی کرنا ہے جو ہم چاہتے ہیں۔“ عطیہ بیگم نے مدہم آواز میں کہا۔

”ہاں مجھے وہی کرنا ہے جو آپ لوگ چاہتے ہیں۔“ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی اور عطیہ بیگم کے کمرے سے جانے کے بعد اس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور نیکیے میں چہرہ چھپا کر بلک بلک کر رونے لگی۔

اور جب اب انیق دوبارہ اس سے ملنے کے لیے آیا تو وہ عطیہ بیگم کے کہے بغیر ہی تیار ہو کر اس کے پاس آ بیٹھی وہ اسے باہر لے گیا اس نے اعتراض نہیں کیا باوجود اس کے کہ اسے اب انیق کے وجود سے اس کی موجودگی سے الجھن اور گھٹن محسوس ہونے لگی تھی مگر پھر بھی اس کے ساتھ جانے ہنسنے بولنے پر مجبور تھی۔ جب اسے اپنی جان سے بڑھ کر چاہنے والے والدین نے ہی اس راستے پر چلنے کا حکم صادر کر دیا تھا اب اسے گھٹن کا احساس ہوتا یا انگارے پاؤں تلے جلتے اسے اب کسی سے شکوہ یا احتجاج نہیں کرنا تھا اس نے بھی سوچ لیا تھا کہ اب امی ابو سے انیق کے متعلق کوئی بات نہیں کہے گی ان کے کہنے پر چلے گی خواہ دنیا ہی سے کیوں نہ چلی جائے۔ وہ نافرمان یا گستاخ نہیں ہے یہ وہ اپنے عمل سے ثابت کرنا چاہتی تھی اور جیسا کہ اسی بدلے ہوئے رویے کو دیکھ کر عطیہ بیگم اور احمد حسن صاحب مطمئن ہو گئے تھے مگر ان کا یہ اطمینان خود انیق نے ہی غارت کر دیا اسے ہاؤسنگ اسکیم اور ہاسٹل بنانے کا ٹھیکہ چاہیے تھا محسن بھائی نے اس کی فائل اس کی پچھلی ناقص کارکردگی کی بناء پر ریجیکٹ کر دی تو وہ غصے میں آگ بگولہ ہو گیا رفیق اختر کو بھی تاؤ آ گیا۔

”محسن میاں! تمہارے اس سیٹ پر بیٹھنے کا اگر ہمیں فائدہ نہ ہو تو کیا فائدہ اس سیٹ کا آخر رشتے داروں کا بھی کوئی حق ہوتا ہے۔“ رفیق اختر انیق سمیت محسن بھائی کے آفس میں بیٹھے کہہ رہے تھے۔

”انکل! یہ ٹینڈر میری ذاتی پر اپنی نہیں ہے یہ سیٹ عوام کی بہتری کے لیے کام کرنے کے

لیے حاصل کی ہے میں نے میں اسے اپنے رشتے داروں کے فائدے کے لیے استعمال کر کے پیشہ ورانہ بددیانتی کا مرتکب نہیں ہو سکتا اور ویسے بھی کچھلی بار آپ کو میں نے پل بنانے کا ٹھیکہ دیا تھا اس کا نتیجہ کیا نکلا پہلی بارش میں ہی پل زمین بوس ہو گیا اور کروڑوں کا نقصان ہونے کے ساتھ ساتھ کئی جانیں بھی ضائع ہوئیں ناقص میٹرل سے بنا پل گر گیا تو یہ تو لوگوں کی رہائش اور علاج معالجے کی عمارات ہیں۔ کم از کم میں ان میں ملاوٹ اور کھوٹ شامل نہیں کرنا چاہتا۔ اس طرح تو ہزاروں زندگیاں داؤ پر لگانے والی بات ہے۔“ محسن بھائی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”تو گویا تم یہ ٹینڈر پاس نہیں کرو گے؟“ رفیق اختر نے کہا۔

”سوری میں مجبور ہوں۔“ محسن بھائی نے مہذبانہ انداز میں معذرت کی۔

”میں بھی مجبور ہو سکتا ہوں محسن بھائی۔“ انیق نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”میں سمجھا نہیں۔“ انہوں نے اس کا چہرہ دیکھا۔

”میں سمجھا دیتا ہوں محسن بھائی! اب دیکھیے نا آپ کا ایک ٹینڈر میرے ہاتھ میں بھی ہے

میں بھی اس ٹینڈر کی فائل آپ کو واپس کر سکتا ہوں۔“

”یعنی.....؟“

”یعنی یہ کہ ایک کانٹریکٹ میرے اور آپ کی بہن کے بیچ سائن ہوا تھا اگر آپ اس کانٹریکٹ پر سائن نہیں کریں گے تو مجبوراً مجھے وہ کانٹریکٹ کینسل کرنا پڑے گا اب فیصلہ آپ کے ہاتھ

میں ہے۔ چاہیں تو آپ سائن کر دیں ورنہ مجھے اس کانٹریکٹ پر سائن کرنے سے کوئی نہیں روک

سکتا۔“ انیق نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

”اوائی سی تو تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو۔“ محسن بھائی نے اس کی بات کی تہہ تک پہنچتے

ہوئے کہا۔

”بزنس میں سب چلتا ہے محسن بھائی! اب آپ کو اپنی بہن کی ”میرج لائف“ عزیز ہے یا

اپنے ہم وطنوں کی لائف عزیز ہے۔ اس کا فیصلہ کر لیجئے کل اسی وقت میں آپ کے آفس دوبارہ

آؤں گا اگر مجھے مثبت جواب نہ ملا تو آپ کو منفی جواب میں ضرور دوں گا چلیں ڈیڈ۔“ انیق نے

بہت گھٹیا انداز میں کہا اور رفیق اختر کو لے کر آفس سے باہر نکل گیا۔

”جی ٹھیک کہتی تھی یہ شخص مفاد پرست اور گھٹیا ہے۔“ محسن بھائی نے پریشانی سے آفس میں

ٹہلے ہوئے سوچا اور گھر آ کر سب کو انیق کی بلیک میلنگ کے بارے میں بتایا تو جہاں عطیہ بیگم اور احمد حسن صاحب شاک میں آگئے وہاں جیا کا اطمینان قابل دید تھا اس نے ان کی جانب دیکھا تو وہ دونوں چوروں کی طرح نظریں چراگئے جبکہ محسن بھائی پریشانی میں گھرے بیٹھے تھے۔

”بھائی! آپ وہ کریں جو آپ کے ضمیر کے اطمینان کا باعث ہو میری وجہ سے ہزاروں لوگوں کی زندگی خطرے میں مت ڈالیں اگر آپ نے آج ان لوگوں کی بات مان لی تو وہ لوگ آئندہ بھی اسی دھڑلے سے آپ کو بلیک میل کریں گے آپ کب تک میری وجہ سے ان کے ناجائز مطالبات ماننے رہیں گے اس بلیک میلنگ کے پودے کو سر نکالنے سے پہلے ہی جڑ سے اکھاڑ ڈالیں کیونکہ آپ کو اپنے ضمیر کے سامنے حکام بالا کے سامنے ہی نہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی جوابدہ ہونا ہے آپ ایسا کوئی اقدام نہیں کریں گے جو آپ کے ضمیر کے منافی ہو آپ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ آپ صرف میرے بھائی ہی نہیں ہیں اس ملک کے بیٹے بھی ہیں اور دھرتی ماں کے بیٹے اپنی ماں سے کبھی بے وفائی یا غداری نہیں کرتے بلکہ ماں کا مان بڑھاتے ہیں۔“ جیا نے محسن بھائی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بہت سنجیدہ اور مدلل انداز میں کہا تو ان سب نے اسے بہت حیرت سے دیکھا۔ وہ اس قدر حساس اور سمجھدار ہے احمد حسن اور عطیہ بیگم کو اپنا یہ فیصلہ بہت بڑی غلطی محسوس ہو رہا تھا وہ شرمندگی سے دوچار ہو رہے تھے۔

”شکریہ جیا! جیتی رہو میری بہن تم نے میری بہت بڑی مشکل آسان کر دی اب میں آفس اطمینان سے جاسکوں گا۔“ محسن بھائی نے اس کے سر پر دست شفقت رکھ کر کہا تو وہ پرسکون ہو کر مسکرا دی۔

☆☆☆

”یہ لو انیق! اپنی فائل سنبھالو جسے تم کل چھوڑ گئے تھے یہ فائل ویسے ہی میری دراز میں رکھی گئی۔ اب لاؤ وہ کاغذات مجھے دے دو جو تم جیا سے اپنا کانٹریکٹ ختم کرنے کے حوالے سے دینا چاہتے تھے۔“ اگلے دن انیق کے آفس آتے ہی محسن بھائی نے اس کی فائل اس کے سامنے رکھتے ہوئے اطمینان سے کہا تو وہ ایک منٹ کو حیرت سے گنگ رہ گیا۔

”کیا سوچنے لگے جلدی کرو مجھے تمہارے منفی جواب کا ساقی شدہ کاغذ چاہیے“ محسن بھائی نے نہایت سنجیدہ اور پرسکون لہجے میں کہا۔

”وہ محسن بھائی میں بہت شرمندہ ہوں اپنی اس حرکت پر پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا دراصل میں اپنے دوستوں کی باتوں میں آ گیا تھا بعد میں گھر جا کر مجھے احساس ہوا کہ میں نے کتنی گھٹیا بات کہی ہے آپ سے آپ صحیح کہہ رہے تھے میں غلطی پر تھا پلیز مجھے معاف کر دیجئے آج کے بعد میں رشتوں اور کاروبار کو الگ رکھوں گا بلیک میلنگ نہیں کروں گا بھلا یہ کانٹریکٹ اس رشتے کا نعم البدل ہو سکتا ہے جو میرے اور جیا کے بیچ ہے آئی ایم ریلی ویری سوری محسن بھائی پلیز مجھے معاف کر دیجئے مجھے آپ سے کانٹریکٹ پر سائن نہیں بلکہ اپنی غلطی کی معافی چاہیے کیا آپ مجھے معاف کریں گے؟“ اینق نے بات بنتی نہ دیکھ کر کمال ہو شیاری سے بات سنہالتے ہوئے شرمندگی کی بڑی عمدہ اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

”ضرور اگر تمہیں واقعی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو میں نے تمہیں معاف کیا لیکن یاد رکھو اینق! اس قسم کے رویے دلوں سے عزت اور محبت ختم کر دیتے ہیں اور نفرت کو جنم دیتے ہیں آئندہ محتاط رہنا۔“ محسن بھائی نے خوش ہو کر سنجیدگی سے اسے سمجھایا۔

”جی ضرور بہت شکریہ محسن بھائی! میں انشاء اللہ آج شام گھر بھی آؤں گا انکل آئی اور جیا سے بھی معذرت کروں گا۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے میں انہیں بتا دوں گا ہاں گھر تم ضرور آؤ جیا تمہاری امانت ہے اور میری اکلوتی بہن ہے پلیز اینق! جیا کو کوئی دکھ مت دینا وہ بہت حساس لڑکی ہے۔“ محسن بھائی نے سنجیدگی سے کہا۔

”جانتا ہوں محسن بھائی! انشاء اللہ اب آپ کو یا جیا کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی میں نے تو اپنی بزنس گریڈ سے دوستی بھی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور سوچا ہے کہ مجھ پر میری بیوی کا حق ہے اسے ہی اب گھر لانا چاہیے بس جیا کا بی اے مکمل ہو جائے میں تو آج ہی رخصتی کرانے کا خواہشمند ہوں مگر جیا کے تعلیم حاصل کرنے کے شوق کی وجہ سے انتظار کرنے پر مجبور ہوں۔“ اینق نے نرم اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”ہم بھی جیا کی ایجوکیشن کی وجہ سے رخصتی نہیں کر رہے ورنہ ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے بہر حال جیا کا شوق نامناسب بھی نہیں ہے اس لئے ہم نے اس کی خواہش کا احترام کرنا ضروری سمجھا ہے ویسے بھی وہ ابھی اتنی زیادہ عمر کی نہیں ہوئی کہ دیر سے رخصتی ہونے پر تشویش ہو جب اللہ

کو منظور ہو گا یہ فرض بھی ادا ہو جائے گا۔“

”انشاء اللہ او کے محسن بھائی! اب مجھے اجازت دیجئے ایک بار پھر آئی ایم سوری فار دیٹ“
اینق نے کھڑے ہو کر کہا۔

”اٹس آل رائٹ او کے اللہ حافظ۔“ محسن بھائی نے مسکراتے ہوئے اس سے مصافحہ کر کے اسے رخصت کیا۔ اینق کی معذرت سے سب کو اطمینان ہو گیا مگر جیا کا دل صاف نہ ہوا اب وہ باوجود کوشش کے اینق کو ایک انچ برابر بھی اپنے دل میں جگہ نہیں دے سکی تھی اسے اینق کی صورت سے چڑ اور سیرت سے نفرت ہو گئی تھی اسے اپنے نام کے ساتھ اس کا نام بُری طرح کھٹکنے لگا تھا یہ حقیقت یہ تصور ہی اس کے لیے سوہان روح تھا کہ اسے ساری زندگی اینق کی ہمراہی میں گزارنا ہو گی اینق نے سب کو اپنی باتوں اور قیمتی تحفوں سے پھر سے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا آج اینق کی برتھ ڈے تھی اس نے عطیہ بیگم سے جیا کو اپنے ساتھ باہر لے جانے کی اجازت طلب کی تو انہوں نے احمد حسن صاحب سے پوچھ کر اسے اجازت دے دی۔ شام کو وہ جیا کو لینے کے لیے ”احمد لاج“ پہنچ گیا جیا کو عطیہ بیگم نے بطور خاص تیار ہونے کا حکم دیا تھا جیا نے ان کی پسند کے مطابق کپڑے پہنے جیولری اور میک اپ سے خود کو آراستہ کیا میرون اور گولڈن امتزاج کے لباس میں گولڈن ہلکی سی جیولری پہنے وہ بے حد حسین اور دلنشین لگ رہی تھی۔ اس نے اپنا یہ روپ آئینے میں دیکھا تو ایک ہل کو حیا سے مسکرا دی مگر اگلے ہی پل خوف اور پریشانی کا سایہ اس کے چہرے پر لہرانے لگا وہ اینق کی بے باکیوں اور گستاخیوں سے واقف تھی آج وہ اس روپ میں اسے دیکھ کر کیسے باز رہ سکتا تھا وہ جتنا اس کی قربت سے الگ رہا تھا اتنا ہی اسے اینق کے قریب رہنے کا ہدایت نامہ مل رہا تھا اس نے آیت الکرسی اور چاروں قل پڑھ کر خود پر دم کر لیا۔

”جیا بیٹا! تیار ہو گئیں؟“ عطیہ بیگم اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

”جی ہو گئی۔“ اس نے اپنا براؤن کلر کا ہینڈ بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ماشاء اللہ آج تو میری بیٹی چودھویں کا چاند لگ رہی ہے۔“ عطیہ بیگم نے اس کی پیشانی

چوم کر کہا تو وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔

”امی! گرہن تو چودھویں کے چاند کو بھی لگ جاتا ہے۔“

”اللہ تمہیں نظر بد سے بچائے کیسی عجیب باتیں کر رہی ہو یہ پیکٹ رکھ لو اپنے بیگ میں تم

نے تو انیق کے لئے سالگرہ کا تحفہ نہیں خریدا اس کا انتظام بھی مجھے ہی کرنا پڑا پر فیوم ہے اس میں۔“
عطیہ بیگم نے ایک خوبصورت سا پیکٹ اسے دیتے ہوئے کہا پیکٹ اس نے لے کر ہینڈ بیگ میں رکھ لیا اور بیزار ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی تو عطیہ بیگم نے کہا۔

”یہاں بیٹھنے میں وقت مت ضائع کرو جاؤ انیق انتظار کر رہا ہے۔“

”امی! کیا میں اپنے آپ کو ضائع نہیں کر رہی؟“

”کیا بے ٹکی باتیں شروع کر دی ہیں تم نے دیکھو انیق نے خود کو تمہاری خاطر بدل لیا ہے اپنے رویے کی معافی مانگ چکا ہے وہ اب ہماری طرف سے کسی قسم کی اونچ نیچ نہیں ہونی چاہیے“
عطیہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔

”مگر نیچ لوگوں کا کیا بھروسہ کہ کب نیچ حرکتوں پر اتر آئیں۔“ اس کا جملہ معنی خیز اور تلخ تھا
عطیہ بیگم نے غصے سے اسے گھورا۔

”تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔“

”دماغ کا خراب ہونا نیت کے خراب ہونے سے کہیں بہتر ہے امی!“

”جیا! تم کیوں ہمیں پریشانی میں مبتلا کر رہی ہو جاؤ خدا کے واسطے اپنی نہیں تو ہماری عزت کا ہی کچھ خیال کر لو۔“ یہ احمد حسن صاحب کی آواز تھی وہ بھی اسے بلانے آئے تھے اتنی دیر جو ہو گئی تھی عطیہ بیگم کو اسے آنے کا کہہ کر بھیجا تھا جیا نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا اس کے محبت کرنے والے ابو کس قدر بدل گئے تھے ان کا انداز اور لہجہ انیق کے معاملے میں بہت سخت ہو گیا تھا انہیں اپنی لاڈلی بیٹی کے جذبات و احساسات کا بھی خیال نہیں رہا تھا وہ انہیں دیکھتے ہوئے دکھ سے بولی۔

”ابو! کیا میری عزت آپ کی عزت نہیں ہے؟“

”جیا! بحث مت کرو چلو جاؤ۔“ عطیہ بیگم نے درشتی سے کہا۔

”جاری ہوں مگر اتنا بتا دوں کہ اگر آپ اپنی اور میری عزت کو الگ الگ سمجھتے ہیں تو مجھے پہلے اپنی عزت کا خیال ہوگا۔“ جیا نے سنجیدہ لہجے میں کہا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی انیق گاڑی میں اس کا منتظر تھا۔

”ہیلو“ جیا کو اس کے سامنے اپنا موڈ خوشگوار بنا کر کہنا پڑا اس اداکاری میں خاصی ایکسپرٹ

ہو گئی تھی اب تو وہ۔

”ہیلو مائی ڈیئر وائف! ہاؤ آریو۔“ وہ خوشی سے چمک کر بولا۔

”فائن۔“ وہ یہ کہتے ہوئے اس کے برابر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

”تمہیں معلوم ہے آج میرا جنم دن ہے۔“ انیق نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کاش..... ختم دن ہوتا۔“ جیانی نے بے ساختہ کہا۔

”کیا کہا تم نے؟“ انیق گاڑی اسٹارٹ کر رہا تھا اس کی بات سمجھ نہ سکا اور پوچھا۔

”میں نے کہا کہ بہت خوبصورت دن ہے آج۔“

”تمہاری طرح“ وہ اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بولا اس کا چہرہ حیا سے تپ کر سرخ

ہو گیا وہ ہنس کر بولا۔

”مجھے دس کرو گی؟“

”پہلی برتھ ڈے ٹویو جنم دن مبارک ہو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے مبارکباد دی۔

”خالی مبارکباد میرا تحفہ کہاں ہے؟“ اس نے گاڑی سڑک پر ڈالتے ہوئے کہا۔ تو اس نے

بتایا۔

”میرے ہینڈ بیک میں ہے۔“

”جی نہیں میرے پہلو میں ہے۔“ انیق نے معنی خیز لہجے میں کہتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی

کمر کے گرد حائل کر کے اسے اپنے قریب کر لیا۔ وہ بری طرح شپٹا گئی اس کے تن بدن میں آگ

لگ گئی۔

”کیا کر رہے ہیں ڈرائیو پر دھیان دیں ایکسیڈنٹ ہو جائے گا۔“ وہ گھبرائی آواز میں بولی

تو اس نے ہنس کر نشتے سے چور لہجے میں کہا۔

”آج تو ہم سارا دھیان جیا پر ہی دیں گے بھلے ایکسیڈنٹ ہو جائے اپنی زندگی کے ساتھ

موت کو گلے لگانے کا مزہ ہی اور ہو گا۔“

”پلیز انیق! ہوش میں آئیں آپ روڈ پر سفر کر رہے ہیں۔“ وہ کوفت سے بولی۔

”میرے ہوش تو تم نے اڑا دیے ہیں اب مجھے پروا نہیں ہے کہ میں کہاں سفر کر رہا ہوں

میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ اس وقت تم میرے ساتھ ہو میری ہواور میں آج تم پر اپنی محبتوں کے

خزانے خالی کرنے کا پروگرام بنا کر تمہیں اپنے ساتھ لایا ہوں پہلے ہم اچھے سے ریلیٹورنٹ میں

ڈنر کریں گے ساگرہ کا ایک کانٹیں گے اس کے بعد ”اینق ولا“ جائیں گے۔“ وہ بہت سکون سے اپنا پروگرام بتا رہا تھا اور اس کا سکون غارت کرتا جا رہا تھا اسے بہت الجھن بے زاری اور کوفت ہو رہی تھی اینق نے پی سی میں ٹیبل بک کر رکھی تھی وہ جیا کو لے کر وہاں آ گیا ویٹر نے کیک سمیت ان کی آرڈر کردہ اشیاء ٹیبل پر سرورکریں اینق نے کیک کاٹا۔

”پہلی برتھ ڈے ٹویو۔“ جیا نے ہینڈ بیگ سے اس کا تحفہ نکال کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تو اینق نے شرارت اور شوخی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تحفہ میں ایک شرط پر قبول کروں گا اور وہ یہ کہ تم مجھے یہ کیک اپنے ہاتھ سے کھلاؤ۔“
 ”مم..... میں..... اینق! ہم گھر میں نہیں باہر بیٹھے ہیں اچھا نہیں لگتا۔“ وہ شپٹا کر بولی تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”گھر میں تو اچھا لگے گا نائس طے ہو گیا یہ کیک ہم ”اینق ولا“ پہنچ کر کھائیں گے میں کافی بتاؤں گا اور تم مجھے اپنے ہاتھ سے کیک کھلاؤ گی ٹھیک ہے نا۔“
 ”آپ کی فرمائش بھی عجیب ہوتی ہیں۔“ وہ پریشان لہجے میں بولی۔

”اچھا اب آرام سے ڈنر کرو میں ساری عجیب فرمائشیں اب گھر جا کر کروں گا۔“ اس نے ہنس کر کہا تو وہ بے دلی سے کھانا کھانے لگی اس کا ذہن اس کے ”ساری عجیب فرمائشیں“ والے جیلے میں اٹک کر رہ گیا تھا اسے کچھ کچھ اندازہ تو تھا کہ اینق جیسا شخص اس سے کس قسم کی فرمائشیں کر سکتا ہے۔

”خدا جانے میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے“ کھانے کے بعد وہ کیک پیک کر واکر ”اینق ولا“ کی جانب رواں دواں تھے جب جیا نے پریشانی سے سوچا۔

تم کس لیے ڈر رہی ہو کسی غیر مرد کے ساتھ تو نہیں جا رہیں یہ تمہارا شوہر ہے اور تم اس کے ساتھ اپنے والدین کی مرضی اور اجازت سے آئی ہو اس کے اندر سے آواز آئی تو اس نے قدرے سکون کا سانس لیا اور اینق کی طرف دیکھا وہ بہت خوشگوار موڈ میں گنگناتے ہوئے ڈرائیو کر رہا تھا جیا نے اس کے بارے میں دل میں سوچا۔

”بظاہر اچھا خاصا خوش شکل بندہ ہے یہ مگر کاش..... اس کا باطن بھی اچھا ہو جائے۔“
 ”آئیے مسز اینق اختر! مابدولت آپ کو آپ کے اس محل نما گھر میں خوش آمدید کہتے ہیں“

انیق نے انیق ولا میں گاڑی روک کر اس کی جانب آ کر گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

”تھینک یو۔“ وہ اپنا ہیڈ بیگ اٹھا کر مسکراتے ہوئے گاڑی سے اتر گئی۔

”آپ نے گھر کو بہت خوبصورت اور قیمتی اشیاء سے سجایا ہے۔“ جیانے اس کے ساتھ

ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”تم جیسی خوبصورت اور قیمتی شخصیت کے لیے یہ اہتمام بھی کم ہے۔“ انیق نے اس کے

قریب آ کر محو نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ باتیں خوب بناتے ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی مگر درحقیقت اسے انیق کی زبان

سے تعریفی کلمات سن کر ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی تھی مسکرانا اور اس کے ساتھ مثبت مکالمہ کرنا اس کی

مجبوری تھی۔

”اجی باتیں کیا ہم تو پلان بھی خوب بناتے ہیں۔“ وہ ہنس کر بولا۔

”پلان.....؟“ جیانے الجھن آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔

”آئی مین کافی میں بہت خوب بہت اچھی بناتا ہوں۔“ اس نے فوراً بات بنائی۔

”یہ تو کافی پی کر ہی بتایا جاسکتا ہے۔“ جیانے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اوکے تم یہاں بیٹھو میں کافی بنا کر لاتا ہوں تم کیک کا ٹٹا اور مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا اس

کے بعد میں تمہیں ”انیق ولا“ کی سیر کراؤں گا اپنا اور تمہارا بیڈ روم دکھاؤں گا۔ تم نے ایسا بیڈ روم

خواب میں بھی نہیں دیکھا ہوگا جیسا میں نے تمہارے لئے تیار کروایا ہے۔“

”اوکے میں ضرور دیکھوں گی مگر پہلے کافی یوں بھی بہت دیر ہو گئی ہے آپ امی ابو سے ایک

ڈیڑھ گھنٹے کا کہہ کر مجھے ساتھ لائے تھے اور اب تین گھنٹے ہو چکے ہیں وہ لوگ پریشان ہو رہے

ہوں گے۔“ جیانے ریسٹ وائچ پر ٹائم دیکھتے ہوئے کہا۔

نہیں ہوتے وہ لوگ پریشان تم کسی غیر مرد کے ساتھ تو نہیں آئیں اپنے شوہر کے ساتھ آئی

ہو ریلیکس ہو کر بیٹھو میں کافی بنا کر لاتا ہوں انیق نے اپنا کوٹ اتار کر صوفے پر پھیلتے ہوئے کہا۔

”اوکے۔“ وہ مسکراتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی اور انیق کچن کی طرف چلا گیا اچانک ہی جیا

کا ہاتھ انیق کے کوٹ پر پڑا اس نے یونہی سرگھا کر دیکھا اس کے کوٹ کی جیب میں سے خاکی

رنگ کا لفافہ باہر جھانک باہر تھا جیانے لفافہ ذرا سا پکڑ کر باہر نکالا تو اس پر اپنا نام دیکھ کر بُری طرح

ٹھک گئی اور جلدی سے لغافہ کھول کر دیکھا اس میں سے دو کاغذ لٹکے ایک جیا کا طلاق نامہ تھا جسے پڑھتے ہی اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی جسم ایک لمحے کو سن ہو گیا چہرہ آگ بن گیا اس نے بمشکل اپنا حوصلہ برقرار رکھتے ہوئے دوسرا کاغذ کھول کر دیکھا وہ انیق کا خط تھا جو اس نے محسن بھائی اور احمد حسن صاحب کے نام تحریر کیا تھا اس نے لکھا تھا۔

”میں نے جیا سے اپنا کانٹریکٹ ختم کر لیا ہے مگر اس کی نشانی آپ کو اور جیا کو ساری زندگی کی بدنامی سے دوچار کرنے کے لیے کافی ہے۔ لوگ آپ سے پوچھیں گے کہ جیا کی کوکھ میں پلنے والا بچہ کس کا ہے اسے رخصتی سے پہلے طلاق کیوں ہو گئی۔ ہاں لوگ بچہ دیکھ کر طلاق کا سبب جان جائیں گے۔ اور آپ سب کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ میری پلاننگ کامیاب رہی میں نے آپ سے کانٹریکٹ سائن نہ کرنے کا بدلہ لے لیا ہے۔ مانا کہ جیا بہت حسین و دلنشین ہے اور میں اس کے ذریعے مزید فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ مگر میرے لئے حسین لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ جس کا حسین ہونا اگر میرے لئے فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکا تو کسی اور کو بھی اس کا فائدہ کبھی نہیں پہنچ سکے گا۔ خود جیا کو بھی نہیں میں نے محسن صاحب کے انکار پر ہی ساری پلاننگ کر لی تھی۔ اب آپ جیا کی اور اس کی کوکھ میں سر اٹھانے والی نئی کونسل کی فکر کیجیے۔ مجھے اجازت دیجئے بائے بائے انیق اختر بقلم خود۔“

”یا اللہ! مجھے آبرو سے اس آبرو باختہ ماحول سے باہر نکلنے میں مدد دے۔“ جیا نے خط اور طلاق کا کاغذ لفافے میں رکھ کر اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لیا۔ اس کا حلق خشک ہو چکا تھا ہاتھ پاؤں اور پیشانی پسینے سے بھیگ گئی ہینڈ بیگ کندھے پر لٹکا کر وہ جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو اسی وقت انیق کافی کے گگ لئے چلا آیا وہ خوفزدہ اور گھبرائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”ارے یہ تم کہاں چل دیں؟“ انیق نے پوچھا۔

”بہت دیر ہو گئی ہے میں گھر جا رہی ہوں۔“

”فکر کیوں کرتی ہو تم کو آخر گھر ہی جانا ہے مگر میں تمہیں ایسے تھوڑی جانے دوں گا میرے ہاتھ کی بنی کافی تو پی لو اور ابھی تو میرا مقصد بھی پورا نہیں ہوا۔“ اس نے کافی سگ میز پر رکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا اور وہ اس کا مقصد بخوبی جان چکی تھی پوری جان سے کانپ اٹھی۔

”کیا مقصد؟“ وہ انجان بننے ہوئے بولی۔

”بتاتا ہوں ذرا بیڈروم میں تو چلو دیکھو تو سہی کہ تمہارا بیڈروم کیسا ہے؟“
”نہیں پھر سہی۔“

”پھر کہاں آئے گا یہ موقع یہ پہلا اور آخری موقع ہے جانم! آؤ میرے ساتھ۔“ انیق نے
بہت خطرناک لہجے میں کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
”اچھا پہلے کافی پی لیں۔“ جیانے اپنے حواس قابو میں کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔
”ضرور تمہیں چلے گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”آپ کے ہاتھ کی بنی کافی ہی کافی ہے۔“ جیانے میز پر سے کافی کا گم اٹھاتے ہوئے کہا
تو وہ ہنس پڑا اس کی نگاہوں سے نیکی شیطانیت اور ہوس جیا کو خوفزدہ اور پریشان کر رہی تھی مگر
اسے معلوم تھا کہ اس وقت اسے اپنے اعصاب اور حواس قابو میں رکھ کر حوصلے سے کام لے کر
ہمت اور جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہی اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔
”یا اللہ! میری مدد فرما میری مشکل آسان فرما۔“ جیانے دل میں دعا کی۔
”تم کافی پیو میں اپنا اسپیشل ڈرنک بنا لاؤں۔“ انیق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ضرور۔“ جیانے کافی کے گم کو منہ لگاتے ہوئے کہا مگر کافی سے اپنے لب تر نہیں ہونے
دیئے۔ اور اس کے ڈرائنگ روم سے باہر نکلتے ہی اس نے کافی کا گم میز پر رکھا۔ تو اچانک اس کی
نظر میز پر رکھی گاڑی کی چابی پر پڑی۔ اس نے دروازے کی جانب دیکھا کہ کہیں انیق آ تو نہیں رہا
اور فوراً گاڑی کی چابی اٹھا کر منشی میں چھپالی اور اپنا ہینڈ بیک کندھے پر لٹکا کر تیزی سے دروازے
کی جانب بڑھی۔ عین اسی وقت انیق ہاتھ میں دھسکی کی بوتل لئے دروازے سے داخل ہوا۔ تو اس
کے اوسان خطا ہو گئے۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ انیق نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”گھر۔“ وہ حلق سے تھوک نکلتے ہوئے بولی۔

”یہ بھی تو گھر ہے۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

”ہاں مگر مجھے اپنے گھر جانا ہے سب لوگ پریشان ہو رہے ہوں گے۔“

”چلی جانا میں بھی تمہیں یہاں ہمیشہ کے لیے تھوڑی لے کر آیا ہوں بس اپنی بے عزتی کا
بدلہ اپنی پیاس مٹانے کا ارادہ مجھے تمہیں یہاں روکے رکھنے پر مجبور کر رہا ہے خوبصورت لڑکیوں کی

کی تو نہیں ہے۔ میرے لئے مگر یہ بھی کبھی نہیں ہوا کہ کوئی حسین لڑکی میری دسترس میں آئے اور میری پیاس بجھائے بغیر ہی میری زندگی سے دور چلی جائے۔ وہ خطرناک اور ہوس پرست نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”یہ..... آ..... آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“ وہ گھبرا کر بولی۔

”سمجھاتا ہوں ذرا اپنے بیڈروم تک تو چلو۔“ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”نن..... نہیں مجھے گھر جانا ہے پھر سہی۔“ وہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

”پھر یہاں آنا نصیب نہیں ہو گا تمہیں تم یہاں پہلی اور آخری بار آئی ہو اس لئے میں تمہاری اس مدد کو یادگار بنادینا چاہتا ہوں تمہارے لئے تاکہ تمہیں ساری زندگی یاد رہے کہ تم یہاں آئیں تھیں اور کیا کچھ دے کر اور کیا کچھ لے کر یہاں سے واپس چلی گئی تھیں چلو جانم! دیر مت کرو پہلے ہی تم نے مجھے بہت انتظار کرایا ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے بولتے ہوئے اسے بیڈروم کی جانب کھینچتے ہوئے بولا تو اس نے جھکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

”تمہارا مجھ پر اب کوئی حق نہیں ہے تم مجھے طلاق دے چکے ہو اسی لئے تم میرے لئے حرام ہو مجھے چھوئے یا میرے قریب آنے کی کوشش مت کرنا ورنہ میں تمہیں جان سے مار دوں گی۔“ جیا نے خوف اور غصے سے چیختے ہوئے کہا تو وہ تسخرا نہ انداز میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

”چڑیا جتنی تو جان ہے تم میں تم مجھے جان سے مارو گی تم چڑیا.....!“

”چڑیا بھی اگر انتقام پر اتر آئے تو شیر کی کھال کھینچ ڈالتی ہے مسٹر انیق ہٹو میرے راستے سے۔“ وہ غصے سے سپاٹ لہجے میں بولی۔

”انیق..... اپنا شکار اتنی آسانی سے نہیں چھوڑتا طلاق کا کاغذ اگر تم نے پڑھ ہی لیا ہے تو میری منصوبہ بندی بھی مکمل ہو کر رہے گی تم پاک باز حسینہ بن کر یہاں سے نہیں جاؤ گی چلو اندر۔“ انیق نے شعلہ بار نظروں سے اسے گھورتے ہوئے بازو سے پکڑ کر آگے دھکیلا تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور نیچے گر گئی اس کا سر میز کے کونے سے بڑی زور سے ٹکرایا اور اس کے سر سے خون کا فوارہ ابل پڑا مگر اس وقت اسے اپنی جان سے زیادہ اپنی آن کی فکر تھی وہ تکلیف کی پراہ کیے بغیر

بھر سے تیزی سے اٹھی تو انیق نے اسے بالوں سے پکڑ لیا وہ تڑپ اٹھی۔
”چھوڑو مجھے۔“ وہ چلائی۔

”چھوڑ دوں گا پہلے اپنا مقصد تو پورا کر لوں۔“ وہ خباثت سے بولا۔

”تمہارا مقصد کبھی پورا نہیں ہوگا سمجھے تم۔“ جیا نے غصیلے لہجے میں کہا اور یکا یک اس کے ذہن میں ایک کوندہ سالہ کا اس نے گرم گرم کافی کا گنگ تیزی سے اٹھایا اور انیق کے منہ پر کافی پھینک کر وہاں سے بھاگ نکلی انیق تکلیف سے بلبلاتا اٹھا آنکھوں پر ہاتھ رکھے وہ دروازے کی طرف اسے گالیاں دیتا بڑھ رہا تھا کہ جیا نے دروازہ باہر سے لاک کر دیا اور تیزی سے بھاگتی ہوئی گیٹ کی طرف آئی گیٹ کھول کر اس کی گاڑی میں آ بیٹھی گاڑی کی چابی انیشن میں لگاتے ہی اس نے قرآنی آیات کا دور شروع کر دیا اور گاڑی ”انیق ولا“ کی حدود سے باہر نکال لائی اس کے چہرے پر خون کی لکیریں اٹھتی اور جتنی جارہی تھیں اس نے بیک مرر میں اپنا چہرہ دیکھا اور پوری اسپید سے گاڑی دیران سڑک پر دوڑانے لگی رات کے پونے گیارہ بج رہے تھے جب وہ انیق کے پرانے گھر ”رفیق ولا“ کے قریب پہنچی تو اس نے گاڑی وہیں روک دی اور ہارن بجا کر باہر نکل آئی وہاں سے گھر تک کا فیصلہ کچھ زیادہ تھا وہ بھاگتی ہوئی ”حسن لاج“ کی جانب رواں تھی اس کا سر چکر رہا تھا وہ بے ہوش ہونے کو تھی سر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں گیارہ بجے جب وہ گھر کے گیٹ پر پہنچی تو محسن بھائی باہر ہی کھڑے پریشانی کے عالم میں اس کی راہ دیکھ رہے تھے اسے لہو لہان چہرے کے ساتھ دیکھا تو ان کی حیرت اور پریشانی دیدنی تھی وہ کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو سب گھروالے اس کے پیچھے بھاگے اور لگے سوال جواب کرنے۔

”جیا! کیا ہوا؟“ عظمیٰ بھابی کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

”جیا! میری بچی یہ خون کیسا ہے کیا کوئی ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا؟“ عطیہ فکر مندی سے اس کی طرف لپکیں۔

”جیا! انیق کہاں ہے اسے زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں زندہ تو ہے نا وہ؟“ حسن صاحب نے پریشان لہجے میں سوال کیا۔

”وہ زندہ رہے یا مر جائے مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔“ وہ غصے سے بولی۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو تم سہاگ ہے وہ تمہارا؟“ عطیہ پریشان اور تند لہجے میں بولیں تو اس

نے زخمی نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”سہاگ ہے نہیں تھا۔“

”کیا کہیں خدا نخواستہ اینٹ ایکسیڈنٹ میں مرتونہیں گیا؟“ محسن بھائی بولے۔

”اس جیسے شخص کا مر جانا ہی بہتر ہے۔“

”کیا بک رہی ہو اینٹ تمہارا سہاگ ہے اور.....“

”اور سہاگ تو مان ہوتا ہے۔“ وہ عطیہ کی بات کاٹتے ہوئے تلخی سے بولی۔

”محافظ اور آن ہوتا ہے وہ آن کار کھولا ہوتا ہے اپنے ہی گھر میں نقب لگانے کا نہیں سوچتا

جبکہ آپ نے جس کو میرا سہاگ بتایا تھا وہ.....“

”کیا ہوا اسے تم پہیلیاں کیوں بچھو رہی ہو کئی گھنٹے سے ہم لوگ پریشان ہیں اصل بات بتاؤ

یہ تمہارا چہرہ کیوں خونم خون ہو رہا ہے چوٹ کہاں اور کیسے لگی ہے؟“ حسن صاحب نے سنجیدہ لہجے

میں پوچھا۔

”چہرے کا خون تو آپ کو نظر آ گیا ابو! جس چوٹ نے میرے دل کا خون کیا ہے وہ کیسے لگی

ہے خود ہی پڑھ لیجئے۔“ جیانا نے سپاٹ لہجے میں کہا اور ہینڈ بیگ میں سے طلاق نامہ اور اینٹ کا خط

نکال کر ان کی جانب بڑھا دیا سب کی نظریں ان کاغذات پر مرکوز ہو گئیں۔

”او گاڈ! یہ سب کیا ہے؟“ حسن صاحب نے دونوں کاغذات دیکھے اور پڑھتے ہی بے

اختیار صدمے سے دوچار ہوتے ہوئے کہا کاغذات ان کے ہاتھوں سے پھسل کر نیچے گر گئے اور وہ

جیانا کے خون آلود اور بچکے ہوئے چہرے پر دکھ اور بے بسی سے ہڈ نگاہ ڈال کر اپنے کمرے کی جانب

چلے گئے۔

”یا اللہ! یہ کیا ہو گیا میری بچی کے ساتھ اسے کس جرم کی سزا ملی ہے۔“ عطیہ بیگم نے جونہی

کاغذات اٹھا کر پڑھے تو ڈکھ سے بولیں۔

”آپ کے حد سے زیادہ اعتبار کی سزا ملی ہے مجھے ہماری طرف سے تو کوئی اونچ نیچ نہیں

ہوئی البتہ نیچ نیچ رکھنے والا نیچ حرکت کر گیا میں نے کہا تھا نا کہ مجھے مت بھیجیں اس شخص کے ساتھ

میں آپ لوگوں کے حکم پر اس کے ساتھ گئی تھی اور ساتھ ہی عزت بھی گئی اور میری زندگی بھی

زبانوں کی زد پر آ کر کھڑی ہوئی ہے آپ کی بیٹی کو رخصتی سے پہلے طلاق کیوں ہو گئی کیا جواب

دیں گے آپ لوگوں کو؟“ جیانے بھیکتے اور زخمی لہجے میں کہا اور اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا عطیہ دل تھام کر رہ گئیں آنسو ان کے رخساروں پر پھسل رہے تھے عظمیٰ بھابی اور محسن بھائی وہ کاغذات دیکھ چکے تھے اور شاک کی سی حالت میں کھڑے تھے۔

”عظمیٰ بیٹا! دیکھ اسے اس کا چہرہ خون سے بھرا ہے اس کی مرہم پٹی کر دو پوچھو تو اس سے کہ کیا ہوا ہے اس کے ساتھ کہیں وہ کم بخت اپنے پلان میں کامیاب تو نہیں ہو گیا جیا کی باتوں سے تو..... ایسا ہی لگ رہا ہے جاؤ بیٹا پوچھو اس سے وہ تمہاری بات بہت مانتی اور سختی ہے۔“ عطیہ بیگم نے روتے ہوئے عظمیٰ بھابی سے کہا۔

”کاش..... ہم نے بھی اس کی کوئی بات مانی یا سنی ہوتی۔“ عظمیٰ بھابی نے دل میں کہا اور انہیں ”جی اچھا“ کہہ کر جیا کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

”میں زندہ نہیں چھوڑوں گا انہی کو اس نے میری معصوم بہن کی زندگی برباد کی ہے میں اسے برباد کر دوں گا۔“ محسن بھائی غصے اور جوش سے بولے۔

”نہیں بیٹا! ایسا کچھ مت کرنا ساری دنیا میں تماشا بن جائیں گے ہم ساری بات سامنے آ جائے گی ہم اللہ سے انصاف مانگیں گے قانون کے در سے اسے سزا دلوائیں گے مگر جوش سے نہیں ہوش سے کام لے کر۔“ عطیہ بیگم نے انہیں ”کول ڈاؤن“ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا وہ ڈر رہی تھیں کہ کہیں بھائی کا غیرت مند اور جوان خون جوش میں آ کر کوئی انتہائی قدم نہ اٹھا بیٹھے ان کے لئے توجیا کی طلاق کا صدمہ ہی بہت تھا۔

جیانے عظمیٰ بھابی کے کہنے پر بھی اپنے کمرے کا دروازہ نہیں کھولا اور رات بھر تکیے میں منہ دیئے وہ اپنی قسمت کی ستم ظریفی پر اٹک رہی تھی۔ صبح تک بخار نے اسے بُری طرح جکڑ لیا تھا وہ ہنوز اپنے کمرے میں بندھی ہمت کر کے اس نے اپنا لباس تبدیل کیا اور پھر سے بستر پر ڈھے گئی روتے رہنے سے اس کی آنکھیں بھی سوچ گئیں تھیں وہ بے دم سی نڈھال اور بے حال سی تکیے پر سر رکھے لیٹی تھی کہ اس کے کمرے کا دروازہ پھر سے بجنے لگا ساتھ ہی عطیہ اور عظمیٰ بھابی کی آواز بھی سنائی دی۔

”جیا! دروازہ کھولو پلیز میری بہن دروازہ کھولو جیا!“ عظمیٰ بھابی نے بہت منت اور محبت بھرے لہجے میں کہا وہ بے حس و حرکت لیٹی رہی۔

”جیا بیٹا! دروازہ کھولو۔“ عطیہ بیگم نے آواز دے کر کہا اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔

”میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے کہیں جیا نے اپنے آپ کو نقصان نہ پہنچا لیا ہو۔“ عطیہ بیگم نے روتے ہوئے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

”نہیں امی! جیا ایسی کم ہمت اور بزدل لڑکی نہیں ہے وہ بہت بہادر اور حوصلہ مند لڑکی ہے مگر اس صدمے سے سنبھلنے میں اسے کچھ وقت تو چاہیے۔“ عظمیٰ بھابی نے کہا جو جیا کی بھابی ہی نہیں تھیں بلکہ اس کی بہترین دوست اور مزاج شناس بھی تھیں اور اس سے بے حد پیار کرتی تھیں۔

”جیا بیٹا! یوں کب تک بند رہو گی دروازہ کھولو بیٹی۔“ حسن صاحب کی آواز جیا کے کانوں میں پڑی تو اس نے سوچا۔

”زندگی کا دروازہ تو آپ کی بیٹی پر بند ہو گیا ہے اب کون سا دروازہ کھولے آپ کی بیٹی؟“

”جیا! میری بہن دروازہ کھولو تمہیں ہماری قسم پلیز۔“ محسن بھائی کی آواز اس کے کانوں میں آئی تو اس نے تلخی سے سوچا۔

”قسم..... بہت خوبصورت طریقہ ہے اموشنل (جذباتی) بلیک میلنگ کا مگر قسم کی ہر قسم سے میرا اعتبار اٹھ گیا ہے بھائی جان!“

”جیا پلیز! دروازہ کھول دو۔“ عظمیٰ بھابی نے پھر سے اسے پکار کر کہا۔

”کہیں اس نے خود کو مار نہ لیا ہو۔“ حسن صاحب نے خدشہ ظاہر کیا۔

”جسے مارنے والے موجود ہوں اور جو پہلے سے ہی مر چکا ہو وہ اب کیا خود کو مارے گا ابو؟“

جیا نے دل میں انہیں مخاطب کر کے کہا۔

”نہیں ابو! جیا بہت بہادر ہے وہ ایسا کچھ نہیں کر سکتی اور میں نے خود تو ڈیڑھ پہلے اس کے کمرے کی لائٹ جلتی دیکھی تھی۔ وہ ضرور ہم سب سے ناراض ہے۔ ہم نے اسے انیت کے ساتھ زبردستی بھیجا تھا نا۔“ عظمیٰ بھابی نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہاں یہ احساس جرم اور احساس ندامت مجھے ساری زندگی اپنی بیٹی سے نظریں نہیں ملانے دے گا۔“ حسن صاحب نے شکستہ لہجے میں کہا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ جیا بیٹی ہے آپ کی آپ نے تو اس کا بہتر ہی سوچا تھا۔“

عطیہ بیگم نے کہا۔

”میں نے انیق کی کمزوریوں اور خامیوں کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ جیا نے میری رائے کا احترام کیا میرے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا مگر اسے کیا ملا اس شخص نے تو ساری زندگی کے لئے ہمارا سر جھکا دیا ہے اب اگر جیا بیٹی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے جیسے چاہیں جس سے چاہیں بیاہ دیں ہم نے غلطی کی ہے تو ہمیں اس کا اعتراف نہیں کرنا چاہیے اور ازالہ بھی آخر بیٹی بھی انسان ہوتی ہے اس کی بھی عزت ہے خواہشیں سوچیں جذبات اور احساسات ہوتے ہیں میں نے اس کے احساسات کو نظر انداز کیے رکھا خدا میری بچی پر اپنا کرم کرے اسے حوصلہ اور صبر دے میں نے بہت بُرا کیا اپنی بچی کے ساتھ میں رفیق اور انیق کو چھوڑ دوں گا نہیں دوست ہو کر دشمنی کی ہے انہوں نے۔“ حسن صاحب نے بھیکتی آواز میں کہا تو محسن بھائی بولے۔

”ابو! ہم ان باپ بیٹا کو سزا ضرور دلوائیں گے لیکن قانون کے ذریعے ان کے دوسرے جرائم ہی بہت ہیں ساری زندگی جیل میں گزارنے کے لئے۔“

”جیا! دروازہ کھولو پلیز۔“ عظمیٰ بھابی نے دوبارہ کہا تو دروازہ چند لمحوں بعد کھل گیا اور جو جیا ان سب کی نظروں کے سامنے کھڑی تھی اسے دیکھ کر سب کی روح کانپ گئی۔ دکھ تکلیف درد کرب اذیت اور اہانت کے روح فرسا تاثرات اس کے چہرے کا حصہ بنے ہوئے تھے غزالی آنکھیں سرخ اور سو جی ہوئی تھیں بال بے ترتیبی سے کھڑے تھے چہرہ زرد ہو رہا تھا اس میں کھڑے ہونے کی تاب نہیں سر چکر رہا تھا آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں حلق خشک تھا آنکھیں تر تھیں۔

”اب کیا چاہتے ہیں آپ لوگ مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے مستقبل تو تاریک ہو ہی چکا ہے۔“ جیا نے زخمی لہجے میں کہا۔

”جیا! میری بچی۔“ عطیہ دکھ سے روتے ہوئے بولیں۔

”کچھ نہیں لگتی میں آپ کی بچوں کے ساتھ کوئی ایسا سلوک کرتا ہے جیسا آپ نے میرے ساتھ کیا ہے آپ نے اس گھٹیا اور دھوکے باز شخص کی وجہ سے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا اور اس کا ہاتھ..... اس..... گھر کی..... عزت کی طرف..... اٹھ گیا بہت..... بھروسہ تھا نہ آپ کو اس پر..... اب جانیے اس سے..... پوچھیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ میں نے تو..... آخری وقت تک آپ کے بنائے ہوئے رشتے کو بھانے کی کوشش کی تھی۔“ وہ کانپتی اور آنسوؤں بھری آواز میں بولی سب کے سرندامت سے جھکے ہوئے تھے سوائے عظمیٰ بھابی کے انہوں نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے

پر زنی سے ہاتھ پھیرا اور اسے کمرے میں لے گئیں۔ عطیہ بیگم لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں حسن صاحب بھی نمناک آنکھوں سے جیا کے کمرے کی طرف دیکھے جا رہے تھے اور عظمیٰ بھابی اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

”جیا! مجھے نہیں بتاؤ گی کہ کیا ہوا تھا تم ٹھیک تو ہونا؟ میرا مطلب ہے کہ..... انیق اپنے منصوبے میں..... کامیاب تو نہیں ہونا؟“

”بھابی! اگر ایسا..... ہوتا تو آپ کو اس کمرے سے میری لاش ملتی میں اتنی ذلت کے بعد ایک منٹ بھی زندہ رہنا قبول نہ کرتی..... اور تماشا تو میں اب بھی بن گئی ہوں اب جو طرح طرح کے سوالات انھیں گے خاندان اور محلے میں جو بدنامی ہوگی رخصتی سے پہلے طلاق کیوں ہو گئی مجھے؟ لوگ کیا کیا..... افسانے گھڑیں گے کس کس طرح سے..... مجھے ڈکس کیا جائے گا وہ میرے لئے اذیت اور ذلت کا باعث ہی تو بنے گا۔“ وہ روتے ہوئے دکھی لہجے میں بولی۔

”جیا! حوصلہ کرو میری بہن لوگوں کی باتوں کی پروا مت کرنا لوگوں کو تو باتیں بنانے افسانے گھڑنے کی عادت ہوتی ہے چند دن بعد انہیں کوئی اور موضوع مل جائے گا بھول جائیں گے وہ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟“ عظمیٰ بھابی نے اسے اپنے ساتھ لگا کر تھپکتے ہوئے کہا۔

”مگر..... میں..... ساری زندگی نہیں بھول پاؤں گی۔“

”جیا! وہ گھٹیا شخص تمہارے قابل ہی نہیں تھا تم دل چھوٹا مت کرو انشاء اللہ تمہیں بہت اچھا سچا اور پیار کرنے والا ہمسفر ضرور ملے گا جو صحیح معنوں میں تمہاری قدر کرنا جانتا ہوگا۔“ عظمیٰ بھابی نے اسے روشن مستقبل کی کرن دکھاتے ہوئے پیار سے سمجھایا تو اس نے روتے ہوئے کہا۔

”نہیں بھابی! بہت ہو گیا اب میں کسی کو بھی اپنی زندگی کا مالک نہیں بنے دوں گی میرے لئے ایک تجربہ ہی بہت ہے پلیز آج کے بعد مجھ سے شادی کے متعلق بات مت کیجئے گا۔“

”اچھا اٹھو منہ ہاتھ دھو لو میں تمہارے لئے ناشتہ لے کر آتی ہوں تم نے رات بھی کچھ نہیں کھایا تھا تمہیں تو بہت تیز بخار ہے میں ڈاکٹر انکل کو بھی فون کر دیتی ہوں وہ تمہارا چیک اپ کرتے جائیں گے“ عظمیٰ بھابی نے اس کا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا تو وہ خاموشی سے منہ ہاتھ دھونے کے لئے اٹھ گئی۔

”دل کے ارمان ہوئے خاک خوشی روٹھ گئی

زندگی نے عجب چال چلی میرے ساتھ“

اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا جہاں سورج پوری آب و تاب کے ساتھ کرہ ارض پر اپنی کرنیں بکھیر رہا تھا۔

میری زندگی کے سورج کو شب کی چادر پہنا دی گئی ہے اجالا آئے تو کہاں سے آئے کیا کبھی میری زندگی میں پھر سے کوئی روشن اور خوشیوں بھرا سورج طلوع ہو گا جیسا نے افسردگی سے سوچا۔
”جیا! کیا سوچ رہی ہو؟“ عظمیٰ بھابی کی آواز پر اس کی سوچیں منتشر ہو گئیں اس نے طویل سانس ہونٹوں سے خارج کر کے اداسی سے کہا۔

”یہی کہ آخر یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں ہوا میں نے کیا بگاڑا تھا اس کا کبھی آنکھوں میں خوشی کے خواب سجائے تو کبھی غم کے آنسو بھر دیئے کبھی پیار کیا تو کبھی اعتبار کی دجیاں بکھیر کر رکھ دیں اتنی منافقت آخر کیسے کرتا رہا وہ میرے ساتھ اس قدر تذلیل اتنی تعجیب کیوں کیا اس نے میرے ساتھ یہ سلوک میں ہی کیوں تماشا بنی؟ مجرم وہ تھا اور سزا مجھے مل رہی ہے کام اس نے بُرا کیا اور نام میرا بدنام ہو رہا ہے آخر کیوں بھابی؟ کیا قصور تھا میرا؟ میں جو سب کے لیے باعث افتخار تھی آج ان ہی سب کی نظروں میں بے اعتبار اور بدکردار بن گئی ہوں کیوں آخر میرا قصور کیا ہے بھابی بتائیں۔“ جیا بولتے بولتے بے بسی دکھ اور کرب سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی عظمیٰ بھابی بھی آبدیدہ ہو گئیں اور اسے اپنے سینے سے لگا لیا اس کے ان سوالوں کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا وہ اسے بہلانے کی پوری کوشش کرتیں عثمان کے ساتھ وہ کچھ وقت گزار لیتی مگر باقی کا وقت وہ گم صم اپنے کمرے میں بند رہنے لگی۔ امی ابو اور محسن بھائی اس کی صورت دیکھنے کو ترس جاتے وہ سامنے آ بھی جاتی تو انہیں سلام کرنے کے علاوہ کچھ نہ بولتی اس کے لبوں پر چپ کی مہر لگ جاتی وہ ان سے ناراض تھی اپنی قسمت سے ناراض تھی عطیہ اور حسن صاحب تو لوگوں کے سامنے وضاحتیں پیش کرتے کرتے تنگ آ گئے تھے ہر کوئی اس کی طلاق کا سبب جانے چلا آتا نیت نئی کہانیاں گھڑی جاتیں انیق کے خاندان کی بلیقہس چچی نے تو جیسا کے کردار کو مٹھکوک قرار دے دیا تھا اور خاندان میں یہ بات پھیلا دی تھی کہ ”جیا کا غیر لڑکوں سے یا رانہ تھا ہر ایرے غیرے سے بے تکلفی تھی جس کی وجہ سے انیق نے غیرت میں آ کر اسے طلاق دے دی رخصتی سے پہلے طلاق

ہونا ڈوب مرنے کے مترادف ہے مگر یہ جیا بیگم تو پتا نہیں کسی ڈھیٹ مٹی کی بنی ہیں پہلے تو لڑکوں کے ساتھ ہونٹنگ کرتی رہی اب خود کو معصوم ظاہر کرنے کے چکر میں گھر میں اپنے کمرے میں بند ہو گئی ہے۔ اللہ بچائے ایسی لڑکیوں سے شکر ہے کہ انیق نے رخصتی سے پہلے ہی طلاق دے دی ارے جس لڑکی کے شادی سے پہلے یہ لچھن تھے وہ شادی کے بعد کیا گلگھلاتی تو بہ تو بہ۔“ بلقیس چچی چونکہ جیا اور انیق دونوں کے خاندانوں کے دور پرے کی رشتے دار تھیں لہذا انیق نے جیا کے خلاف کہانیاں بنا کر انہیں اچھی طرح استعمال کیا تھا وہ جیا کو بدنام کر کے خوش ہو رہا تھا اپنی بے عزتی اور منصوبے میں ناکامی کا بدلہ لے رہا تھا۔ عطیہ بیگم اور حسن صاحب نے تو ایک آدھ بار ہی بلقیس چچی سے ملاقات کی تھی وہ اتنے دور کی ہم برادری ہونے والی رشتے دار سے زیادہ تعلقات رکھنے کے حق میں نہیں تھے یہی وجہ تھی کہ وہ اس کے گھر کبھی نہ گئے مگر انیق چونکہ بڑھ گیا تھا اور ان کے خاندان میں وہی حیا کو بدنام کرنے کا فریضہ انجام دے رہی تھیں عظمیٰ بھابی کا خیال تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی انیق سے کرنا چاہ رہی ہیں اسی لئے انیق کا کہا مان رہی ہیں۔

☆☆☆

”جیا! تمہارا فون ہے۔“ عظمیٰ بھابی نے اسے کارڈ لیس دیتے ہوئے کہا۔

”ہیلو۔“ جیا نے فون کان سے لگایا تو دوسری جانب سے انیق کی آواز ابھری۔

”ہیلو ڈارلنگ! کیا حال ہے سوگ منایا جا رہا ہے مناؤ خوب مناؤ ابھی تو تمہیں اپنے چہرے کی خوبصورتی کے ماند پڑ جانے کا سوگ بھی منانا ہے تم نے میرے چہرے پر کافی پھینکی تھی مگر میں تمہارے خوبصورت چہرے پر تیزاب پھینک کر اس کی ساری خوبصورتی جلا کر رکھ کر دوں گا۔“

”پہلے کی طرح انشاء اللہ تم اب بھی اپنے ناپاک منصوبے میں ناکام رہو گے مسٹر انیق اور ہاں اگر مجھے یا میرے گھر والوں کو کسی بھی قسم کا نقصان پہنچا تو اس کے ذمہ دار تم ہو گے اور تمہارے ڈیڈ ہوں گے یہ بات میں نے پولیس کو پہلے ہی تمہارے خط کی فوٹو کاپی سمیت پہنچا دی ہے اور تمہاری یہ دمکلی آمیز فون کال بھی ریکارڈ ہو چکی ہے مسٹر انیق! اب اگر تم نے مزید کوئی گھٹیا حرکت کی تو تم جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیئے جاؤ گے سمجھ تم۔“ جیا نے نہایت پُر اعتماد اور سپاٹ لہجے میں کہا۔

”تم..... تم ایسا نہیں کر سکتیں دیکھ لوں گا میں تمہیں اور تمہارے قانون کو انیق پر ہاتھ ڈالنا

آسان کام نہیں ہے۔“ وہ بوکھلا کر بولا۔

”خوش فہمی ہے تمہاری۔“ وہ تسخرانہ ہنسی جھٹتے ہوئے بولی۔

”تم پر ہاتھ ڈالنا بہت آسان کام ہے کیونکہ تم اپنے جرائم کے ثبوت خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر اپنی زبان سے بول کر دوسروں کے پاس محفوظ کروا دیتے ہو چہ چہ احمق۔“

”تم.....“ انیق کی زبان سے بوکھلاہٹ میں بس یہی نکل سکا اور اس نے لائن کاٹ دی جیسا نے مسکراتے ہوئے ریسور کریڈل پر رکھ دیا عظمیٰ بھابی جو پاس کھڑی اس کی گھنگھوسن رہی تھیں بے تابی سے بولیں۔

”انیق تھا کیا کہہ رہا تھا؟ فون تو کسی لڑکی نے کیا تھا۔“

”لڑکیوں میں رہتے رہتے اسے لڑکی کی آواز نکالنا بھی آ گیا ہے مجھے دھمکی دے رہا تھا کہ تمہارے چہرے پر حیرت اب پھینک دوں گا۔“

”یا اللہ خیر! تو وہ تم سے کافی پیچھے کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔“ عظمیٰ بھابی نے پریشان ہو کر کہا جیسا انہیں اس روز کی ہر بات حرف بہ حرف بتا چکی تھی اس لئے انہیں فوراً یہی خیال آیا۔

”ہاں۔“ وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

”لیکن تم نے جو جواب اسے دیا ہے وہ.....“

”کسی حد تک درست ہے اور اس جیسے بزدل اور کمینے شخص کو ایسا ہی جواب دینا چاہیئے دیکھتی ہوں کہ کیسے وہ میرا چہرہ جھلسانے کی جرات کرے گا۔“ جیانی نے ان کی بات کاٹ کر کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

”ویری گڈ یہ ہوئی نا بات بس اب تم پہلے جیسی پر احماد اور زندہ دل پھر سے بن جاؤ۔“

”پہلے جیسی۔“ اس نے تلخی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں اب پہلے جیسی نہیں رہی بھابی! اگر ہوتی تو لوگ مجھے اس کا احساس ہرگز نہ دلاتے میں تو اب ایک معیوب بُرج اور بدکردار لڑکی ہوں ان کی نظروں میں۔“

”جیسا تم لوگوں کی باتوں اور نظروں کی پروا مت کرو ورنہ تمہارا جینا مشکل ہو جائے گا۔“ عظمیٰ بھابی نے رسانیت سے اسے سمجھایا۔

”میں تو پہلے بھی آسان نہیں تھا بھابی۔“

”تو کیا تم انیق جیسے شخص کے لیے ساری زندگی خراب کر لو گی؟“

”بھابی! اب اس شخص کا میری زندگی میں کوئی گز نہیں ہے اس نے میری جتنی زندگی برباد کرنی تھی کر چکا میں اپنی باقی کی زندگی اپنے لئے گزاروں گی میں اُن لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو ایک شخص کی بے وفائی اور بے حسی کو اپنی ساری زندگی پر محیط کر لیتے ہیں۔“ اس نے مدِ عزم لہجے میں کہا۔

”تو تم کیا کرو گی تمہارا بی اے کا رزلٹ آج کل میں آنے والا ہے۔“

”میں بی ایڈ کروں گی علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے تھرو اور اس کے بعد ایم اے اکنامکس کروں گی کمپیوٹر تو بھائی جان نے مجھے سکھایا دیا ہے میں باقاعدہ کمپیوٹر کورس بھی کروں گی تاکہ سمنڈل سکے اور آگے کام آ سکے مجھے اب شادی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں ہے۔“ جیانے نہایت سنجیدگی سے انہیں اپنے مستقبل کے عزائم سے آگاہ کیا۔

”ہوں..... باقی تو ٹھیک ہے لیکن یہ شادی نہ کرنے والی بات مناسب نہیں ہے کیونکہ ہمارے معاشرے میں مرد کے سہارے کے بغیر عورت بہت کمزور ادھوری اور غیر محفوظ تصور کی جاتی ہے۔“ عظمیٰ بھابی نے سنجیدگی سے کہا۔

”عظمیٰ صحیح کہہ رہی ہے شادی تو بہر حال تم کو کرنا ہی ہو گی تمہارے لئے رشتوں کی کمی نہیں ہے۔ اب بھی دو تین رشتے آئے ہیں۔ ایک شادی کے ٹوٹ جانے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ دوسری شادی نہ کی جائے۔“ عطیہ بیگم بھی عظمیٰ بھابی کی بات سن کر وہیں چلی آئیں اور اسے بتانے سمجھانے لگیں۔

”امی! میں اگر آپ پر بوجھ ہوں تو یہاں سے چلی جاتی ہوں۔“

”یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟“

”میں اب ایسی ہی باتیں کروں گی آپ اپنی اکلوتی بیٹی کو ابھی سے اپنے لئے مصیبت سمجھنے لگیں ایک شادی کرا کے دیکھ لیا ناں انجام ابھی بھی آپ کے ارمان پورے نہیں ہوئے۔“ جیانے غصے سے ہاتھ مسلتے ہوئے کہا۔

”جیا! یہ تم کس لہجے میں اپنی ماں سے بات کر رہی ہو؟“ حسن صاحب کی سخت اور تیز آواز نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔

”ابو! ابھی میری عدت بھی پوری نہیں ہوئی اور آپ لوگ مجھے پھر سے کسی انیق کے پلے باندھنے کا سوچنے لگے میری بھی زندگی ہے اپنی سوچ اور اپنے مقاصد بھی ہیں میں شادی نہیں کروں گی اور اگر آج کے بعد مجھ سے کسی نے دوبارہ شادی کی بات کی تو یاد رکھیے گا کہ میں یہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔“ جیانا نے زخمی اور خطرناک لہجے میں جواب دیا اور اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی حسن صاحب اور عطیہ بیگم تو ہکا بکارہ گئے۔

☆☆☆

وقت کی رفتار تیزی سے آگے بڑھنے لگی جیانا نے بی اے بہت اچھے نمبروں سے پاس کرنے کے بعد گھر بیٹھ کر بی بی ایڈ کے امتحان کی تیاری شروع کر دی اس عرصے میں بھی اس کے رشتے آتے رہے اور امی ابو اس کی گھر چھوڑ کر چلے جانے کی دھمکی کی وجہ سے انکار کرتے رہے اور ویسے بھی وہ چاہتے تھے کہ وہ خود کو انیق کے بعد کسی اور کے بارے میں سوچنے سمجھنے کے لیے تیار کر لے اپنی تعلیم مکمل کر لے اس نے بی ایڈ بھی اعلیٰ نمبروں سے پاس کر لیا اور اب وہ ایم اے اکناکس کی تیاری میں لگ گئی اس کا بیشتر وقت یونیورسٹی اور گھر میں اپنی تعلیم پر توجہ دیتے گزرتا امور خانہ داری میں وہ خاصی مہارت حاصل کر چکی تھی کمپیوٹر کورس بھی کر چکی تھی اور اب تو کمپیوٹر اس کا دوست بن چکا تھا اس کی انگلیاں کی بورڈ پر بڑی تیزی اور مہارت سے حرکت کرتی رہتی تھیں گھر میں عظمیٰ بھابی اپنے بیٹے عثمان کے لئے اس عرصے میں ایک پیاری سی بہن کا اضافہ کر چکی تھیں جیانا کے رشتے اب بھی آ رہے تھے خاندان سے باہر سے بھی اور خاندان سے بھی کیونکہ وہ خوبصورت اور تعلیم یافتہ تھی پرکشش اور ملنسار تھی اس لئے رشتے ضرور آتے مگر ان میں سے کسی شخص نے دوسری شادی کرنی ہوتی کسی کی عمر جیانا سے دو گنی ہوتی تو کوئی تین چار بچوں کا باپ ہوتا جو کنوارا اور مناسب رشتہ آتا وہ جیانا کی طلاق کے متعلق طرح طرح کے سوال پوچھتا تھا امی ابوننگ آچکے تھے اس ارے سلسلے سے مگر انہیں بیٹی بھی بیاہنی تھی انہیں کوئی مناسب رشتہ نہ مل رہا تھا نہ ہی جیانا شادی کے لئے تیار ہو رہی تھی ان دنوں جب جیانا کے فائل ایئر ایگزامز شروع ہونے والے تھے تب اس کے لئے ایک بہت اچھا رشتہ آیا لڑکا محسن بھائی کے انڈر کام کرتا تھا اس کے والد کی جائیداد تو زیادہ نہ تھی مگر وہ بہت شریف النفس انسان تھے ان کے بیٹے شعیب نے جیانا کو محسن بھائی کے ساتھ دو چار دفعہ آتے جاتے دیکھا تھا بس وہ اس کی خوبصورتی سادگی مصومیت اور حیا بارگاہوں کا دل ہی دل

میں دیوانہ ہو گیا پہلے اس نے اپنے گھر والوں کو منایا پھر محسن بھائی سے بڑے طریقے سے بات کی محسن بھائی چونکہ تین چار سال سے اسے اس کے کام کو جانتے تھے۔ لہذا انہوں نے بخوشی اسے والدین کے ساتھ اپنے گھر آنے کی دعوت دے ڈالی گھر میں امی ابو اور بھابی کو بھی شعیب کے متعلق بتا دیا عظمیٰ بھابی نے جیا کو سمجھا دیا اور ان کے بہت اصرار پر بہت فٹیں کرنے پر وہ شعیب کی فیملی سے ملنے پر رضامند ہوئی مگر اس کی شرط وہی تھی کہ ان لوگوں کو اس کی طلاق کے متعلق پہلے ہی بتا دیا جائے سو ایسا ہی ہوا شعیب اپنی والدہ والدہ اور بہن کے ساتھ ”حسن لاج“ کے ڈرائنگ روم میں براجمان تھا جب حسن صاحب نے یہ بات ان کے گوش گزار کر دی ایک لمحے کو تو وہ سب خاموش ہو گئے پھر شفیق صاحب شعیب کے والد نے کہا۔

”بھائی صاحب ایہ حادثے اور سانحے تو زندگی میں آتے رہتے ہیں جو جس کے مقدر میں ہوتا ہے وہ اسے مل جاتا ہے آپ سوچ لیجئے گا ہم انشاء اللہ دوبارہ حاضر ہو جائیں گے۔“ اور یوں یہ ملاقات اطمینان بخش کلمات پر ختم ہو گئی گھر میں سبھی خوش تھے شعیب کے گھر والوں نے کھلے دل سے جیا کی طلاق کے واقعے کو قبول کیا اور قابل اعتراض بات نہیں کہی۔ حسن صاحب تو یہ رشتہ قبول کرنے کے لئے تیار تھے جیا خاموش تھی تین دن بعد شعیب کی والدہ اور بہن دوبارہ ”حسن لاج“ میں موجود تھیں۔ عظمیٰ بھابی اور عطیہ بیگم نے انہیں بہت گرجوئی سے ڈرائنگ روم میں بٹھایا چائے پر خوب اہتمام کیا گیا شعیب کی والدہ سر شفیق جیا کو بہت عجیب انداز میں دیکھ رہی تھیں ان کا گفتگو کا انداز بھی کچھ کھوجتا ہوا تھا جسے جیا نے فوراً بھانپ لیا اور چائے کا کپ لے کر ایک طرف صوفے پر بیٹھ کر چائے پینے لگی شعیب کی بہن نے جیا کے پاس بیٹھنے کے بعد اس سے پوچھا۔

”ویسے جیا! آپ کو طلاق کیوں ہو گئی آپ تو بہت خوبصورت ہیں؟“

”کیوں کیا طلاق صرف بد صورت لوگوں کو ہوتی ہے؟“ جیا نے بڑے صبر سے اس کی بات کا جواب دیا عطیہ بیگم اور عظمیٰ بھابی گھبرا گئیں انہیں اس کے مزاج کا اندازہ تھا وہ نہیں چاہتی تھیں کہ یہ رشتہ ہاتھ سے نکل جائے۔

”گفتہ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ تم تو بہت حسین و جمیل ہو کوئی بھی شخص تمہارے ساتھ کو اپنی خوش بختی تصور کر سکتا ہے اور مرد تو حسن پر مرتا ہے پھر بھی تمہیں طلاق ہو گئی آخراں کی کوئی وجہ تو

ضرور ہوگی۔“ مسز شفیق نے گفتگو کی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”وجہ آپ لوگ میرے والدین کی زبانی سن چکے ہیں۔“ جیانیے سپاٹ لہجے میں کہا۔
 ”بھئی امیر زادے تھوڑے بہت رنگین مزاج ہوا ہی کرتے ہیں اور دولت مند مرد تو ایسی عیاشیاں کیا ہی کرتے ہیں یہ بھلا کہاں کی عقلمندی ہے کہ لڑکے کی گول فرینڈز سے جل کر طلاق لے لی جائے تم تو بہت خوبصورت ہوا اپنے حسن سے اپنے مرد کو سدھار سکتی تھیں اور وہ شوہر تھا تمہارا تم بیوی ہو کر اسے اپنی طرف مائل نہ کر سکیں تو..... اس میں تو یقیناً تمہارا ہی دوش ہو گا جب بیوی کی توجہ نہیں ملے گی تو مرد تو باہر منہ ماری کرے گا ہی اور اگر اس شخص انیتق نے اپنی مرضی سے تمہیں طلاق دی ہے تو اس نے یقیناً تمہارے خوبصورت چہرے کے پیچھے تمہارے کردار کی کوئی بد صورتی دیکھی ہوگی کوئی اخلاقی یا جذباتی کمزوری اس کے ہاتھ لگ گئی ہوگی۔“ مسز شفیق کی طنزیہ اور تفحیک آمیز گفتگو وہ تینوں بڑے ضبط سے سن رہی تھیں ان کے خاموش ہوتے پر جیانیے ان سے پوچھا۔

”آپ کی یہ صاحبزادی کیا شادی شدہ ہیں؟“
 ”نہیں۔“ وہ بولیں۔

”تو کیا وجہ ہے کہیں ان کی شادی اب تک نہ ہونے میں بھی ان کے کردار کی کوئی کمزوری تو حائل نہیں ہے؟“ وہ اب ان کی ہی زبان میں بات کر رہی تھی وہ بھڑک اٹھیں۔
 ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”مطلب یہ ہے کہ آنٹی کہ اگر آپ کو انیتق جیسے شخص کی کوئی غلطی نظر نہیں آ رہی تو آپ اپنی بیٹی کا رشتہ اس سے طے کر دیجئے میں آپ کو اس کا ایڈریس بتا دیتی ہوں۔ وہ آج کل جیل میں بند ہے کرپشن اور دھوکہ دہی کے علاوہ ناقص مال سے عمارتیں تعمیر کرنے کے جرم میں اسے سات آٹھ سال قید ہوئی ہے۔ باپ اس کا ایکسیڈنٹ میں دونوں ٹانگوں سے معذور ہو چکا ہے اسے کہتے ہیں مکافات عمل اب آپ بتائیے کہ آپ میرے کردار میں کون سا عیب جڑ کر اس رشتے سے انکار کرنا چاہتی ہیں۔“ جیانیے بہت سنجیدہ سپاٹ اور سخت لہجے میں کہا۔ تو دونوں ماں بیٹی شرم سے پانی پانی ہو گئیں۔

”جیانیے! تم اپنے کمرے میں جاؤ مجھے بات کرنے دو۔“ عطیہ بیگم نے نرمی سے کہا۔

”آپ کیا بات کریں گی امی آپ کی بیٹی پر یہ تہمت لگا رہی ہیں اور آپ سنے جا رہی تھیں میں نے کہا تھا ناں آپ کو کہ اس دنیا میں اعلیٰ ظرف لوگوں کی بہت کمی ہے اور جن میں ظرف کی کمی ہوگی اس واقعے کو جاننے کے باوجود اس میں سے نئے نئے سوال تراشیں گے سو وہی ہوا۔“ جیا نے سنجیدہ اور طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ہم نے تو یونہی پوچھ لیا تھا۔“ مسز شفیق نے اپنی خفت مٹانے کو کہا۔

”یونہی تو نہیں آنٹی! اگر یونہی پوچھتا تھا تو اسی روز پوچھ لیا ہوتا گھر جا کر سوچ بچار کرنے ڈسکس کرنے کے بعد آپ کو یہ خیال آیا۔“ جیا نے تلخی سے مسکرا کر کہا تو وہ سنجیدگی سے بولیں۔

”ہمارے بیٹے کی خواہش ہے یہاں شادی کرنے کی اس لئے ہم چلے آئے ورنہ ہمارے خاندان میں رشتوں کی کمی تو نہیں ہے ایک سے ایک حسین اور پڑھی لکھی لڑکیاں موجود ہیں۔“

”جیسی آپ کے بیٹے کو کوئی پسند نہیں آئی ابھی تک اور انہوں نے مجبوراً ہر جھانکنا شروع کر دیا اور جیسی آپ کی بیٹی ابھی تک کنواری ہے“ جیا نے بھی اپنی بے عزتی کا پورا بدلہ اتارتے ہوئے کہا وہ شرم سے زمین میں گڑ گئیں۔

”جیا! جاؤ اپنے کمرے میں۔“ حلیہ بیگم نے قدرے سختی سے کہا۔

”جا رہی ہوں امی! اور جانے سے پہلے آپ کو اور آنٹی کو یہ بتادوں کہ مجھے ان کی بہو بننا قبول نہیں ہے کیونکہ جو سوال یہ اب کر رہی ہیں وہ بعد میں بھی کرتی رہیں گی اور میری زندگی اجیرن بنا دیں گی میں ان چاہی بہو بن کر ان کے کیا کسی کے گھر بھی جانا پسند نہیں کروں گی میری قسمت میں اگر شادی ہونا لکھا ہے تو مجھے میرے ظرف کے مطابق ہمسفر ضرور مل جائے گا جسے میرے ماضی سے نہیں مجھ سے دلچسپی ہوگی وہی میرا انتخاب ہوگا۔“ جیا نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو مسز شفیق کھڑی ہو گئیں اور طنزیہ لہجے میں بولیں۔

”ہونہہ..... ہمسفر..... انتخاب..... ارے یہ تو ہمارا ہی ظرف تھا کہ ہم چلے آئے تمہارا رشتہ مانگتے ورنہ آج کل طلاق یا فتنہ لڑکی سے کون رشتہ کرتا ہے۔“

”بجائے فرمایا آنٹی آپ نے آج کل تو کنواری لڑکیوں کی شادی بھی نہیں ہو رہی میں تو پھر طلاق یا فتنہ ہوں..... چہ چہ چہ۔“ جیا نے ان کی کنواری اور اپنے سے چار پانچ سال بڑی بیٹی کو دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا تو وہ چپ رہ گئیں گفتہ نے بھرائی آواز میں ان سے کہا۔

”امی چلیں یہاں سے آپ نے تو ابو اور بھائی کی عزت بھی خاک میں ملا دی اور میرا بھی خیال نہیں رہا اپنی بیٹی کو ذلیل کروا کر کیا مزائل رہا ہے آپ کو؟“

”آئی ایم سوری گفتہ جی! میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا یا آپ کی انسٹ کرنا ہرگز نہیں تھا مگر جہاں بات میری اپنی عزت کی آجائے تو پھر میں بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہتی ہوں میں ایسی نہیں تھی مجھے آپ کی امی جیسے لوگوں کے سوالوں اور رویوں نے ایسا بننے پر مجبور کر دیا ہے خدا کرے کہ آپ اچھی زندگی بسر کریں میں آپ کی شادی کے لیے دعا کروں گی اپنی امی کا مزاج مت اپنایئے گا ورنہ بے سکون رہیں گی ایک بار پھر جو کچھ میں نے آپ کے بارے میں کہا اس پر معذرت خواہ ہوں خدا حافظ۔“ جیانے گفتہ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرم اور دھیمے لہجے میں کہا اور ان دونوں ماں بیٹی کو حیران پریشان چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

پھر اسے امی اور غلطی بھابی کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ لوگ اپنے رویے پر بہت نادم ہیں اور جیا کو ہر صورت اپنی بہو بنانے کے خواہشمند ہیں شفیق صاحب اور شعیب نے مسز شفیق کے رویے کی معذرت کی مگر جیا کی ”ناں“ ”ہاں“ میں نہ بدل سکی اس نے صاف انکار کر دیا تھا سب نے اسے سمجھایا پیار سے بھی اور ڈانٹ کر بھی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور صاف الفاظ میں سب کے سامنے کہہ دیا۔

”اگر آپ لوگ چاہتے ہیں کہ میں اس گھر سے چلی جاؤں تو ٹھیک ہے میں چلی جاؤں گی بہت بوجھ ہوں نا میں آپ پر مگر اب میں اپنا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو گئی ہوں میری بے عزتی نہ کل آپ کے لیے کوئی معنی رکھتی تھی نہ آج کوئی اہمیت رکھتی ہے مگر میں کسی ایسے فرد سے رشتہ نہیں جوڑوں گی جو میرے کردار کے بارے میں ذرا سا بھی شک و شبہ کا اظہار کرے گا۔“

”ٹھیک ہے اب ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے ہم نے غلطی ضرور کی تھی انیق کے معاملے میں لیکن اب تم غلطی کر رہی ہو اور بہت جلد تمہیں اپنی غلطی کا احساس بھی ہو جائے گا۔“ حسن صاحب نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

سب نے حسب توفیق اسے ڈانٹ پلائی تھی وہ خاموشی سے سننے کے بعد اپنے کمرے میں چلی گئی رات کے کھانے پر بھی وہ موجود نہیں تھی اور کسی نے اسے کھانے کے لئے بلایا بھی نہیں تھا حالانکہ اسے سب کے کھانے کی میز پر کھانے کھاتے ہوئے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیتی

رہی تھیں اسے بہت دکھ ہوا سب کے رویے پر اور وہ دل میں گویا ہوئی۔

”میں جانتی ہوں کہ اپنے اس فیصلے سے میں اکیلی رہ جاؤں گی بھائی بھی اپنے بیوی بچوں میں معروف ہو جائیں گے کل ان کے پاس میرے لئے تھوڑا سا وقت ہوگا اور نہ توجہ لیکن میں اتنی بے مول اور بے حمیت تو نہیں ہوں کہ جس کا جی چاہے مجھے بے عزت بھی کرے اور مجھ پر احسان بھی جتائے کہ وہ مجھے ایک ”طلاق یافتہ“ لڑکی کو اپنا رہا ہے الزام ہر حال میں عورت کے سر آتا ہے مگر مجھے سرجھکا کر جینے سے نفرت ہے۔ اگر کوئی عزت سے دیکھنے بات کرنے اور میرے ماضی کو دہرانے سے دلچسپی ظاہر نہ کرتے ہوئے مجھے میرے آج کے ساتھ عزت اور محبت سے اپنانے کا خیال ظاہر کرے گا میری طرف ہاتھ بڑھائے گا تو میں ضرور اس کا ہاتھ تھام لوں گی انشاء اللہ۔“

☆☆☆

رات کو گیارہ بجے کے قریب وہ بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے کمرے سے باہر نکلی تو کچن کی طرف آتے ہوئے محسن بھائی اور عظمیٰ بھابی کے بیڈروم سے اپنا نام سن کر حیرت ہوئی اس کے قدم مارے تجسس کے خود بخود دان کے کمرے سے دروازے پر رُک گئے وہ دونوں اُسی کے متعلق باتیں کر رہے تھے اور رات کی خاموشی میں اسے ان کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

”یہ ٹھیک ہے کہ ایک تجربہ کامیاب نہیں رہا لیکن اس طرح تو زندگی نہیں گزرتی وہ تو بعند ہے کہ شادی نہیں کرنی تو اور کیا کرے گی آخر؟“ یہ اس پر جان چھڑکنے والے محسن بھائی کی آواز تھی جو اس کی سماعتوں پر تازیا نہ بن کر لگی۔

”ہمیں مزید بدنام کر رہے گی اور کیا کرنا ہے اس سے پہلے خاندان والے اس کی طلاق پر تبصرے کرتے تھے کافی عرصہ گزر گیا تو وہ جیا کی طلاق کے قصے کو بھول بھال گئے اب جب پھر سے رشتے آنے شروع ہوئے ہیں اور جیا انکار پر انکار کیے جا رہی ہے تو لوگوں کو سننے سرے سے باتیں بنانے کا موقع مل رہا ہے اب تو لوگ یقین سے یہ بات کہیں گے کہ ضرور جیا کا کردار عیب دار ہے جیسا اب تک ماں باپ کے گھر بیٹھی ہے محسن ہم بھی بیٹی والے ہیں کل ہم نے بھی اپنی بیٹی بیانی ہے اگر جیا کے یہی تیور رہے تو لوگ ہماری بیٹی کو بھی جیا کے کردار کے آئینے میں دیکھیں گے اسے بھی اچھا رشتہ نہیں ملے گا۔ کہ جیسی پھوولسی ہی جیسی ہوگی میں اپنی بیٹی کو جیا کی کنواری اور ضدی شخصیت میں پروان نہیں چڑھانا چاہتی آپ سمجھائیں اسے یوں دھمکیاں دے کر وہ کب

تک ہمیں خاموش رکھے گی؟“ یہ عظمیٰ بھابی تھیں جو ہمیشہ اس کی حمایت کیا کرتی تھیں اس کی ہم راز اور سہیلی تھیں منحور اور ہمدرد تھیں آج وہی اس سے اس قدر بدگمان تھیں کہ اس کے خلاف زہر اُگل رہی تھیں جیسا کہ دل صدے سے ڈوبنے لگا آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُٹھ آیا۔

”جیسا کہ کردار بے داغ ہے عظمیٰ اور۔“

”یہ تو ہم جانتے ہیں لوگوں کو کون وضاحتیں دیتا پھرے گا۔“ محسن بھائی کی بات عظمیٰ بھابی نے درمیان میں ہی اُچک لی تھی اور جیسا یہ اطمینان لے کر کہ کم از کم اس کے بھائی کو اس کے کردار کی پاکیزگی کا مان اور یقین تو ہے وہ کہن میں جائے کی بجائے اپنے کمرے میں چلی آئی کہ بھوک مر گئی تھی اور دکھ زندہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

امتحانات کے دوران وہ مکمل طور پر کتابوں میں گم ہو گئی جو نئی امتحانات ختم ہوئے اس نے اپنے ماضی اور حال کے متعلق سب کی آراء کے متعلق خوب سوچا سمجھا اور اللہ پر بھروسہ کر کے اپنے مستقبل کا فیصلہ ایک بار پھر اپنے والدین کے ہاتھ میں دینے کا ارادہ باعہ لیا۔

”ناشتے کی میز پر سب ہی موجود تھے، جیانیہ حسن صاحب کو چائے کا کپ تھمایا۔ تو وہ پوچھنے لگے۔“

”جیانیہ! تمہارے پیپرز کیسے ہوئے؟“

”بہت اچھے۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”گڈ تو اب کیا ارادہ ہے؟“

”ابو امی اگر آپ لوگوں کی اجازت ہو تو میں یہ چھٹیاں مظفر ماموں کے ہاں گزار لوں؟“

جیانیہ پہلی بار اتنے سالوں میں کہیں جانے کی بات کی تھی وہ سب حیرت سے کبھی اس کی صورت دیکھ رہے تھے تو کبھی ایک دوسرے کی حسن صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہاں بیٹا! ضرور جاؤ اپنے ماموں کے گھر تو تم کبھی گئیں ہی نہیں وہ تو ہر بار چھٹیوں میں تمہیں بلاتے ہیں اور اس بار بھی کہہ رہے تھے کہ جیانیہ کے اگیزامز ختم ہو جائیں تو اسے ہمارے پاس بھیج دیں اب تم جاؤ گی تو وہ بہت زیادہ خوش ہوں گے۔“

”اور کیا مظفر بھائی تو تمہیں بہت چاہتے ہیں حیران رہ جائیں گے وہ تمہیں اپنی حویلی میں

دیکھ کر۔“ عطیہ بیگم بھی اس کے اس فیصلے پر خوش ہو کر بولیں۔

”جی امی! حیران تو بہت سے لوگ رہ جائیں گے۔“ جیانے معنی خیز جملہ کہا مگر کسی نے جملے کی گہرائی میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی عظمیٰ بھابی عثمان کو اٹھ کھلاتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”کب جا رہی ہو ماموں کے ہاں؟“

”سیٹ بک ہو جائے تو کل ہی۔“ جیانے انہیں مزید حیران کیا۔

”اس کے بعد کیا ارادہ ہے؟“ محسن بھائی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”کس کے بعد؟“ وہ کبھی نہیں تھی شاید۔

”بھئی ماموں کے ہاں سے واپسی اور رزلٹ کے بعد کیا کرنے کا ارادہ ہے مستقبل کی کیا

پلاننگ ہے؟“ محسن بھائی نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے پوچھا تو حسن صاحب اور عطیہ

بیگم نے انہیں آنکھوں کے اشارے سے منع کیا اتنی مدت بعد تو جیا میں وہ تبدیلی دیکھ رہے تھے اور

نہیں چاہتے تھے کہ اس کا موڈ بگڑ جائے مگر بات تو زبان سے پھسل چکی تھی جیانے ان کی بات سن

کر مسکرا کر عظمیٰ بھابی کی جانب دیکھا اسے رات والی اُن کی باتیں یاد آ گئیں جو اس نے اتفاقاً سن

لیں تھیں اس نے ہنسی سے جواب دیا۔

”بھائی! آپ لوگ مطمئن رہیں میں اب مزید بدنامی کا باعث نہیں بنوں گی آپ کے لئے

آپ بھی بیٹی والے ہیں اور بھابی جان! میں نہیں چاہوں گی کہ میری بیٹی کو لوگ میرے کردار کے

آئینے میں دیکھیں۔ کنواری، ضدی، طلاق یافتہ، بد کردار، پھپھو کی وجہ سے بیٹی کے لیے بھی اچھا

رشتہ نہیں آئے گا اور میں ایسا نہیں چاہوں گی مجھے آپ لوگوں کو دھمکیاں دینے کا بھی کوئی شوق

نہیں ہے۔“

”جیا! تم.....“ عظمیٰ بھابی مارے شرمندگی کے اتنا ہی بول سکیں محسن بھائی الگ شرمسار نظر آ

رہے تھے ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جیا ان کی باتیں بھی سن سکتی ہے۔

”میں ایک تجربے سے اتنا کچھ سیکھ گئی ہوں۔ کہ برسوں کی تعلیم نے مجھے اتنا کچھ نہیں سکھایا

تھا۔“ جیانے دوبارہ بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

”تمہارے اور کڑے وقت میں اپنے اور پرانے ہر رشتے کی آزمائش ہو جاتی ہے رشتوں اور

رویوں کا ظاہر اور باطن مکمل کر سامنے آ جاتا ہے میں آپ سب کے لئے پریشانی اور بدنامی کا

باعث بنی ہوں بدنامی میں گو میرا کوئی کردار نہیں تھا بہر حال میں آپ کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی اس لئے اب وارا می! اب آپ لوگ میرے متعلق جو فیصلہ کریں گے مجھے قبول ہوگا میرے مستقبل کا فیصلہ کل بھی آپ نے کیا تھا آج بھی آپ ہی کریں گے لیکن جن رشتوں کو میں ٹھکرا چکی ہوں ان کے علاوہ فیصلہ کیجئے گا اور میرے رویے نے جس جس کا دل دکھایا میں اس سے معذرت چاہتی ہوں پلیز فار گیوی۔“ جیا اپنی بات مکمل کر کے وہاں سے اٹھ گئی یہ دیکھے بغیر کہ وہ سب کس قدر حیران اور نادام بیٹھے تھے خاص کر حسن بھائی اور عظمیٰ بھائی تو شرمندگی سے ایک دوسرے سے بھی نظریں پچرا رہے تھے حسن صاحب اور عطیہ بیگم خوش بھی تھے کہ جیا نے شادی کے لیے رضا مندی ظاہر کر دی تھی اب وہ اس کے لئے بہتر رشتے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ وہ پہلے کی طرح آنکھیں بند کر کے کسی کو ”ہاں“ نہیں کہنا چاہتے تھے جیا کی اگلے دن کی ہی سیٹ بک کرادی گئی مظفر ماموں کو فون کر دیا گیا اور یوں وہ مظفر ماموں کی حویلی آ گئی۔

”ہیلو کس کہاں پہنچی ہوئی ہیں؟“ علی کی آواز نے اسے چونکا دیا اور وہ ماضی کے تلخ سفر سے واپس لوٹ کر حال میں آگئی مگر اس کے چہرے پر اس سفر کی تھکن کے آثار نمایاں ہو گئے تھے جنہیں علی نے بہت غور سے دیکھا وہ بھی قدسیہ بیگم سے اس کی شادی اور طلاق کے متعلق سب کچھ جان کر آ رہا تھا اسے جیا کے ساتھ ہونے والی اس ٹریجڈی پر حقیقتاً بہت رنج ہوا تھا اتنی اچھی لڑکی کے ساتھ اتنا برا سلوک۔

”یہیں ہوں مجھے کہاں جانا ہے؟“ جیا نے طویل سانس فضا میں خارج کرتے ہوئے کہا تو وہ معنی خیز اور شریر لہجے میں بولا۔

”ہاں واقعی آپ کو کہاں جانا ہے آپ کو تو یہیں رہنا ہے۔“

”تم مجھے کیوں ڈھونڈ رہے تھے کوئی کام تھا؟“ جیا نے نظریں چرا کر پوچھا۔

”میں آپ کو کھونے یا گم ہونے دوں گا تو ڈھونڈوں گا ناں آپ تو میرے پاس ہی ہیں اور

ہمیشہ رہیں گی اور اب ذرا اندر آ جائیے۔“ وہ اپنی معنی خیز بات کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

”کیوں؟“ اس نے بے دھیانی میں پوچھا تو وہ شرارت سے گنگٹنا لگا۔

”عشق سچا ہے تو پھر وعدہ نبھانا ہوگا

تجھ کو آنا ہوگا، تجھ کو آنا ہوگا“

”واٹ.....؟“ جیانے شرم اور غصے سے اسے گھورا۔

”میرا مطلب ہے کہ مرغ پکا ہے تو پھر کھانا، کھانا ہوگا، تجھ کو کھانا ہوگا، مرغ کھانا ہوگا۔“ اس نے فوراً گیت کے مصرعے کی پیروی کی گا کر بات سمجھائی تو اسے بہت ہنسی آئی اور وہ اس کی ہنسی میں کھوسا گیا کتنا سحر تھا اس کی ہنسی میں۔

”اب کیا روز روز مرغ کی شامت آیا کرے گی؟“

”آپ کی آمد سے مرغوں کے بُرے اور ہمارے اچھے دن آگئے ہیں۔“ اس کا جملہ پھر معنی خیز اور شریہ تھا اس نے جان بوجھ کر ہنسی میں اڑا دیا اور اس کے ساتھ اندر آنے کے لئے چل پڑی اچانک اس کی نظر لان کی دیوار کے قریب سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کیے لٹکے سمیچ پر پڑی تو حیران ہو کر بولی۔

”ارے یہ سمیچ کو کیا ہوا ہے یہ ایسے کیوں کھڑا ہے؟“

”کیونکہ اس سے کسی نے یہ کہہ دیا ہے کہ اس حرکت سے لمبے آدمی کی عقل جو گٹوں یا ٹخنوں میں ہوتی ہے سر میں آ جاتی ہے۔“ علی نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”پھر تو تمہیں بھی ایسا کسر ساز کرنی چاہیے۔“ جیانے اس کے کافی اونچے لمبے قد کاٹھ کو دیکھتے ہوئے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا تو اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی اور بمشکل وہ اپنی ہنسی روک کر اسے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”آپ کہیں گی ہم یہ بھی کر لیں گے ویسے ہمیں آپ کی یہ ہڈ مزاح اور حاضر دماغی سے بھر پور بات بہت اچھی لگی ہے۔“

”بھائی جان! لٹخ ٹائم ہو گیا ہے ناں۔“ سمیچ نے وہیں، سے اسی حالت میں اسے پکار کر پوچھا تھا۔

ہاں اور ہم ڈائننگ ہال میں ہی جا رہے ہیں تم بھی آ جاؤ اب علی نے رک کر جواب دیا۔

”آ رہا ہوں بس ایک منٹ اور۔“

”آخر اس طرح ہوگا کیا جو تم سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کیے خود کو اذیت دے رہے ہو؟“ جیانے

اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کہتے ہیں کہ اس عمل سے عقل واپس سر میں آ جاتی ہے۔“

”بشرطیکہ عقل نام کی کوئی شے آپ کے وجود میں پہلے سے موجود ہو۔“ جیانے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا تو جہاں سمج کے پاؤں واپس جھٹکے سے زمین پر اور سر اوپر چلا گیا وہاں علی کا بے اختیار قہقہہ بھی پوری فضا کو خوشگوار بنا گیا۔

”ویسے پھمو! آپ ہیں بہت ذہین اور بزلہ سنج۔“ سمج نے اپنے چہرے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

”شکریہ سمجئے۔“ وہ مسکرائی۔

”کوئی بات نہیں ذرا میرے سر پر دست شفقت پھیر کر مجھے بھی شکریہ کا موقع عنایت کیجئے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے بہت اسٹائل سے کہا۔ اور اس کے سامنے اپنا گھاس اور پتوں سے اٹا سر جھکا دیا۔

”جیتے رہو خوش رہو مگر صاف سقرے رہو اُن خاصا کچرا جمع ہو گیا ہے۔ یہاں تو جھاڑو پھیرنے کی ضرورت ہے۔“ جیانے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بالوں میں اُٹے گھاس کے تنکے اور پتے نکالتے ہوئے کہا تو وہ بچوں کی طرح روٹھ کر پیچھے ہٹ گیا علی کو ہنسی آ گئی۔

”واہ پھمو جانی! آپ کے جوہر تو آہستہ آہستہ ہم پر کھل رہے ہیں۔“ سمج نے کہا تو وہ ہنس دی۔

”وہ کہتے ہیں ناکہ جیسے کو تیرا۔“

”وہ ہی کیوں کہتے ہیں ہمیشہ ہم خود کچھ کیوں نہیں کہتے؟“ اس نے بات پکڑ لی اور پھر جرح شروع کر دی۔

”بعض اوقات انسان کو اپنی بات کہنے کے لیے بھی اس قسم کے الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے کیونکہ اسے تشدد ہوتا ہے کہ لوگ اس کی بات سن کر یقین نہیں کریں گے یا عمل اور اصلاح کے قابل نہیں سمجھیں گے۔“ جیانے سنجیدگی سے وضاحت کی۔

”بجا فرمایا آپ نے میں نہانے جا رہا ہوں پھر اطمینان سے آ کر کھانا کھاؤں گا۔“ سمج یہ کہتا ہوا اندر بھاگ گیا۔

☆☆☆

”تم کیوں ایسے گھوڑے ہو؟“ جیانے علی کو اپنی جانب دیکھتے پا کر پوچھا۔

”آپ نے میرے سر پر تو دستِ شفقت نہیں پھیرا۔“
 ”دستِ شفقت کے لیے سر کو جھکانا پڑتا ہے۔“ جیانے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”لہجے ہم نے اپنا سر جھکا دیا۔“ علی نے اس کے سامنے آ کر اپنا سر جھکا دیا۔
 ”اب ہر سر تو دستِ شفقت کے لائق نہیں ہوتا کچھ سر قلم کر دینے کے لائق بھی ہوتے ہیں“
 جیانے مذاق سے فلسفہ بگھارا تو وہ سر اٹھا کر اس کی گہری گہری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے بولا۔

”تو سر قلم کر دیجئے بندہ اُف تک نہیں کہے گا بلکہ اسے اپنے لیے سعادت سمجھے گا۔“
 ”اسٹو پڈ۔“ جیانے ہاتھ میں پکڑے گھاس کے تنکے اور پتے اس کی طرف اچھال دیئے اور تیزی سے اندر چلی گئی وہ مسکرا دیا۔

☆☆☆

اگلے دن وہ سب جیا کو اپنی زمینیں دکھانے لے گئے گاؤں کی کھلی فضا میں سانس لینا اس کے لیے ایک انوکھا تجربہ ضرور تھا مگر اسے اس فضا میں گھاس گو برا اور گندم گنے کی ملی جلی باس بھی محسوس ہو رہی تھی وہ ایک چھوٹی سی نہر کے قریب آ کر رُک گئی نہر میں گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچے نہار ہے تھے ایک دوسرے پر پانی پھینک رہے تھے ایک طرف گاؤں کے مرد اپنی بھینسوں کو نہلا رہے تھے۔

”اوہ گاؤ! انسان اور حیوان ایک ہی گھاٹ پر غسل کر رہے ہیں۔“ جیا کے منہ سے بے اختیار نکلا تو علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جبکہ آپ نے شیر اور بکری کے بارے میں ایسا سنا اور پڑھا ہوگا مگر ہمارے ہاں برابری کے اصولوں کے تحت انسان اور حیوان ایک ہی گھاٹ پر غسل کر رہے ہیں۔“
 ”یہ تو درست نہیں ہے گندے پانی سے کیا خاک غسل ہوتا ہوگا۔“

”پھپھو جانی! غسل نہ کرنے سے بہتر ہے۔ کہ گندے پانی سے ہی غسل فرمالیا جائے۔ یہ بچے گھروں میں نہانے سے کتراتے یہاں نہر میں شوق سے نہاتے ہیں۔“ سمیع نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ تو زری بیماری ہے کم از کم تم جیسے پڑھے لکھے لوگوں کو ہی اس سلسلے میں لوگوں میں شعور

بیدار کرنا چاہیے۔“ جیانے تاسف سے کہا۔

”ارے پھپھو جانی! ان لوگوں کو گندے اور گدے پانی کی بو میں کھوئے ہی رہنے دیں اگر یہ لوگ جاگ گئے تو..... منرل واٹر اور عرق گلاب سے نہانے والے ابدی نیند سو جائیں گے۔“ سمج نے ہنس کر کہا۔

”واہ بھی تم تو کبھی کبھی بڑی گہری بات کر لیتے ہو۔“ جیانے مسکراتے ہوئے کہا۔

”گہری بات ہی نہیں پھپھو! ہم تو گہری محبت بھی کر لیتے ہیں بلکہ کر رہے ہیں۔“ سمج نے نشاء کو شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ شرما کر رخ پھیر گئی اور جیانہں پڑی ہنستے ہنستے اس کی نظر علی پر پڑی وہ اسی کو بہت والہانہ پن سے دیکھ رہا تھا وہ شپٹا گئی۔ اس کی نظریں اسے بہت کنفیوژ کر دیتی تھیں جو کچھ اس کی آنکھوں سے جھلکتا ہوا اس تک پہنچ رہا تھا وہ اس کے لئے خوشی اور پریشانی دونوں کا باعث تھا وہ جانتی تھی کہ ایسا ناممکن ہے وہ اپنے مستقبل کے تمام اختیارات اپنے والدین کو سوپ کر آئی تھی مگر اسے کیا خبر تھی کہ یہاں آ کر اسے اپنا دل کسی کو سوپ کر بے چین و بے قرار ہونا پڑے گا واپس حویلی آ کر بھی وہ ابھی ابھی رہی۔

”اس سے پہلے کہ میرا دل میرے بس میں بالکل نہ رہے مجھے یہاں سے واپس چلے جانا چاہیے۔“ جیانے رات کو بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے سوچا اور صبح جب سب ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے اپنے کام میں لگ گئے تو وہ لان میں مظفر ماموں کے پاس چلی آئی وہ پودوں کی سوکھی شاخیں کاٹ رہے تھے ان کے گرد اگنے والے کاٹنے نکال رہے تھے۔

”ماموں جان! آپ نے لان بہت خوبصورت بنا رکھا ہے میرا دل چاہتا ہے کہ میرا لان بھی ایسا ہو جائے ہے تو وہ بھی خوبصورت مگر اس جیسا بڑا اور خوبصورت نہیں ہے“ جیانے پھولوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

تو بیٹا اس لان کو بھی تم اپنا لان ہی سمجھو مظفر ماموں نے محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”شکریہ ماموں جان!“ وہ مسکراتے ہوئے ان کا ہاتھ بٹانے لگی۔

”کوئی بے چینی ہے؟“ مظفر ماموں نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں! وہ میں واپس کر اپنی جانا چاہتی ہوں۔“ وہ حیران ہو کر بوکھلا کر بولی انہیں اس کی بے چینی کا کیسے اندازہ ہوا تھا وہ حیران نہ ہوتی تو کیا کرتی۔

”ابھی سے ابھی تو تمہاری بہت چھٹیاں باقی ہیں اور اب تو چھٹیاں ہی چھٹیاں ہیں۔“ مظفر ماموں نے پانی کا پائپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”بس میں واپس جانا چاہتی ہوں۔“ اس نے گھاس میں اُگے کانٹے کو اپنے ہاتھ سے اکھاڑتے ہوئے کہا اس کے ہاتھ میں ہرے ہرے کانٹے چھ گئے تھے مگر وہ تو کسی اور ہی خیال میں غلطیاں تھی مظفر ماموں نے اس کی صورت کو بنور دیکھتے ہوئے اس کی اس حرکت پر نظر رکھتے ہوئے پوچھا۔

”تو کیا یہاں ہماری بیٹی کا دل نہیں لگا؟“

”دل ہی تو لگ گیا ہے اسی لئے تو میں واپس جانا چاہتی ہوں۔“ اس نے بہت مدہم آواز میں کہا تو انہوں نے چونک کر اس کے اضطراب سے ہر سراپ کو جانچا پھر پیار سے بولے۔
 ”جہاں دل لگ جائے وہاں سے جا کر بھی انسان ”جا“ نہیں پاتا۔“
 ”شاید آپ درست کہہ رہے ہیں۔“ اس نے لان کی جانب آتے علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”پھر بھی میں واپس جانا چاہتی ہوں۔“

”امی ابو اور گھر یاد آ رہا ہے۔“ مظفر ماموں نے اس کے سر پر دست شفقت رکھا تو اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

”پتا نہیں ماموں جان! کوئی یاد آ رہا ہے یا کسی کی یاد کو بھلانے کے لئے میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں بس آپ میری واپسی کی سیٹ بک کر ادھیجے کل یا پرسوں تک۔“
 ”سوچیں گے ابھی تو تم انجوائے کرو۔“ مظفر ماموں نے اس کا سر تھپک کر کہا۔
 ”کیا ہو رہا ہے دادا جان؟“ علی نے قریب آ کر پیار سے پوچھا۔

”دادا کے پوتے تمہاری یہ پچھو واپس جانے کی بات کر رہی ہے۔“ مظفر ماموں نے ان دونوں کی طرف باری بار دیکھتے ہوئے کہا تو ان دونوں کی آنکھیں چار ہونٹیں ولوں میں ایک دم بے چینی اور الجھل ہونے لگی جیسا کہ شکل خود کو کپوز کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

”یہ یہاں سے واپس جا سکتی ہیں لیکن دل سے ان کی واپسی ناممکن ہے۔“ علی نے معنی خیز لہجے میں کہا جیسا کہ کانوں میں جملہ پڑ چکا تھا اس کے قدم تیز ہو گئے اور چہرہ حیا سے تپ کر سرخ

اتار ہو گیا مظفر ماموں نے علی کی طرف دیکھا اور اس کی نگاہوں سے لودیتے جذبے انہیں بہت کچھ سمجھا اور بتا گئے۔

”علی! کیا بات ہے؟“ انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے پوچھا۔

”کیا بات ہے دادا جان؟“ اس نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔

”وہ اندر جا چکی ہے۔“ وہ شرارت سے مسکرائے۔

”نہیں دادا! وہ اندر آ چکی ہے، اس کے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ علی نے ہنس

کر شرمیلے پن سے کہا وہ ان سے جیا کے متعلق بات کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا، آج موقع خود بخود مل رہا تھا۔

”ہوں..... اس کا مطلب ہے کہ میں نے جو کچھ دیکھا سنا اور محسوس کیا ہے وہ درست ہے“

مظفر ماموں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ نے کیا دیکھا سنا اور محسوس کیا ہے؟“ علی نے ان کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے

ہوئے پوچھا۔

”یہی کہ تم جیا کو پسند کرتے ہو کیوں؟“

”کیونکہ اسے ناپسند کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی مجھے۔“ وہ مسکرایا۔

”جیا سے شادی کرنا چاہتے ہو؟“

”اومائی سوئٹ دادا جان! آپ نے یہ بات کہہ کہ میرا مسئلہ ہی حل کر دیا جی ہاں میں جیا

سے شادی کرنا چاہتا ہوں آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں گے ناں دادا جان؟“ علی نے خوش ہو کر کہا۔

”پہلے تم یہ بتاؤ کہ جیا کے ماضی کے بارے میں آئی مین اس کی طلاق کے بارے میں

جانتے ہو؟“ مظفر ماموں نے اس کے خیالات جاننا ضروری سمجھا اور جیا کی طلاق کی بات جو کہ ان کا خیال تھا کہ علی کو نہیں معلوم اس کے گوش گزار کر دی۔

”پہلے نہیں جانتا تھا لیکن دادی جان نے مجھے کل ہی بتایا ہے اور جیا نے بھی خود ہی بتا دیا تھا

دادا جان! میں جیا کے ماضی میں اس کی کوئی غلطی نہیں دیکھتا جیسا پیاری لڑکی ایق جیسے فلرٹ اور فراڈیے شخص کے لائق ہی نہیں تھی اچھا ہوا جو جیا کو جلد اس شخص سے چھٹکارا مل گیا اپنی ہاؤ میں

جیا کے ماضی نہیں مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہتا ہوں۔“ علی نے سنجیدگی سے کہا تو انہیں اس کے خیالات جان کر خوشی اور اطمینان ہوا۔

”تم کبھی اس کے سامنے اینق کا ذکر تو نہیں کرو گے؟“ مظفر ماموں کو یقین تو تھا کہ علی جو کہہ رہا ہے سچ ہے مگر پھر بھی وہ ہر طرح سے اپنی تسلی کرنے کے بعد یہ بات آگے بڑھانا چاہتے تھے اس رشتے سے انہیں دلی خوشی ہوئی۔

”دادا! میں کیا اتنا کم ظرف اور بُرا ہوں۔“ وہ خفگی سے بولا۔

”نہیں تم تو بہت کشادہ دل اور اچھے بچے ہو بس احتیاطاً پوچھ رہا ہوں یہ بتاؤ کہ کیا تم جیا کو خوش رکھ سکو گے؟“ وہ پیار سے بولے۔

”دادا جان! کیا آپ مجھے نہیں جانتے؟“ وہ پیار بھری خفگی سے بولتا سنگی بچ پر بیٹھ گیا مظفر ماموں نے محبت سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور اس کے قریب بیٹھ کر نرمی سے بولے۔

”جانتا ہوں میرے بچے میں تو تمہارا دوست بھی ہوں میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں مگر بچے! میں جیا کو بھی جانتا ہوں وہ بہت دکھی ہے لوگوں نے اس کی عزت نفس طرح طرح سے مجروح کی ہے وہ رشتوں سے خاص کر شادی جیسے رشتے سے بدظن ہو چکی ہے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ ابھی ایگز امر سے پہلے بھی اس کا بہت اچھا رشتہ آیا تھا مگر لڑکے کی ماں نے جیا کی طلاق کا ذکر بہت ہی غلط انداز میں کیا حالانہ حسن اور عطیہ نے سب کچھ پہلے ہی بتا دیا تھا۔ بس پھر جیا نے اس رشتے سے انکار کر دیا حالانکہ وہ لوگ بار بار معافی مانگ چکے ہیں۔ اور اب تک آس لگائے بیٹھے ہیں شاید جیا ایسے لوگوں سے فرار حاصل کرنے کی خاطر یہاں چلی آئی ہے۔“

”مگر ہم اسے یہاں سے فرار نہیں ہونے دیں گے۔“ علی نے ہر عزم لہجے میں کہا۔

”اے گریہ کرنا بھی اتنا آسان نہیں ہے جانتے ہوتاں۔“

”میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ عزم پکا اور نیت نیک ہو تو کوئی بھی کام ناممکن نہیں ہے“ علی نے ہر اعتماد اور ہر یقین لہجے میں کہا۔

”بات تو تم نے سولہ آنے درست کہی پوتے۔“ مظفر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تو اس خوشی میں آپ امی ابو سے بات کیجیے۔“

”آج.....؟“ وہ حیرت سے بولے تو اس نے کہا۔

”اور ابھی.....“

”مگر پوتے.....“

”دادا! کوئی اگر مگر نہیں چلے گی خود کو آپ میرا دوست بھی کہتے ہیں۔ اور ایک کام کے لئے ”اگر مگر“ بھی کر رہے ہیں بس آپ آج ہی امی ابو سے بات کریں۔“ علی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں کھڑا کرتے ہوئے کہا۔

”اتنی اچھی لگتی ہے وہ تمہیں؟“ مظفر ماموں نے شرارت سے اسے چھیڑا۔

”دادا! اچھی تو مجھے وہ اس وقت لگی تھی جب وہ ویران سڑک پر بارش میں بھیگی بھیگی سہی سہی سی کھڑی معصومیت سے مجھے دیکھ رہی تھی اور اب وہ مجھے اتنی اچھی لگتی ہے کہ مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔“ علی نے نظریں جھکا کر شرمیلی مسکان لیوں پر سجائے انہیں اپنے دل کی بات بتادی۔

”تمہارا یہ انکشاف اور اعتراف میرے لئے بے حد خوشی کا باعث ہے۔ علی بیٹے جیامجھے بہت عزیز ہے وہ میری اس بہن کی بیٹی ہے۔ جسے میں نے ہمیشہ اپنی بیٹی ہی سمجھا ہے۔ اور بیٹی کی اولاد تو اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے۔“ انہوں نے خوشی سے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھر کر کہا۔

”جیا آپ کو مجھ سے بھی زیادہ عزیز ہے کیا؟“

”مجھے تو تم سب ہی عزیز ہو ہاں البتہ جیا کا ایک نمبر زیادہ ہے اور وہ اس لئے بھی کہ اس نے زندگی کے ایک حادثے کی وجہ سے اپنی بقیہ زندگی کو مایوسی اور بے بسی کے حصار میں نہیں چھوڑا بلکہ بہادری کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا اپنی تعلیم مکمل کی ہے ہر ہنر سیکھا ہے بس ایک رشتے کا بھروسہ ٹوٹا ہے جو اب مجھے یقین ہے کہ تم اسے ضرور لوٹا دو گے انشاء اللہ تعالیٰ۔“ مظفر ماموں نے مسکراتے ہوئے ہر امید لہجے میں کہا۔

”انشاء اللہ۔“ علی نے دل سے کہا۔

”بھائی جان! کراچی سے آپ کا فون ہے۔“ سمیع کارڈ لیس لئے دوڑا چلا آیا۔

”ہیلو۔“ علی نے کارڈ لیس اس کے ہاتھ سے لئے کراپنے کان سے لگا لیا سمیع مظفر ماموں سے باتیں کرنے لگا فون بند ہوتے ہی علی نے خوشی سے نعرہ لگایا ”یا ہو۔“

”کیا ہو گیا بھائی جان؟“ سمیع نے حیران ہو کر پوچھا۔

”میری جاب پکی ہوگئی ہے۔ کمپنی کے ایم ڈی نے بنفس نفیس مجھے فون پر جاب آفر کی ہے اپائنٹمنٹ لیٹر کل تک مل جائے گا۔“ علی نے خوشی سے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”مبارک ہو بیٹا!“ مظفر ناموں اور سمیع نے اسے گلے لگا کر مبارکباد دی۔

”میں باقی سب کو بھی بتاتا ہوں۔“ علی خوشی سے کھلکھلاتا اندر کی جانب بھاگا راستے میں اشعر اور احمر صاحب مل گئے انہوں نے اسے گلے لگایا اور مبارکباد دی وہ قدسیہ بیگم کی طرف چلا آیا وہ کپڑے تہہ لگا رہی تھیں اس نے اپنی بانہیں پھیلائیں اور ان کے سامنے آنکھڑا ہوا اور پر جوش لہجے میں بولا۔

”دادی جان! آپ کا پوتا بہت بڑا فسر بن گیا ہے مبارک نہیں دیں گی مجھے۔“

”سچ..... بہت مبارک ہو چند! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے اللہ تمہیں اور ترقی دے جیتے رہو۔“

قدسیہ بیگم نے اس کا ماتھا چوم کر اسے اپنے گلے سے لگاتے ہوئے دعا دی عین اسی وقت جیا کمرے میں اپنے کپڑے لئے داخل ہوئی اسے دیکھ کر واپس جانے لگی تو وہ لپک کر اس کے قریب چلا آیا۔

”آپ بھی مجھے مبارکباد دے دیجیے گلے بعد میں لگا لیجیے گا جب اختیار مل جائے گا۔“ علی نے بہت آہستگی اور شرارت سے کہا تو اس کا چہرہ غصے اور شرم سے سرخ ہو گیا۔

”شٹ اپ۔“ وہ غصے سے مگر آہستگی سے بولی قدسیہ بیگم تو شکرانے کے نفل ادا کرنے کے لیے چلی گئیں علی نے دروازے سے ٹپک لگا کر کھڑے ہو کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”آج تو میں بالکل بھی خاموش نہیں رہوں گا کیونکہ آج میں بہت خوش ہوں مبارکباد تو دے دیجیے۔“

”ایک شرط پر پہلے تم مجھے پھپھو کہو۔“ جیا نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”اشعر اور نساء کی پھپھو مجھے جاب ملنے پر مبارکباد دے دیجیے۔“ علی نے کمال چالاکی سے اسے پھپھو کہا تھا جیا کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

”تم بہت شارپ (تیز) ہو۔“

”شکریہ۔“ وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے مسکراتے ہوئے بولا۔

”جاب مبارک ہو۔“

”شکریہ۔“

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو گفٹ بھی دے دوں گی۔“

”شکریہ۔“ اس نے شوخ و شریر انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تو جیا اس کی آنکھوں سے

جھلکتی شرارت سے زروس ہو گئی اور بمشکل بولی۔

”کیا پاگل پن ہے یہ خوشی کے سائڈ ایفیکٹس تو نہیں ہیں؟“

”جیا! میں تمہیں.....“

”تم مجھے پھپھو کہو جو تمہارا میرا رشتہ بنتا ہے انڈر اسٹینڈ۔“ جیا نے فوراً اس کی بات کاٹ کر

سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”نورشتہ نیا بھی بن سکتا ہے آپ کی اور میری عمروں میں زیادہ فرق نہیں ہے آپ مجھ سے نو

ماہ چھوٹی ہیں اور.....“ وہ شرارت سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”بہت ہی بے باک اور فضول بولتے ہو تم اور کیوں نہ بولو گے آخر مغربی ماحول کا اثر تو ہونا

ہی تھا ناں۔“ جیا نے شرم سے کٹ کر کہا۔

”جی نہیں محترمہ! اگر مغربی ماحول کا اثر ہوا ہوتا مجھ پر تو میں پاکستان میں مشرقی ماحول میں

یوں اکیلا نہ چلا آتا ایک آدھ گوری میم بھی میری بغل میں ضرور دب جیتی اللہ کے فضل و کرم سے

بہت شریفانہ زندگی بسر کی ہے میں نے وہ تو آپ کو دیکھ کر دل شرارت پر آمادہ ہونے لگتا ہے۔“ وہ

سنجیدہ ہو کر بولا۔

”اوکے اب تم مجھے نہیں دیکھو گے۔“ وہ معنی خیز لہجے میں کہتی آگے بڑھ گئی۔

”سوری پلیز خفامت ہوں۔“ علی نے فوراً اس کے قریب آ کر نرم لہجے میں کہا۔

”میں خفا تو نہیں ہوں۔“

”اچھا..... تو میری طرف مسکرا کر دیکھئے۔“ علی نے کہا تو اس نے اس کے چہرے کو بے

اختیار دیکھا اور اسے ہنسی آگئی علی نے چاہ سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”بہت شکریہ! بڑی عنایت ہے آپ کی ایک مسکراہٹ کے سوال پر ہنسی دینے کا مطلب

ہے کہ آپ ”دینا“ بہت کچھ جانتی ہیں کوئی خلوص سے ایک قدم آپ کی جانب بڑھے تو آپ اپنی

کی جانب دو قدم بڑھانے کا ظرف رکھتی ہیں۔“

”بہت بولتے ہو تم۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”بہت بُرا تو نہیں بولتا ہوں میں؟“

”نہیں۔“ جیانے ایمانداری سے جواب دیا تو وہ خوشی سے باغ باغ ہو گیا پھر یاد آنے پر کہنے لگا۔

”میں پرسوں کراچی جا رہا ہوں آپ نے اگر اپنے گھر والوں کو کوئی پیغام دینا ہو تو بتائیے میں پہنچا دوں گا چھوٹی دادی جان سے بھی ملوں گا میں۔“

”پیغام کی ضرورت نہیں ہے میں خود ہی کل پرسوں تک واپس گھر چلی جاؤں گی۔“ جیانے

اخبار ریک میں رکھتے ہوئے کہا۔

”آپ واپس نہیں جائیں گی۔“ علی نے بہت سنجیدہ لہجے میں کہا تو اس نے ٹھٹھک کر اسے

دیکھا پھر فوراً ہی سنبھل کر بولی۔

”مجھے کون روکے گا؟“

”میں روکوں گا۔“ وہ اس کے سامنے آکھڑا ہوا وہ ٹپٹا گئی۔

”تم تو خود کراچی جا رہے ہو۔“

”کراچی جا رہا ہوں قبرستان تو نہیں جا رہا۔“

”علی پلیز!“ جیانے تڑپ کر بے اختیار کہا اس کا دل بہت بُری طرح دھڑکا تھا علی نے بغور

اس کے چہرے کے تاثرات اور لہجے کی بیقراری کو محسوس کیا تھا اور خوشی کی لہر اس کے انگ انگ میں دوڑ گئی۔

”آپ کہیں نہیں جائیں گی اگر گئیں تو مجھے کہیں نہیں پائیں گی۔“ علی نے بے حد سنجیدگی

سے کہا اور اسے پریشان کر گیا۔

☆☆☆

”علی! تم نے مجھے بھی اپنی راہ پر لگا لیا ہے میں تمہیں دیکھتی ہوں تو مجھے خوشی سکون اور تحفظ کا

احساس ہوتا ہے تمہارے خیال سے میرے دل میں کہکشاں سجھ لگتی ہے۔ تمہاری صورت میری

آنکھوں کی پتلیوں میں جذب ہو گئی ہے میرے خوابوں میں پھر سے رنگ بھرنے لگتے ہیں اور یہ

خواب یہ رنگ تم نے مجھے دیئے ہیں میں سوچتی ہوں کہ کیا ان خوابوں کی تعبیر ممکن ہے یہ رنگ کپکپ

ہیں خوشی سکون اور احساس تحفظ دائمی ہے؟ تمہاری محبت تمہارے لفظوں لہجے اور نگاہوں سے عیاں ہوتی ہے اور ان سوالوں کا مثبت جواب دیتی ہے لیکن..... ہاں ایک لیکن..... اب بھی ان سوالوں اور جوابوں کے بیچ موجود ہے اور وہ یہ کہ کیا تمہارا اور میرا ساتھ ممکن ہے میرے ماضی کے ایک سیاہ ورق کو تمہارے والدین نظر انداز کرنے کا ظرف رکھتے ہیں؟“ جیانے کمرے میں ٹہلتے ہوئے سوچا اس کی سماعتوں میں علی کی گنگناہٹ گونجنے لگی۔

”تم سنگ نیناں لاگے مانے نہ ہی جبارا

پیا پیا بولے پیا من کا یہ پی ہارا۔“

”واقعی علی! یہ سب آنکھوں کا کرشمہ ہے آنکھ دیکھتی ہے اور دل پہ قیامت گزر جاتی ہے اگر تم مجھے نہ مل سکتے تو کیا میرے دل پر بھی قیامت گزرے گی کیا میں اتنی آگے بڑھ گئی ہوں تمہاری محبت میں کہ واپسی کے در بند ہو گئے ہیں۔“ جیا مسلسل علی کو اپنے دل میں مخاطب کر کے سوال و جواب کر رہی تھی۔

”میں نے تو اپنے دل کو بہت مضبوط خول میں بند کر لیا تھا تا کہ اب اس پر کسی مرد کی چھائیں نہ پڑ سکے لیکن میرے سارے اقدامات ساری مضبوطی تم نے ختم کر دی علی! تم تو ایسے میرے دل میں براجمان ہو گئے ہو جیسے ہمیشہ سے یہیں مقیم تھے اب اپنے دل سے تمہیں بے دخل کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہے اور پتا نہیں کہ میں تمہاری زندگی میں داخل کیے جانے کے لائق سمجھی جاتی ہوں کہ نہیں؟“ جیانے دل میں کہا اور تھک کر بستر پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر کو اس کی آنکھ لگ گئی آنکھ کھلی تو ٹکین کو برابر میں محو خواب پایا وال کلاک رات کے پونے بارہ بجے کا وقت بتا رہا تھا وہ اپنے بال سمیٹتی ہوئی بستر سے اتر آئی دوپٹہ شانوں پر ڈالا اور کمرے سے باہر نکل کر سوچا کہ وہ کمرے سے باہر کیا کرنے آئی ہے؟

”خیر اب آہی گئی ہو تو لاؤنچ میں ذرا دیر ٹی وی دیکھ لیتی ہوں نیند بھی تو نہیں آرہی۔“ وہ یہ سوچتی ہوئی لاؤنچ کے قریب پہنچی تو مظفر ماموں کی آواز سن کر دروازے کے قریب ہی اس کے قدم رُک گئے گھر کے بزرگ لاؤنچ میں موجود تھے اور کسی اہم موضوع پر گفتگو کر رہے تھے موضوع گفتگو جیا ہی تھی۔

”بہو! تم نے جیا کے کردار میں کوئی جھول دیکھا ہے اس میں کوئی خرابی یا بُرائی دیکھی ہے؟“

مظفر ماموں پوچھ رہے تھے۔

”نہیں ابا جان! لیکن وہ طلاق یافتہ ہے۔“ یہ منزہ بھابی کی آواز تھی۔

”اومائی گاڈ!“ جیا کا سر چکرا گیا ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

”تو اس میں جیا کا کیا قصور ہے۔ کیا طلاق یافتہ عورتوں کی دوبارہ شادی نہیں ہوتی۔ اور کیا طلاق یافتہ عورت کو دوبارہ شادی کرنے اور خوش رہنے کا کوئی حق نہیں ہے؟ بہو! یہ حق تو ہمارے مذہب نے بھی دیا ہے جیا تو بہت نیک سیرت اور باکردار بچی ہے میری تو بہت پہلے یہ خواہش تھی کہ جیا کی شادی علی سے ہو جائے تو کتنا اچھا ہو میری بہن سے میرا رشتہ اور زیادہ مضبوط ہو جائے گا مگر میں صرف اس وجہ سے خاموش رہا کہ اس میں علی کی مرضی کا شامل ہونا بہت ضروری تھا علی چونکہ ملک سے باہر تھا اس لئے اس کی رائے اور پسند کا جاننا ممکن نہیں تھا اور اب تو علی نے خود اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ جیا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“ مظفر ماموں نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”تو آپ نے اس لئے جیا کو یہاں بلایا تھا مجھے تو پہلے ہی شک ہو گیا تھا کہ جیا پہلے تو کبھی یہاں نہیں آئی اب کیوں آ گئی اب سمجھی کہ آپ نے اسے علی کو مائل کرنے کے لیے بلایا تھا۔“ منزہ بھابی کا انداز ہی شکی اور گستاخ تھا جیا کو اپنا آپ گہری کھائی میں گرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اسے لگا جیسے کسی نے بھرے بازار میں گالی دے دی ہو۔

”تم غلط سمجھ رہی ہو بہو! میں اگر اپنی مرضی تم سب پر مسلط کرنا چاہتا تو کب کا یہ فیصلہ کر چکا ہوتا یہ علی کا فیصلہ ہے جیا کے لئے لڑکوں کی کمی نہیں ہے اب اس سے شادی کے کئی امیدوار موجود ہیں لیکن اسے کسی کم ظرف مرد کے ہاں رشتہ کرنے کی تمنا نہیں ہے آج تم نے بھی بہت کم ظرفی کا ثبوت دیا ہے بہت افسوس ہوا ہے مجھے تمہارے اس رویے سے۔“ مظفر ماموں نے کھڑے ہو کر بہت سخت اور سپاٹ لہجے میں کہا منزہ بھابی شرمندہ ہو گئیں اور جیا تو صدمے سے بے ہوش ہونے کو تھی اس کے ناکردہ جرم کی سزا یہاں بھی مل گئی تھی وہ جو بمشکل خود کو سنبھال پائی تھی آج نئے سرے سے بکھر گئی تھی جیسے تیسے قدم اٹھاتی وہ واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔

”پھپھو! آپ جاگ رہی ہیں۔“ تلکین نے ذرا سی آنکھیں کھول کر اسے دیکھ کر کہا تو وہ

کھوئے کھوئے اور کمزور سے لہجے میں بولی۔

”ہاں شکر ہے میں جاگ رہی ہوں سوئی رہتی تو شاید بے خبری میں بہت دور نکل جاتی۔“
 ”کیا کہہ رہی ہیں پھپھو! سو جائیں۔“ نگین نے نیند میں ڈوبی آواز میں کہا اور پھر سے بے خبر ہو کر سو گئی۔

”نیند سے میرا تعلق ہی نہیں برسوں سے خواب آ کر میری چھت پہ ٹہلتے کیوں ہیں؟“
 ”میں علی کو بھول جاؤں گی یا نہیں مگر یہ طے ہے کہ میں علی کی زندگی سے دور چل جاؤں گی
 میں کل ہی یہاں سے چلی جاؤں گی دل بھی سنجل ہی جائے گا دل بچے نہ بچے آن بچنی چاہیے
 میں نے حالات سے اپنوں کے رویے سے مجبور ہو کر اپنے مستقبل کا فیصلہ امی ابو کو سونپ تو دیا ہے
 مگر بے بسی اور مجبوری میں کیے گئے اس فیصلے پر آج مجھے افسوس ہو رہا ہے میں اب کبھی بھی شادی
 نہیں کروں گی کسی سے بھی نہیں اور امی ابو تو میری شادی فوراً کرنا چاہتے ہیں اُف..... اب کیا
 ہوگا شاید تقدیر میری آزمائش کرنا چاہتی ہے۔ لیکن میں تھکتی جا رہی ہوں اب مجھ میں مزید انسٹ
 برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں ہے یا اللہ! مجھے حوصلہ دے میرا دل مضبوط بنادے“ جیانی نے بے آواز
 روتے ہوئے اپنے دل میں کہا۔ روتے روتے صبح ہو گئی فجر کی نماز ادا کرتے ہی اس نے نہا کر
 کپڑے تبدیل کیے بال سنوارے اور اپنا سامان سمیٹنے لگی وہ آج ہی یہاں سے چلے جانا چاہتی تھی
 نگین اسے ناشتے کے لئے بلانے آئی تھی لیکن اس کی تیاری پر دھیان نہیں دیا تھا چند منٹ بعد علی
 دروازے پر دستک دے کر کمرے میں داخل ہوا تو اسے سوٹ کیس میں اپنے کپڑے رکھتے دیکھ کر
 ٹھٹک گیا۔

”کہاں کی تیاری ہے؟“ علی نے اس کے چہرے پر اٹھکیلیاں کرتی بالوں کی لٹ کو دیکھتے
 ہوئے پوچھا ہلکے آسمانی رنگ کے کاٹن کے کلف زدہ لباس میں وہ بے حد نکھری نکھری لگ رہی تھی
 اور اپنی چیزیں ترتیب اور سلیقے سے سوٹ میں رکھ رہی تھی۔

”گھر جانے کی۔“ جیانی نے اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔

”کیا آپ اس گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھتیں۔ ہم سب کی محبتوں میں کوئی کمی رہ گئی ہے کیا؟“
 علی نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔ وہ اسے سچ سچ جانے کی تیاری کرتے دیکھ کر بے کل و بے قرار
 ہو گیا تھا۔

”نہیں یہ گھر اور اس کے سب افراد بہت اچھے ہیں بہت محبت کرنے والے ہیں۔“

”تو آپ ان محبتوں کو چھوڑ کر کیوں جانا چاہتی ہیں۔“

”کیونکہ میں اب کسی اور محبت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔“ جملہ معنی خیز تھا وہ فوراً اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا اور نرم اور سنجیدہ لہجے میں بولا۔

”محبت بوجھ نہیں ہوتی محبت تو بوجھ بناتی ہے۔“

”لیکن میں اپنا بوجھ خود اٹھانے کی عادی ہو چکی ہوں۔“ اس نے اپنے کھلے ہوئے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سینٹے اور میز بینڈ میں مقید کرتے ہوئے کہا۔

”کچھ لوگ آپ کا بوجھ اٹھانے اور بٹانے کی خواہش رکھتے ہیں ٹھیک ہے کہ آپ کو حالات و واقعات نے بہت مضبوط اور بہادر بنادیا لیکن کبھی نہ کبھی زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر انسان کو کسی سہارے کی ضرورت ضرور محسوس ہوتی ہے۔“

”جب مجھے اس قسم کی ضرورت ہوگی تب کی تب دیکھی جائے گی خیر یہ تو تمہارا گفت مجھ پر ڈیو (ادھار، واجب) تھا یہ کتاب مجھے بہت پسند ہے اس لئے جاتے جاتے میں تمہیں یہی تحفہ دے سکتی ہوں۔“ جیانے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنے ہینڈ بیگ میں سے محسن نقوی کی ”عذاب دید“ نکال کر اس کی جانب بڑھادی۔

”شکریہ! آپ یہ تحفہ نہ بھی دیتیں تو بھی جدائی کا تحفہ تو دیئے جا رہی ہیں ”عذاب دید“ دید کے عذاب تو اب جھیلنا ہوں گے۔“ علی نے کتاب لے کر ٹائٹل پڑھ کر کہا وہ اندر ہی اندر کمزور پڑنے لگی مگر غماز نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”تم کراچی کب جا رہے ہو؟“ جیانے بات بدل دی۔

”میں اب کراچی نہیں جا پاؤں جانے کا سوچ رہا ہوں۔“ علی نے افسردگی سے کہا۔

”وہ کیوں؟“ جیانے حیرانگی سے اس کے چہرے کو دیکھا جہاں سنجیدگی اور افسردگی پھیلی تھی جو وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی ورنہ یہ چہرہ تو ہر وقت ہنستا مسکراتا اور چمکتا دکھائی دیتا تھا اسے جیا کو بہت دکھ تھا مگر وہ بھی اپنی جگہ مجبور تھا۔

”کراچی کس کے لئے رکوں گا؟“ لہجہ معنی خیز تھا جیانے بے چین ہو کر اسے دیکھا۔

”علی! تم جذباتی ہو رہے ہو اور.....“

”آپ روتی رہی ہیں رات بھر؟“ علی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے بے قراری سے پوچھا

کیونکہ اس نے اس کی آنکھوں میں پھیلے سرخ ڈوروں کے جال کو اب دیکھا تھا۔ وہ شپٹا کر نظریں چرانے کے ساتھ ساتھ رخ بھی پھیر گئی۔

”میں کیوں رونے لگی آنکھیں تو تمہاری سوچی ہوئی ہیں۔“

”میں بھی سو نہیں سکا رات دل کو عجیب بے چینی لاحق رہی اب سمجھا کہ ایسا کیوں تھا دل میں بسنے والے دکھی ہوں تو دل کو سکون کیونکر نصیب ہو سکتا ہے۔“ علی نے سنجیدگی سے کہا۔

”یہ تمہارا پاگل پن ہے میں تو نہیں روئی۔“ وہ زور سے ہوتے ہوئے بولی۔

”جیا! آپ نظریں اور رخ پھیر کر اپنی طرف سے میرا دل تو نہیں پھیر سکتیں دل کی گواہی سب سے زیادہ سچی ہوتی ہے کم از کم مجھ سے آپ کچھ نہیں چھپا سکتیں۔“ علی نے بہت یقین سے کہا تو اس نے حیرت اور بے بسی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تم کیا چاہتے ہو علی؟“

”آپ کو یہاں ہمیشہ کے لئے روکنا چاہتا ہوں۔“ اس کی نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

”مگر میں رُکنا نہیں چاہتی۔“

”آپ نہیں رُکیں گی یہاں سے چلی جائیں گی تو جیا! میں بھی یہاں سے چلا جاؤں گا جاپان یا امریکہ ہمیشہ کے لئے نہ یہاں لوٹ کر آؤں گا اور نہ ہی یہاں کسی سے کوئی رابطہ رکھوں گا۔“ علی نے اٹل لہجے میں کہا۔

”علی!“ جیا روح تک سے کانپ اٹھی۔

”اس میں ان سب کا کیا قصور ہے۔“

”آپ اپنا قصور تو مانتی ہیں ناں؟“ معنی خیز بات تھی وہ شپٹا کر رخ پھیر گئی اور وہ منظرہ بھائی کی باتیں یاد کرتے ہوئے بولی۔

”ہاں میرا ہی قصور ہے ہمیشہ میں ہی قصور وار ہوتی ہوں کاش..... میں یہاں نہ آئی ہوتی ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ماموں جان کو ٹال دیتی کچھ تو بھرم باقی رہ جاتا علی! میں اُن چاہی ہستی بن کر مجرموں کی طرح کسی کی نظروں کے سامنے نہیں رہنا چاہتی میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔“

”آپ اپنے خراب کل کی خاطر اپنا آنے والا کل خراب کرنا چاہتی ہیں یہ سوچ درست نہیں

ہے جیا! اور کس نے کہا آپ سے کہ آپ اس گھر میں اُن چاہی ہستی یا مجرم بن کر رہیں گی آپ اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ میں آپ کو کتنی شدت سے چاہتا ہوں۔“ وہ بے چین ہو کر بولا۔

”علی! میں تمہاری محبت پر یقین کر بھی لوں تو مجھے اپنی قسمت پر یقین نہیں ہے اور رہی بات کہنے کی تو کہنا ضروری نہیں ہوتا کبھی کبھی سننا اور دیکھنا بھی کام آ جاتا ہے۔“ اس نے معنی خیز لہجہ میں کہا۔

”کس نے آپ کے ماضی کی بات چھیڑی مجھے بتائیے۔ یا آپ خود ماضی کے اذیت ناک تجربے کو یاد کرتے ہوئے کوئی فیصلہ کرنے سے گھبرار ہی ہیں؟“

میں اذیت پسند نہیں ہوں علی! اور نہ ہی مجھے بُرے لوگوں اور ان سے وابستہ واقعات کو یاد کرنے کا شوق ہے مگر کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ میں وہ سب یاد رکھوں اور ہر خوشی سے اپنا دامن چلوں جیسا اتنی بھی کمزور نہیں ہے کہ وہ لوگوں کی تسکین کی خاطر آنسو اور زخم لئے ان کے ساتھ چلوں آئے یوں بھی میں نے اپنا فیصلہ قسمت پر چھوڑ دیا ہے جیانا اپنا سوٹ کیس بند کرتے ہو۔

”جیا! میں سچ کہہ رہا ہوں کہ میں آپ کے بغیر خوش نہیں رہ سکوں گا اگر آپ یہاں۔ گئیں تو میں نہر میں کود جاؤں گا۔“ وہ ضدی بچے کے سے انداز میں بولا۔

”اسی نہر میں ناجس میں چھوٹے چھوٹے بچے کھیلتے کودتے اور نہاتے ہیں دن بھر چہرے مجھے تم سے اسی بہادری کی توقع تھی اس سے زیادہ پانی تو باتھ روم کے ٹب میں ہوتا ہے وہیں کوش کر دیکھو شاید کام بن جائے۔“ جیانا مذاق سے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی ہنس دیا۔

”آپ کا یہی روپ تو میں ہمیشہ دیکھنا چاہتا ہوں آپ طنز و مزاح میں اپنی زندہ دل باہمت شخصیت کا عکس دکھا دیتی ہیں لیکن میں شاید اتنا باہمت اور بہادر نہیں ہوں اور میں یہ بات آپ سے ابھی کہتا بھی نہیں مگر آپ نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں اپنے دل کی بات آپ سے دوں مجھے آپ سے محبت ہے اور کبھی نہ کبھی تو آپ شادی کریں گی ہی اس لئے میں آپ کے ساتھ اپنا نام لکھوانا چاہتا ہوں تاکہ کوئی اور آپ کی جانب ہاتھ نہ بڑھا سکے۔“

”علی! بس بہت ہو گیا اب مذاق چھوڑو اور چلو ناشتہ لگ گیا ہوگا ابھی تم بچے ہو تمہارے کھیلنے کے دن ہیں اور اچھے بچے ایسی باتیں کرتے ہیں اور نہ ضد کرتے ہیں۔“ جیانا نے سنجیدگی

مگر دوستانہ لہجے میں کہا تو وہ دُکھی ہو کر بولا۔

”جیا! کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ میری مزاحیہ طبیعت کے باعث میری محبت کو بھی مذاق سمجھ رہی ہیں اگر ایسا ہے جیا تو میرے ساتھ اس سے بڑا مذاق کوئی نہیں ہو سکتا میں آپ کو دل سے چاہتا ہوں۔“

”اچھا..... مانا یقین کیا تمہاری بات کا اب چلو سب لوگ ناشتے پر ہمارا انتظار کر رہے ہوں گی ہٹیو یہاں سے۔“ جیا نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا اور دروازے سے ہٹنے کا اشارہ کیا۔
”میں تو یہاں سے بھی ہٹ جاؤں گا تو بھی آپ کے دل و نظر پہ اپنا عکس چھوڑ جاؤں گا“ علی نے بہت مدہم لہجے میں کہا۔

”علی.....!“ جیا نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

”جیا جی! میں آپ کے بغیر جی سکوں گا کہ نہیں میں نہیں جانتا اور نہ ایسا کوئی دعویٰ کرنا چاہتا ہوں مگر اتنا ضرور چاہتا اور محسوس کرتا ہوں اور کر رہا ہوں کہ آپ کے بغیر میری زندگی میں دُکھ درد اذیت اور نار سائی کا ذائقہ ضرور شامل ہو جائے گا خوشی مجھ سے روٹھ جائے گی میری ہی ہنسی میرا مذاق اڑائے گی۔“

”ایسا کچھ نہیں ہو گا علی!“ جیا نے یقین سے کہا۔

”انشاء اللہ کیونکہ میرا پیار سچا ہے۔“ علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”باز آ جاؤ بھتیجے۔“ جیا نے اپنی دلی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا اور اس کے خفگی سے دیکھنے اور باہر نکل جانے پر خود بھی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

”السلام علیکم ماموں جان! صبح بخیر۔“ جیا نے ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے ہی مظفر ماموں کو دیکھ کر خوشگوار موڈ میں کہا۔

وعلیکم السلام جیتی رہو ماشاء اللہ آج تو ہماری بیٹی بہت پیاری لگ رہی ہے مظفر ماموں نے اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا تو علی سمیت سب کی نظریں بے اختیار اس کی جانب اٹھ گئیں۔

”ماموں جان! میں تو کل جیسی ہی ہوں آپ میرا دل رکھنے سے لئے کہہ رہے ہیں۔“ جیا نے مسکراتے ہوئے کہا اور کرسی کھسکا کر بیٹھ گئی۔

”ہم تمہارا دل ہی نہیں تمہیں رکھنے کے لئے بھی کہہ رہے ہیں۔“ مظفر ماموں نے معنی خیز لہجے میں کہا تو جیانے منزہ بھابی کے چہرے کو دیکھا وہ رات والی بات کا انجام جاننا چاہتی تھی ان کے تاثرات سے اپنے متعلق انداز لگانا چاہتی تھی۔

”سامان کی لسٹ تیار کر لینا تاکہ کوئی چیز رہ نہ جائے اور جلدی جلدی ناشتہ ختم کرو اور جانے کے لئے تیار ہو جاؤ صبح سے جائیں گے تو ٹھنڈے موسم میں ہی واپس آ جائیں گے۔“ منزہ بھابی نگین اور نشاء کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”میں نے تو شاپنگ لسٹ رات ہی تیار کر لی تھی۔“ سمیع نے بتایا۔

”آپ لوگ شہر شاپنگ کے لئے جا رہے ہیں؟“ جیانے پوچھا۔

”جی پھپھو!“ نگین نے بتایا تو اس نے کہا۔

”پھر تو میرا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا مجھے بھی اپنے ساتھ لے جایئے گا۔“

”آپ نے بھی شاپنگ کرنی ہے؟“ نشاء نے پوچھا۔

”نہیں مجھے ٹرین پکڑنی ہے۔“ اس نے چائے کا سپ لے کر کہا۔

”کیا مطلب؟“ سب نے ایک زبان ہو کر پوچھا۔

”مطلب یہ کہ میں آج واپس کراچی جا رہی ہوں ٹرین کا ٹائم ساڑھے دس بجے ہے اور اس

وقت ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں۔“

”یہ کیا بات ہوئی بھلا تم کہیں نہیں جا رہیں۔“ قدسیہ بیگم نے خفگی سے کہا۔

”اور کیا پھپھو! اتنی جلدی اور اچانک آپ نے پروگرام کیسے بنالیا واپس کا؟“ نگین نے

افسوسہ ہو کر کہا تو جیانے مسکرا کر کہا۔

”دو ہفتے ہو گئے ہیں مجھے یہاں رہتے ہوئے اور دو ہفتے بہت ہوتے ہیں میں نے ماموں

جان سے دو دن پہلے کہا تھا کہ میری سیٹ بک کر ادیں انہوں نے ٹال دیا مجھے سب گھر والے بہت

یاد آ رہے ہیں میں اُن سے کبھی اتنے دن دور نہیں رہی ہوں ناں۔“

”لڑکیوں کو تو ماں باپ سے میکے سے ایک نہ ایک دن دور جانا ہی پڑتا ہے اچھا ہے۔ نا

تمہاری ابھی سے پریکٹس ہو جائے گی۔“ شاہینہ بھابی نے کہا تو وہ ہنس کر بولی۔

”بھابی! ہر قسم کی پریکٹس ہو چکی ہے مجبوری کی دُوری الگ چیز ہے اور جان بوجھ کر دور جانا

ایک الگ بات ہے۔ اور یوں بھی میں یہاں کسی کو اپنی طرف مائل کرنے تھوڑی آئی تھی جو اس کا رزلٹ دیکھنے کے لئے ٹھہر جاؤں۔ آپ لوگوں کو میرے یہاں آنے پر بھی حیرت ہوئی تھی۔ اور اچانک جانے پر بھی حیرت ہو رہی ہے میں یہاں آئی تو ماموں جان کی مرضی سے تھی لیکن واپس اپنی مرضی سے جا رہی ہوں۔“

”آپ نے شاید سنا نہیں کہ مہمان آتا اپنی مرضی سے ہے اور جاتا میزبان کی مرضی سے ہے۔“ اشعر نے مسکرا کر کہا تو مظفر ماموں بولے۔

”جیا! اس گھر میں مہمان نہیں ہے اس گھر کا فرد ہے۔“

”نہیں ماموں جان آپ مجھے مہمان ہی رہنے دیں“ جیا نے مسکرا کر کہا اس کی نظریں وقفے وقفے سے منظر بھابی کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں جو اس کی باتیں سن کر شرمندہ سی دکھائی دے رہی تھیں انہیں خدشہ تھا کہ جیا نے ان کی رات والی گفتگو سن لی ہو۔

”خیر اس کا فیصلہ تو بعد میں ہو گا فی الحال تو تم کراچی نہیں جا رہی کیونکہ میں نے عطیہ اور حسن کو بچوں سمیت یہاں انوائٹ کر لیا ہے پرسوں وہ سب یہاں پہنچ جائیں گے اور اس سے اگلے دن نکلیں اور اشعر نشاء اور سمیع کی مفتی کی رسم ادا کی جائے گی۔“ مظفر ماموں کے اس حسین انکشاف پر جہاں جیا حیران ہوئی وہاں نشاء اور نگین شرماء کر دہاں سے اٹھ گئیں اشعر اور سمیع کے ہونٹوں پر شرمیلی مسکان کھیل رہی تھی۔

”ریلی..... یہ تو بہت زبردست نیوز ہے آپ سب کو بہت بہت مبارک ہو اب تو رکنا ہی پڑے گا۔“ جیا نے خوش ہو کر کہا۔

”ہاں اور علی تم نے آج کراچی جانا تھا کیا ارادہ بدل دیا ہے؟“ احمر صاحب نے پوچھا تو اس نے کہا۔

”ابو! میں ایک ہفتے بعد کراچی جاؤں گا۔“

”چلو اچھا ہے جیا کو بھی اپنے ساتھ لے جانا۔“ احمر صاحب نے کہا۔

”جیا میرے ساتھ نہیں جانا چاہتیں۔“ علی نے معنی خیز بات کہتے ہوئے کن انکھیوں سے جیا کے چہرے کو دیکھا جو بہت مہارت سے اس کی موجودگی اور گفتگو سے بے نیاز بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی۔

”جیا اچھی بچی ہے مان جائے گی اور جمعے کے دن تمہاری سالگرہ بھی تو ہے۔ خوب مزار ہے گا بڑے بھائی ہونے کی حیثیت سے منگنی کے فنکشن کے انتظامات بھی تم نے سنبھال لئے ہیں۔“ احمر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”پہلے میں خود کو تو سنبھال لوں۔“ علی نے اپنے دل میں کہا۔

”جی ابو! آپ مطمئن رہیے سب انتظام ہو جائے گا ایک گڈ نیوز اور بھی ہے میرے پاس۔“

علی نے سنجیدگی سے کہا۔

”وہ کیا ہے جلدی سناؤ؟“ سب نے کہا جیانے اس کی طرف خاموشی سے دیکھا۔

”وہ یہ کہ آج صبح مجھے جاپان کی ایک بہت بڑی کمپنی کی طرف سے ای میل موصول ہوئی ہے میں نے اس کمپنی کو اپنے ڈاکو مینٹس بھیجے تھے جاب لئے اپلائی کیا تھا سو کمپنی نے مجھے جاب آفر کی ہے ایک ہفتے تک مجھے جواب دینا ہے اور ایک مہینے بعد وہاں جاب جوائن کرنی ہے۔“

”مبارک ہو بھائی جان۔“ سمج نے دل سے مبارکباد دی۔

”شکریہ۔“ وہ مسکرا دیا۔

”علی بیٹے! تمہاری کامیابی پر ہمیں بہت خوشی ہے فخر ہے تم پر لیکن بیٹا اس طرح تو تم ہم سے بہت دور چلے جاؤ گے۔“ احمر صاحب نے کہا۔

”ہاں علی! تم کراچی والی جاب ہی جوائن کر لو وہیں رہنا۔“ منزہ بھابی نے بھی کہا تو وہ سنجیدگی سے بولا۔

”کراچی کس کے لئے رہوں گا اور امی! آگے بڑھنے کے لئے بہت کچھ سہنا پڑتا ہے میں یہاں رہ کر شاید کچھ نہ کر پاؤں۔“

”تم یہاں رہ کر بہت کچھ کر سکتے ہو اور کرو گے ذرا ذرا سی بات پر دل ہار دینا بزدلی ہے اور یہ کیا تمہیں جانے کی لگی ہے کوئی کہیں نہیں جائے گا“ مظفر ماموں نے سنجیدہ لہجے میں فیصلہ سنا دیا۔

”کیا شاپنگ پر بھی نہیں؟“ جیانے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں شاپنگ کے لئے ضرور جاؤ کیا تم بھی جاؤ گی؟“

”جی ماموں جان! آ خر ان پانچوں کے لئے گفٹس بھی تو خریدنے ہیں۔“ جیانے مسکراتے

ہوئے کہا۔

”میں جو تحفہ آپ سے لینا چاہتا ہوں وہ آپ کو اس شاپ میں کہیں نہیں ملے گا، وہ تحفہ تو آپ کے پاس موجود ہے، لیکن شاید آپ مجھے اس تحفے کے قابل نہیں سمجھتیں۔“ علی نے معنی خیز بات کہہ کر اس کا چہرہ دیکھا تو اس کی آنکھوں میں مچلتے جذبے دیکھ کر جیانی نے زور سے ہوا کو قدم آگے

بڑھا دیئے۔

کراچی سے جیا کے سب گھر والے حویلی پہنچ چکے تھے حویلی کو بہت شاندار طریقے سے دلہن کی طرح سجایا گیا تھا علی نے تمام انتظامات اپنی نگرانی میں مکمل کروائے تھے۔ چند قریبی رشتے دار بھی اس باوقار اور خوشگوار تقریب میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ نگین اور نشاء نے گلابی رنگ کی کاڈر اپشواز کے ساتھ بہت نفیس جیولری پہن رکھی تھی ہاتھوں اور بالوں میں کلیوں کے گجرے سے تھے خوشی ان کے اُنک اُنک سے پھوٹ رہی تھی سمیع اور اشعر تو بہت ہی خوش تھے سفید رنگ کے کرتے شلوار اور کھسے میں بہت بچ رہے تھے۔ جیا کے لئے عطیہ بیگم کراچی سے ہی بہت شاندار لباس تیار کروا کر لائیں تھیں۔ گولڈن کلر کے چائنا سلک کے چوڑی دار پا جامے پر گولڈن انگوری اور میرون کلر کا کورے اور دبکے کے کام والا بڑا سا فراک تھا اور دوپٹہ بھی گولڈن کلر کا تھا جو بھاری کام سے اس کے سر سے ڈھلک ڈھلک جا رہا تھا اس کے ساتھ ہی اس نے گولڈ کا جیولری سیٹ پہنا تھا چوٹی میں کلیاں گندھی تھیں ہاتھوں میں میچنگ چوڑیاں اور گجرے سے تھے نگین اور نشاء کے ساتھ ہی اس نے بھی اپنے ہاتھوں پر مہندی لگوائی تھی جو اس کے ہاتھوں کے حسن کو چار چاند لگا رہی تھی۔ علی نے سفید جینز پر لائٹ کرشل گرین کلر کی شرٹ زیب تن کر رکھی تھی وہ بظاہر خوش دکھائی دے رہا تھا لیکن اندر سے بے کل اور بے قرار تھا اس کا دل بہت دکھی ہو رہا تھا جیا کو حاصل نہ کر سکنے کا خیال اسے اندر ہی اندر کچھ کے لگا رہا تھا۔

”ہائے پھپھو! آج کے قتل کرنے کا ارادہ ہے؟“ سمیع نے جیا کو دیکھتے ہی کہا تو وہ شرما کر ہنس دی۔ علی کے دل میں جلتے رنگ بجنے لگے جذبے بے لگام ہونے لگے۔

”بیوقوف ہائے نہیں کہتے ماشاء اللہ کہتے ہیں۔“ علی نے جیا کو اپنی تمام تر محبتوں سمیت دیکھتے ہوئے کہا تو وہ نزوس ہو کر غلطی بھابی کے پاس چلی گئی۔

”تم سنگ نیناں لاگے مانے نہ ہی جیارا

پیایا بولے پیامن کا یہ پی ہارا۔“

ٹیپ ریکارڈ پر گیت علی نے جان بوجھ کر لگایا تھا جیا نے غصے سے اسے گھورا تو وہ شرارت اور بے بسی سے مسکرا دیا جیا کے دل کو شاک پہنچا۔

”دادا جان! یہ نکاح خواں کیوں آئے ہیں؟“ علی نے نکاح خواں کو مہمانوں میں بٹھانے

کے بعد مظفر ماموں سے پوچھا۔

”نکاح پڑھوانے کے لئے۔“ مظفر ماموں نے اپنی شیروانی کے بن بند کرتے ہوئے کہا۔
”کس کا نکاح؟“

”تمہارا اور جیا کا۔“ یہ انکشاف تھا یا حیرتوں اور مسرتوں کا ایٹم بم جو اس کی سماعتوں پر پھٹا
تھا سمیع نے ”ہرے“ کہہ کر خوشی کا اظہار کیا۔

”سمیع! کیا تم نے بھی وہی سنا ہے جو میرے کانوں سے سنا ہے؟“ علی کو اپنی سماعتوں پر شبہ
ہو رہا تھا تصدیق کی خاطر سمیع سے پوچھا تو وہ بولا۔

”ہاں نہیں بھائی! مجھے تو پہلے ہی اپنی سماعتوں پر شبہ رہتا ہے۔“

”نالائق ہر وقت شک و شبہ میں پڑا رہتا ہے۔“ علی نے اسے گھورا۔

”دادا جان! سینے تو جیا کیسے مان گئی وہ تو مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی اس کی باتوں سے
میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اس نے امی کی باتیں سن لی ہیں آپ نے جو کچھ بتایا تھا امی کے رویے
کے بارے میں۔“

”ایسا اب کچھ نہیں ہے اور ویسے بھی جیا نے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا اختیار اپنے ماں
باپ کو یہاں آنے سے پہلے ہی دے دیا تھا اور عطیہ اور حسن کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے
اور انہیں یہاں بلانے کا مقصد بھی یہی تھا ساری باتیں فون پر طے ہو چکی تھیں اب تم دو لہا بننے کے
لئے تیار ہو جاؤ“ مظفر ماموں اس پر انکشافات کرتے ہوئے اسے حیران شاداں اور پریشان چھوڑ
گئے۔

”یا اللہ! تو نے میری دعا قبول فرمائی تیرا احسان ہے مالک۔“ علی نے آسمان کی جانب پر غم
آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا اور خوشی اور خوشی کی طرف چلا گیا۔

”جیا بیٹا! ہمیں تم سے ضروری بات کرنی ہے۔“ حسن صاحب اور عطیہ اسے ایک طرف
لے آئے اور راز دارانہ انداز میں اسے مخاطب کیا تو وہ چونک گئی۔

”کیسی بات ابو؟“

”جیا! تمہیں یاد ہے کہ تم نے یہاں آنے سے پہلے ہمیں اپنی شادی کے سلسلے میں کوئی بھی
فیصلہ کرنے کا پورا اختیار دے دیا تھا۔“ حسن صاحب نے اسے یاد دلایا۔

”جی ابو! مجھے یاد ہے اور میں اب بھی اپنی اس بات پر قائم ہوں۔“

”تو بیٹا! ہم نے ایک فیصلہ کر لیا ہے۔“

”کیسا فیصلہ ابو؟“

”علی سے تمہاری شادی کا فیصلہ۔“ حسن صاحب نے اس پر انکشاف کیا تو وہ ہکا بکارہ گئی اس کی کیفیت بھی علی سے مختلف نہ تھی خوشی اور بے یقینی حیرانگی کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے سے عیاں ہو رہی تھی۔

”علی سے..... مگر ابو یہ کیسے ممکن ہے آپ نے منزہ بھابی سے پوچھا ان کے بیٹے کے لئے..... لڑکیوں کی کمی تو نہیں ہے۔“ وہ منزہ بھابی کی باتیں یاد کرتے ہوئے نظریں جما کر آہستگی سے بولی۔

”ہماری بیٹی بھی کسی سے کم نہیں ہے اور یہ منزہ اور احمر کے ساتھ ساتھ علی اور تمہارے مظفر ماموں کی بھی دلی خواہش ہے ہم تو اس رشتے سے بہت خوش ہیں۔“ عطیہ نے اس کے سر پر دست شفقت رکھ کر محبت سے کہا۔

”جیسا بیٹا! اگر تمہیں منزہ یا میری کسی بات نے ہرٹ کیا ہے تو میں تم سے اس کی معافی مانگتا ہوں۔“ مظفر ماموں بھی وہاں آ کر نرمی سے بولے۔

”ماموں جان پلیز مجھے شرمندہ نہ کیجیے آپ سب کی خوشی کی خاطر میں ساری زندگی بھی ہرٹ ہوتی رہوں تو اب شکوہ نہیں کروں گی۔“ جیانے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تو مظفر ماموں نے محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔

”ہماری بیٹی کو اب کوئی ہرٹ نہیں کرے گا بلکہ اس سے ہر کوئی پیار کرے گا اس کا بہت خیال رکھے گا اسے خوش رکھے گا انشاء اللہ۔“ مظفر ماموں نے کہا۔

”تو پھر کیا جواب ہے ہماری بیٹی کا؟“ حسن صاحب نے جیا سے پوچھا۔

”ابو! میں نے پہلے بھی آپ کے فیصلے پر سر جھکایا تھا اب بھی آپ جو بھی فیصلہ میرے لئے کریں گے مجھے قبول ہوگا۔“ جیا نے خوشی سے بھیکتی آواز میں کہا۔

”جیتی رہو میری بچی اللہ تمہیں سدا خوش اور آباد رکھے تم یقیناً علی کے ساتھ بہت خوش رہو گی۔“ حسن صاحب نے خوشی سے اسے اپنے سینے سے لگا کر پریم لہجے میں کہا عطیہ بیگم نے اسے پیار کیا سب کی خوشی دیدنی تھی اور یوں علی اور جیا کا نکاح ہو گیا مسیح اور نشاء کی اشعر اور نگین کی منگنی ہو گئی آخر میں علی نے سب کی موجودگی میں اپنی سالگرہ کا کیک کاٹا۔

جیا کو اگلے جمعے میکے سے علی کے ساتھ رخصت ہو کر آنا تھا اور کل صبح وہ لوگ واپس جا رہے تھے۔ علی جیا سے بات کرنے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔ سب مہمان جا چکے تو اس نے نگین کی منت خوشامدی کہ وہ کسی طرح جیا کو لان میں لے آئے جیا لان میں پہنچی تو سوائے اس کے اور پھولوں کی خوشبو کے وہاں کوئی نہ تھا۔

”یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے نگین نے تو کہا تھا کہ دادی جان بلار ہی ہیں۔“

”دادی جان تو نہیں البتہ ان کا پوتا آپ کو بلار ہا تھا۔“ اچانک علی نے اس کے سامنے آ کر شوخ مسکراتے لہجے میں کہا۔

”علی!“ جیا کے ہونٹوں سے بہت مدھر آواز میں اس کا نام نکلا۔

”ہاں علی کی شریک زندگی۔“ علی نے بہت محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ شرمناک واپس جانے لگی مگر وہ فوراً اس کے سامنے سینے پر ہاتھ باندھ کر اطمینان سے کھڑا ہو گیا وہ خوشی اور حیا سے گلنار ہو رہی تھی۔

”جانے دونوں۔“ اس نے نظریں جھکائے حیا آلود لہجے میں کہا۔

”اب تو تم جانے کے بعد بھی میرے پاس ہی لوٹ کر آؤ گی۔“ وہ سرشار لہجے میں بولا۔

”تم..... آپ سے ایک دم تم پر آگئے سارا تکلف جاتا رہا۔“ اس نے اسے گھورا۔

”جناب! آپ کا اور ہمارا رشتہ ہی اب ایسا بن گیا ہے آپ کا احترام اپنی جگہ لیکن اس رشتے میں ہر تکلف بالائے طاق رکھنے کا اختیار حاصل ہو گیا ہے ہمیں ہم تو اب بے تکلفی کی آخری حد کو چھونا چاہتے ہیں۔“ علی نے اس کا ہاتھ تھام کر بہت معنی خیز اور شریر لہجے میں کہا تو وہ اس کے لمس اور لفظوں کی حدت میں بھیگ گئی۔

”کوئی دیکھ لے گا علی! مجھے جانے دو پلیز۔“ اس نے گھبرائے لہجے میں کہا۔
 ”پہلے میرا برتھ ڈے گفٹ مجھے دو“ اس نے اس کے ہاتھوں کی مہندی کو دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”اب بھی کوئی گفٹ چاہیے تمہیں؟“ جیا کا جملہ معنی خیز تھا وہ فوراً سمجھ کر ہنس پڑا۔
 ”نہیں وہ گفٹ وہ تحفہ نہیں چاہیے جو بازار سے خریدا جاتا ہے مجھے بس اتنا بتا دو کہ کیا تم وہ تحفہ مجھے دے سکتی ہو جو میں تم سے لینا چاہتا ہوں؟“ علی کی نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں اور نرمی سے پوچھا۔

”اپنے دل سے پوچھو۔“
 ”اپنے دل سے ہی تو پوچھ رہا ہوں۔“ علی نے معنی خیز بات کہی تو وہ شرمیلی ہنسی کر اس کا دل شاد کر گئی یکدم وہ سنجیدہ ہو کر بولا۔

”جیا! میں نے سنا ہے کہ تمہاری شادی کا فیصلہ تمہارے امی ابو نے کیا ہے؟“
 ”ظاہر ہے یہ فیصلہ انہوں نے ہی کرنا تھا۔“

”تمہارے دل کا فیصلہ کیا تھا؟“ وہ اس کی زبان سے اقرار محبت سننا چاہتا تھا۔
 ”اب بھی جواب مانگ رہے ہو؟“
 ”تو پلیز دے دو نا جواب۔“

”صاف جواب دے دوں۔“
 ”وہ شرارت سے مسکراتے ہوئے بولی۔“

”میری سانسیں جواب دے جائیں گی جیا!“ وہ بے کل ہو کر بولا۔
 ”کبھی کوئی ڈھنگ کی بات بھی کر لیا کرو۔“ جیانے اس کے سینے پر مکہ مار کر خفگی سے کہا تو
 وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

”مجھے جواب مل گیا ہے۔“ وہ ہنسی روک کر بولا تو وہ شرمناک رہا۔
 ”میں نے کہا تھا ناں کہ میں تمہیں روکوں گا۔“ وہ اس کا راستہ روکتے ہوئے بڑے فاتحانہ
 انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔
 ”علی! تنگ نہیں کرو۔“ وہ شرگیں مسکان لبوں پر سجائے ملتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے
 بولی تو اس نے شرارت سے کہا۔
 ”پیار کروں؟“

”اُف علی!“ وہ شرم سے کٹ کر رہ گئی وہ اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔
 ”ایک شرط پر جانے کی اجازت ہے اور وہ یہ کہ تم ہر روز مجھ سے فون پر بات کرو گی اگلے
 جمعے تک مجھ سے وقت نہیں کئے گا۔“ اس نے شرط بتاتے ہوئے کہا۔
 ”ٹھیک ہے لیکن فون تم کرو گے۔“ اس نے جان چھڑانے کو فوراً اس کی بات مان لی۔
 ”ظاہر ہے جیسا ڈارلنگ! دل بھی ہم نے دیا ہے تو فون کا بل بھی ہمیں ہی دینا ہوگا اور ہم یہ
 بل بخوشی دینے کے لیے تیار ہیں۔“ وہ خوشی سے مسکراتے ہوئے بولا تو اسی وقت ان دونوں کے
 چہروں پر کیمرے کی لائٹ پڑی جیسا پٹنا کر مڑی سمج نے کیمرے میں یہ سین محفوظ کر لیا تھا اور اب
 شرارت سے پوچھ رہا تھا۔

”کیسا ہے بھیا اور بھابی جان؟“

”ویری رومینگ ایک اور ہو جائے۔“ علی نے شوخی سے ہنس کر کہا۔
 ”علی!“ جیسا پٹنا کر بھاگنے لگی تھی۔ مگر علی نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ بلکہ اسے اپنے برابر

زبردستی کھڑا کر کے دوسری تصویر بھی کھنچوالی۔

”زبردست کیا کھل ہے اللہ نظر بد سے بچائے۔“

”آمین۔“ سمیع کے ساتھ اشعر نکین نشاء اور نورین آ پا بھی وہاں آ گئے تھے علی کے دل سے آمین کہنے پر سب ہنس پڑے ان کی ہنسی میں جیا کی شرمیلی ہنسی بھی شامل ہو گئی اور اس نے علی کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچا کہ جو فیصلہ وہ اپنے والدین کو سوئپ کر پریشان ہو گئی تھی آج ان کے اس فیصلے نے اسے محبتوں کے خزانے عطا کر دیئے اس کی زندگی میں خوشیوں اور چاہتوں کے رنگ بھر دیئے تھے۔ کل اس کا غم مجبوری اور بے بسی کی حالت میں کیا گیا فیصلہ آج اس کی زندگی میں خوشی راحت اور آسودگی بن کر داخل ہو گیا تھا اور گزشتہ غلط فیصلے سے ملنے والے ہر دکھ کا داغ اس کے دل سے دھل گیا تھا کہ علی کی پیار بھری مسکراتی نگاہیں اسے عمر بھر اپنی محبت میں سرشار رکھنے کا یقین دلارہی تھیں اور یہ یقین ہی تو تھا جو جیا کے دل میں علی کی محبت جگانے میں کامیاب ہوا تھا اور وہ بہت خوش تھی اپنی محبت پا کر.....!!!

☆.....☆.....☆.....☆